

مزار حب علی بیگ سرور

فنا نه عجائب

ترتیب اطر پر ویز

TO THE READER

KINDLY use this book very carefully. If the book is disfigured or marked or written on while in your possession the book will have to be replaced by a new copy or paid for. In case the book be a volume of a set which single volume is not available the price of the whole set will be realized.

Sri Pratap College

SRINAGAR.
LIBRARY

Class No. 891.483

Book No. 543F

Accession No. 27167

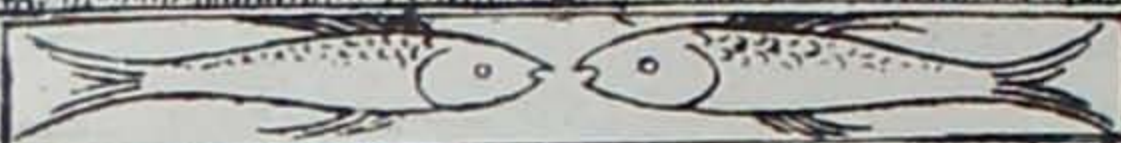
07 FEB 2006

برہم کا ارادہ بڑا فاعلی۔ مٹی کی گہری
گہری میں طے لگاتے
خوشگواران ایندیز کوئی کمال ہے

DATE LOANED

Acc. No. _____

[illegible]



بَرَفَتِ خَلْقِ جَانِ عَالَمِ وَنَحْزِ آسَمِ اَبْنِ نَحْمِ



وَسَيَاغِي عَمَّا نَحْمِ

تصنيف
مرزا ارجب علي بيگ سردار لکھنوی
ترتیب
المتر پر پوز
سنکم پبلشرز • الہ آباد

تعداد : ایک ہزار
قیمت : بارہ روپے پچاس پیسے

Library Sri Pratap College
Srinagar.

Accession Number 27167

Cost..... Class No.....

891.483

S 43 F

آرٹسٹ : ایم اسمیل (الہ آباد)
خوشنویس : محبوب حسین (بنارس)
مطبع : اسرار کریمی پریس - الہ آباد
ناشر : سنگم پبلشرز - الہ آباد

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے نام

SRI PRATAP COLLEGE
LIBRARY

Subject Pub. (i)

No. 47.

ترتیب

- ۱ - تعارف پرذقیسر آل احمد سرورہ ... ۷
- ۲ - عرض مرتبہ ۹
- ۳ - مرزا رجب علی بیگ سرورہ (حیات) ... ۱۵
- ۴ - فسانہ عجائب مختلف ایڈیشنوں کا جائزہ ... ۲۸
- ۵ - فسانہ عجائب ایک تنقیدی مطالعہ ... ۵۱
- ۶ - فسانہ عجائب (متن) ... ۱۰۳
- ۷ - فسانہ عجائب کے چند اہم خاتمہ الطبع اور خاتمہ الطبع نسخہ ہذا ... ۳۳۱
- ۸ - ضمیمے

- ۱ - شادی کی رسومات لکھنؤ جن کا ذکر فسانہ عجائب میں ہے ۳۳۷
- ب - چند ہنرمندوں اور فنکاروں کا تذکرہ جن کا ذکر بیان لکھنؤ میں ہے ... ۳۴۷
- ج - فرہنگ فسانہ عجائب ... ۳۵۷
- د - فرہنگ محاورات و امثال فسانہ عجائب ... ۴۰۱
- ۵ - فرہنگ آیات و فقرے عربی فسانہ عجائب ... ۴۰۹
- ۶ - فسانہ عجائب کے نسخے جو مرتب کی نظر سے گزرے ۴۰۵

SRI PRATAP COLLEGE
LIBRARY

Subject P.6.(i)

No. 47.

تعارف

آزادی کے بعد ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق و تنقید پر سنجیدگی سے توجہ ہوئی ہے۔ ادب کے مطالعہ میں ادبِ عالیہ کے صحیح متن کی خاص اہمیت ہے اور تنقید کے سارے نظریے اُس وقت تک وسیع نہیں ہوتے جب تک ان کی بنیاد فن پاروں کے صحیح متن پر نہ ہو۔ اس لئے آج اپنے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کے صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کرنے پر بجا طور سے زور دیا جاتا ہے۔ منشی نوبل کشور کا اردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہمارے ادبی سرمایہ کا بڑا حصہ چھاپ کر محفوظ کر دیا مگر افسوس ہے کہ ان کے مطبع نے متن کی صحت پر بہر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اب بیشتر تصانیف کو تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق پھر سے شایع کرنے کی ضرورت ہے۔ فسانہ عجائب جیسی مشہور و معروف تصنیف کے بھی جو نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں ان میں بہت غلطیاں ہیں اور چونکہ اعراب و اوقات کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے اس لئے آج کل کے طلباء کو جو فارسی سے نا بلد ہیں اس کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اطہر پرنس صاحب نے فسانہ عجائب کا ایک صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہوگا۔

اطہر پرنس نے اس سلسلے میں فسانہ عجائب کے جتنے نسخے مل سکے، سب کو دیکھا ہے۔ انھوں نے اس کی تصنیف اور اس میں حک و اصلاح کی پوری داستان مرتب کی ہے اور ایک سیر حاصل مقدمے میں، فسانہ عجائب کی اہمیت، مصنف کے اسلوب، قصے کی خوبیوں، کردار نگاری اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی، سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ قدرتی طور پر انھیں اپنے بیروں سے ہمدردی ہے اور انھیں پر

بعض نقادوں یا دئی کے دبستان کے پیروؤں نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کا اُنھوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور مصنف کو اس کا حق دلانے کی کوشش کی ہے۔ سرور کا اسلوب ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خاص رنگینی اور دلکشی بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ نثر کا اچھا اسلوب نہیں ہے مگر اس کے باوجود اسے نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اظہر پر دین صاحب نے فسانہ عجائب کی خصوصیات اور سرور کے اسلوب پر جس طرح بحث کی ہے اس سے ہمیں اس طرز کو سمجھنے اور اس کے انصاف کرنے میں مدد ملے گی۔

کتاب کے شروع میں لکھنؤ کی تہذیب کی جو تصویر ہے میرے نزدیک اسکی اہمیت کسی طرح قصے سے کم نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اظہر پر دین صاحب نے لکھنؤ کے اُن تمام فن کاروں کے بارے میں معلومات اکٹھا کر دی ہیں جن کا ذکر سرور نے کیا ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف اعراب اور اوقات کا خاص التزام کیا ہے بلکہ طلباء کے لئے مشکل الفاظ کی ایک فہرست بھی دے دی ہے۔ عربی کے فقرات اور آیتوں کی تشریح، رسومات کے متعلق مفید اشارے، محاوروں کی تشریح بعض اہم ایڈیشنوں کے خاتمے کی تحریریں علیحدہ علیحدہ دی گئی ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے کتاب کی اہمیت اور افادیت بہت بڑھ گئی ہے اور اسے ہر لحاظ سے ایک معیاری ایڈیشن کہا جاسکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اُردو داں طبقہ اظہر پر دین صاحب کی اس عرق ریزی اور محنت کی قدر کرے گا اور اس ایڈیشن کو جس کی کتابت و طباعت کا بھی خاص اہتمام کیا ہے، ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔

آل احمد سرور

(پروفیسر) آل احمد سرور

۱۔ شبلی روڈ علی گڑھ

عرضِ مرتب

تحقیق و تدوین کا کام انفرادی بھی ہوتا ہے اور جماعتی بھی۔ میں نے "فنائتِ عجائب" کی ترتیب کا کام اکیلے ہی شروع کیا تھا، لیکن لوگ مدد کرتے گئے اور آہستہ آہستہ اس کام میں بہت سے لوگ شریک ہو گئے۔ اس کام میں بزرگوں نے میسرے حوصلہ افزائی کی، رفیقوں نے قدم قدم پر ساتھ دیا، اور خوردوؤں نے بروقت ہاتھ بٹایا۔ اگر میں ان سب کے نام گنونا چاہوں تو گنونا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ لوگ اُن گنت ہیں۔

ڈھائی سال پہلے جب میں نے اس کا خاکہ بنایا تھا تو میرے استاد اور صدر شعبہ اردو، پروفیسر آل احمد سرور نے مجھے بہت قیمتی مشورے دیئے۔ اس کے بعد کام کے دوران میں جب کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو میں نے سرور صاحب سے مدد لی۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

جب میں نے یہ کام شروع کیا تو پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے نہ صرف میسرے حوصلہ افزائی کی بلکہ بعض نئی باتیں بھی بتائیں۔ مجنوں صاحب کی عالمانہ گفتگو شعبہ اردو میں برسوں گونجتی رہے گی۔ میں نے اس سلسلے میں جب بھی اُن سے رجوع کیا، انہوں نے

اپنے مخصوص انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ اس قسم کی بات چیت کا عکس جا بجا میرے مقدمے میں نظر آتا ہے۔

اس درمیان میں مجھے ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب ریڈر شعبہ اردو کے مشورے بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ میرے انہماک کو دیکھ کر انہوں نے میری غیر معمولی حوصلہ افزائی کی۔ مجھے افسوس ہے کہ جب یہ کتاب اپنی آخری منزل پر پہنچنے والی تھی تو اُن کو انگلستان جانا پڑا اور میں اُن کے مزید مشوروں سے محروم رہ گیا۔

ڈاکٹر معین احسن جذبی اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ داستانوں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی بھی کی۔

ایک روز خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی میرے یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے میرا مقالہ پڑھا اور جا بجا اپنے مشورے دیئے۔ ذوقی صاحب لکھنؤ سے محبت کرتے ہیں اس لئے اس سلسلے میں اُن کی رائے میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ریڈر شعبہ اردو نے اپنی مصروفیات کے باوجود میرے مقالے کی ایک اک سطر پڑھی اور بعض بے حد قیمتی مشورے دیئے، جس کا عکس میرے مقالے میں جا بجا نظر آتا ہے۔

جناب نسیم قریشی، لکچرر شعبہ اردو، داستانوں سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مجھے کئی بار اُن سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ نسیم صاحب، رجب علی بیگ سرور کے سلسلے میں بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں اور میں بھی اُن کی بیشتر رائیوں کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے نسیم صاحب سے بڑی تقویت ملی۔

ڈاکٹر سید نور الحسن نقوی، ڈاکٹر نعیم احمد، ڈاکٹر سید ناصر حسین نقوی اور ڈاکٹر حنیف نقوی سے میری ملاقات بہت پرانی نہیں ہے لیکن اُن کے خلوص اور مشوروں نے مجھے اور اس کتاب کو بے حد متاثر کیا۔

ڈاکٹر منظر عباس نقوی، شہریار صاحب، لکچرر شعبہ اردو بھی میرے مشوروں میں برابر شریک رہے اور ان حضرات کو جب کبھی کوئی نئی بات معلوم ہوئی، انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر ضرور کیا۔ ان کی علم دوستی نے مجھے بہت متاثر کیا۔

آزاد لاہوری کے اراکین نے میری بڑی مدد کی۔ جن میں محمد یونس صاحب، مہر الہی صاحب، اور فرخ جلالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فرخ جلالی صاحب نے بعض کتابوں کی نشاندہی کی۔ اُن کی تحریک سے ہی میں نے ہنرمندان لکھنؤ کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ چند روز ہوئے میں نے شعبہ اُردو کے ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں اپنے مقالے کا ایک حصہ پڑھا۔ یہاں اس مقالے پر اساتذہ شعبہ اُردو کی مجموعی رائے میرے سامنے آئی اور میں نے اس روشنی میں مقالے پر نظر ثانی کی۔ میں ان سب حضرات کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ تو علی گڑھ کے حضرات تھے لیکن علی گڑھ کے باہر کے لوگ بھی تھے جنہوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ گزشتہ سال چھٹیوں میں مجھے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف نے میرے کام کو بغور دیکھا۔ اس کی ترتیب کے سلسلے میں مجھے بعض قیمتی مشورے دیئے اور مجھے چند اچھے نسخے دکھائے اور اس کی اجازت بھی دی کہ فسانہ عجائب کے اس اڈیشن کو اُن کے نام نامی سے معنون کروں۔ اُسی روز اُن کے ہونہار صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسی زمانے میں رجب علی بیگ سرور پر اُن کا تحقیقی مقالہ بھی چھپ رہا تھا۔ گویا وہ ان تمام مراحل سے گزر چکے تھے جن سے میں گزر رہا تھا۔ جب میں علی گڑھ واپس آیا تو مقالہ کے جتنے اوراق چھپ چکے تھے انہوں نے بذریعہ ڈاک میرے پاس ارسال کر دیئے جن کا حوالہ جا بجا میرے مقدمے میں ملتا ہے۔ ان کی کتاب ”رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامہ“ ایک اہم تحقیقی مطالعہ ہے جس کے لئے ڈاکٹر نیر مسعود یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس افضل المطابع کا جو نسخہ ہے اس میں چار صفحے موجود نہ تھے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے میرے لئے اپنے نسخے سے یہ اوراق نقل کر کے بھیجے۔

پچھلے سال چھٹیوں میں، میں الہ آباد گیا۔ وہاں اپنے عزیز دوست جہاد حیدر صاحب کے توسط سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے ملا۔ موصوف کے پاس مراۃ الاخبار کلکتہ کا ایک نسخہ دیکھنے کو ملا، جو تعلق ٹائپ میں ۱۲۶۲ھ میں چھپا تھا اس اخبار سے مجھے کافی فائدہ پہنچا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر عابد رضا بیدار (رام پور) علی گڑھ تشریف لائے دوران گفتگو

اُن سے فسانہ عجائب کا ذکر آیا۔ انھوں نے میرے مسودات دیکھ کر چند اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔

رام پور ہی سے اکبر علی خاں صاحب تشریف لائے، ان سے بھی فسانہ عجائب کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوئیں۔ رضا لاہوری میں فسانہ عجائب کے سات آٹھ اڈیشن موجود ہیں جن میں سے دو بہت قیمتی ہیں۔ ایک تو مطبع حسینی کا ۱۲۵۹ھ کا اڈیشن اور دوسرا مطبع مرآۃ الاخبار کا ۱۲۶۲ھ کا اڈیشن جس کی ایک کاپی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔

خط و کتابت کے ذریعہ جن مخلصین اور احباب سے میں نے معلومات فراہم کیں ان میں ڈاکٹر حکم چند نیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ایک فارسی نسخے کے بارے میں اطلاع دی۔

جولائی ۱۹۶۸ء میں کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں الہ آباد گیا وہاں کتابستان کے مالک اور میرے عزیز دوست انور اللہ خاں صاحب کے توسط سے حاجی حرمین شریف محمد حسین کے مطبع کا چھپا ہوا نسخہ ملا جو میرے لئے نہایت اہم ثابت ہوا۔ جب میں نے اپنا یہ کام شروع کیا تو ب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ تھی سید ضمیر حسن دہلوی کی کتاب "فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ"۔ مجھے اس کتاب میں ایک نیا لب و لہجہ اور ایک انداز فکر نظر آیا۔ جب میں دلی گیا تو میرے بھائی عزیز محمد قاسم صدیقی نے اُن سے ملاقات کرائی۔ اس مفصل ملاقات میں بعض کام کی باتیں سامنے آئیں اُن کی باتوں سے میرے حوصلے بڑھے اور میں نے اُن کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ضمیر حسن دہلوی کی یہ کتاب اردو داں طبقے کی مزید توجہ کی مستحق ہے۔

میرے بزرگ جناب منظور حسن فاروقی اُن گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو فن تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے "فسانہ عجائب" کے اس نسخے کی تاریخ لکھی جو اس کتاب میں شامل ہے۔

آخری مرحلہ کاپیوں کی تصحیح کا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے میرا ہاتھ بٹایا۔

ان میں میرے ایک بزرگ چودھری عثمان علی خاں صاحب اور میرے چچا جناب محمد ادریس صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے بعض بہت قیمتی مشورے دیے۔

جناب سردار علی زیدی۔ عزیز ی جاوید اقبال، عزیز ی کلیم شبیر، عزیز ی محمد آفاق، عزیز ی سیما سلہا نے بھی کامیوں کی تصحیح میں میری بڑی مدد کی، ورنہ ان کی تصحیح تنہا میرے بس کی بات نہ ہوتی۔

میری بیوی صدیقہ بیگم نے گزشتہ دو سال میں وقتاً فوقتاً میرے اس کام میں مجھے بڑا سہارا دیا۔ لکھنؤ کی زبان اور شادی بیاہ کی رسموں کے سلسلے میں ان کی نظر اور معلومات بہت اچھی ہیں بالخصوص بیگماتی محاوروں اور رسموں وغیرہ کے سلسلے میں ان سے مجھے بہت زیادہ مدد ملی۔

ان کے علاوہ جن حضرات نے وقتاً فوقتاً مشورے دیے اور میری مدد کی، ان میں ڈاکٹر عشرت حسین انور، ڈاکٹر وحید اختر، مولوی حفیظ الدین احمد نائب محمد انجن ترقی اردو (ہند) محمد حبیب خاں۔ لاہورین انجن ترقی اردو (ہند) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی حفیظ الدین صاحب نے فرہنگ پر نظر ثانی بھی کی۔

میں آخر میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر، استاد شعبہ اردو کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ تحقیق کے کاموں سے اُن کی دلچسپی غیر معمولی ہے اور اُنھوں نے اس کام میں میرا قدم قدم پر ہاتھ بٹایا۔ میں نے ہر موقع پر اُن سے مدد لی اور اُنھوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ یہاں تک کہ اس کتاب کی ایک اک سطر بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ پڑھی اور بے حد مفید مشورے دیے۔ وہ اگر میری اعانت نہ کرتے تو میں شاید ہمت ہار چکا ہوتا۔ اُنھوں نے میری خاطر بعض حوالوں کو تلاش کیا۔ تحقیقی اور علمی کاموں سے ان کی لگن نے میری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دیا۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

فسانہ عجائب کے ترتیب و تدوین کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش ہے اور نقشِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ یہ کام اور لوگ بھی کر رہے ہیں۔ دلی میں محترم رشید حسن خاں اور ڈاکٹر فضل الحق صاحب اور لکھنؤ میں جناب سیما سلہا صاحب فسانہ عجائب کو مرتب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان حضرات کا کام مجھ سے بہت بہتر ہوگا اور یہ حضرات اس کا پورا حق ادا کر سکیں گے اور اردو داں حضرات سردار کی فسانہ عجائب سے صحیح طریقے

سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

اس کی ترتیب میں ایک قلمی نسخہ کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اُن زادِ لا بُریری
 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملکیت ہے۔ یہ نسخہ بہت خوبصورت ہے اور اس کی ایک اہم خصوصیت
 یہ ہے کہ اس میں بیان لکھنؤ میں چند صفات ایسے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے۔ میں نے
 اس کی عبارت اپنے نسخے میں شامل کر دی ہے اور حاشیہ میں اس کا ذکر کر دیا ہے۔ اس
 لکھنؤ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شائقینِ سرور اس سے
 خصوصیت سے لطف اندوز ہوں گے۔

الہر پریز

شعبہ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مرزا رجب علی بیگ سرور

(حیات)

مرزا رجب علی بیگ سرور، اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ان کے سن پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مصنف "تاریخ ادب اردو" لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔"

حاج حسن قادری لکھتے ہیں :-

"غالباً ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء (مرزا غالب سے دس برس پہلے)"

ڈاکٹر نیر مسعود نے کمزور آواز میں اس امر پر بحث کرتے ہوئے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء کا اندازہ لگایا ہے۔ ان کا یہ قیاس اس بنا پر ہے کہ "فسانہ عجائب" کے دیباچے میں سرور نے لکھا ہے کہ :

"چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے"

چونکہ "فسانہ عجائب" کا نقش اول ۱۲۴۰ھ میں تیار ہوا اس لئے ڈاکٹر نیر مسعود

اس نتیجے پر پہنچے کہ چالیس سال پہلے یعنی ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان تمام بحثوں کا ماحصل یہ ہے کہ سرور تیرھویں صدی ہجری کے عشرہ اول کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

سرور کے وطن کے متعلق مخدوم اکبر آبادی نے لکھا ہے :-

۱۔ تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ دمرزا محمد عسکری ص ۲۱

۲۔ داستان تاریخ اردو ص ۱۵۸

” زیادہ تر لوگوں کا فیصلہ تو یہی ہے کہ سرور لکھنؤ کے باشندے تھے

مگر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ سرور کی تصانیف میں اس قسم کی شہادت موجود ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا آبائی وطن اکبر آباد تھا۔ چونکہ یہ مقام اس بحث کے لئے مناسب نہیں ہے اس لئے مرن یہ بتا کر کہ سرور کا وطن آگرہ تھا۔ یہ بات ختم کی جاتی ہے۔“

لیکن مخمور اکبر آبادی نے اپنے اس دعوے کے لئے دلیل نہیں پیش کی۔ موجودہ مواد کی روشنی میں سرور کا اکبر آباد سے تعلق ثابت کرنا مشکل ہے۔ یہ بات سرور کی کسی تحریر سے ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے لکھنؤ ہی کو ان کا وطن تسلیم کرنا چاہئے، جس سے سرور کو وہی والہانہ تعلق ہے جو کسی حساس اور خوددار شخص کو اپنے وطن سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ”گلزار سرور“ (ترجمہ حدائق العشاق) میں اپنے اور لکھنؤ کے متعلق جو بیان ہے، سرور نے اس کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے۔

”مذکورہ آوارہ وطن، خزاں دیدہ چمن مترجم حدائق العشاق رجب علی بیگ

سرور عفی عنہ“

یہ عنوان اس خیال کی توثیق کرتا ہے کہ لکھنؤ ہی سرور کا وطن تھا۔

یہ کتنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لکھنؤ کی محبت ہی نے سرور کو صاحب طرز

نثر نگار بنایا۔

انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کو اپنی شخصیت میں سمولیا تھا اور اس کا اظہار جب ادب کی شکل میں ہوا تو وہی اُن کا اسلوب ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کی نثر کو لکھنؤ سے الگ کر کے دیکھنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی کی تحصیل بھی کی تھی۔ جیسا کہ اُن کی تصانیف کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے زمانے کے فارسی اور عربی کے معیار کو نہ پہنچ سکے ہوں یا محض اندازہ انکاری ”شکوۃ محبت“ کے دیباچے میں یہ لکھتے ہوں :-

لے فناء عجائب۔ دیباچہ مخمور اکبر آبادی ص ۷

۷ گلزار سرور مطبوعہ افضل المطابع ۱۸۷۰ء ص ۷

”نامساعدت بخت اور نیرنگی زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہوا، نہ فارسی میں کامل ہوا۔ دونوں سے نا آشنا رہا۔ ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پستیمتی سے اردو میں لکھنے میں اوقات بسر کی۔ کچھ دن نظم کا اہتمام رہا۔ شعر کہنے کا خیال خام رہا، جب وہ بھی نہ ہو سکا، نثر کی طرف خیال آیا۔“

فارسی سے سرور کی واقفیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو میں بعض فارسی کتب کے ترجمے بھی کئے۔

سرور بیشتر فنون لطیفہ میں کمالیت کی حد تک دخل رکھتے تھے۔ بہت اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اور اس فن میں انھوں نے مشہور خطاط حافظ محمد ابراہیم سے تعلیم حاصل کی۔ رام بابو سکسٹہ کا خیال ہے کہ ”موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے۔“ اس کا اندازہ ان کی ان تحریروں سے بھی ہوتا ہے جہاں انھوں نے اس فن کی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔

شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی رعایت سے سرور تخلص اختیار کیا تھا اور آغا نواز حسین خاں نوازش کے شاگرد ہوئے۔

آغا نواز، خود بھی اچھے شاعر نہ تھے۔ سرور کا کلام بھی معمولی درجہ کا ہے۔

۱۔ شگوفہ محبت مطبع محمدی، لکھنؤ ۱۲۷۲ھ ص ۳۷،

۲۔ تاریخ ادب اردو۔ ترجمہ عسکری ص ۲۱

۳۔ نوازش مرزا خانی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد حسین علی خاں تھے۔ ان کا ذکر سرور، بیان لکھنؤ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

”امیروں میں حسین علی خاں، ببل ہزار داستان، خوش الحان“

مصطفیٰ نے ریاض الفصحی میں مرزا خانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”نوازش حسین خاں نوازش عرت مرزا خانی ولد حسین علی خاں، ابن

نواب ناصر خاں صوبہ دار کابل و پیشاور و غزنی، قوم مغل چگیتی وطن بزرگانہ نش —

خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشو و نما یافت۔ جواں مہذب الاخلاق و

خوش اخلاق است، دیوان ادل بطور ایشان (سوز) گفتہ و حالایک

دیوان دیگر ہم جمع نمود۔“

اس کا خود سرور کو بھی احساس تھا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ”شعر کہنے کا خیال خام رہا“ جب وہ بھی نہ ہوسکا، نثر کی طرف خیال آیا۔“

سرور کو علم و شعر سے غیر معمولی شغف تھا۔ ”قسانہ عجائب“ میں اشعار کے برمحل اور بے محل استعمال سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ کی ادبی و تہذیبی صحبتوں سے سرور نے بہت کچھ حاصل کیا۔ تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں فتح الدولہ، مرزا محمد رضا برق کے دولت کدے پر ہر شب ماہ ایک مشاعرے کا اہتمام ہوتا تھا۔ سرور نے جس انداز سے اس کا ذکر کیا ہے اس سے خیال ہے کہ شاید وہ خود بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے ہوں گے۔ سرور کا ادبی مذاق تربیت یافتہ ہے۔ لکھنؤ میں سرور نے جو زندگی گزاری وہ یقیناً بھرپور ہوگی۔ بیان لکھنؤ میں انھوں نے جس طرح لکھنؤ کے گلی کوچوں کی تصویر کشی کی ہے، سیر و تفریح کا ذکر کیا ہے، وہ ایک ایسے آدمی کا بیان معلوم ہوتا ہے جو خود تماشا بھی رہا ہے اور تماشا بھی۔ اتنی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اگر انھیں تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا تو یہ حقیقتاً تکلیف دہ بات تھی۔

جب ترک لکھنؤ کا ذکر آتا ہے تو عام طور پر وہی بات کہی جاتی ہے جو رام بابو سکینہ کی ”تاریخ اردو ادب“ میں مذکور ہے کہ :

”۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر

کے ”حکم“ سے لکھنؤ سے جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ”ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجری نویں صلیع بارہ سو چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبوراً کوردہ کانپور میں ہوا۔ بسکہ

یہ بستی پوچ و پڑ ہے۔ اشارات یہاں عنقا صفت ناپید ہیں“

لیکن اس بات کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی کہ وہ غازی الدین حیدر کے ”حکم“ سے جلا وطن کئے گئے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں کانپور کی حیثیت کالے پانی کی تھی اور بقول ڈاکٹر نیر مستود کے

”اکثر شاہی مستوبین اور مجرموں کو جلا وطنی کی سزا دے کر دریائے گنگا پار

اتار دیا جاتا تھا۔“

ایسا ہرگز نہیں کہ ہر وہ شخص جو کانپور میں جا کر رہا شاہی مستوب یا مجرم ہی ہو۔ یہ بات کہ رجب علی بیگ سرور کی جلا وطنی ”بحکم غازی الدین حیدر“ عل میں آئی تھی، بہر حال محتاج ثبوت ہے۔ اس بات میں اگر کچھ بھی صداقت ہوتی تو سرور کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر کر سکتے تھے۔

اس کے برخلاف سرور نے کانپور آنے کے بارے میں لکھا ہے کہ
”آخر الامر بمقتضائے عادت تلاش معاش کے حیلے میں فلک تفرقہ پر داغ
گردوں عریہ ساز نے صورت مفارقت دکھائی، مہاجرت استقبال کو آئی۔“

اس میں کانپور آنے کا سبب ”تلاش معاش“ کو بتایا ہے۔ سرور یہ تحریر خود غازی الدین حیدر کے سامنے پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ اگر وہ واقعی جلا وطن کئے گئے ہوتے تو ان کو اتنی جرات ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اسی بادشاہ کے سامنے غلط بیانی سے کام لیتے کہ یہ صورت تو بادشاہ کی مزید ناراضگی کا سبب ہو سکتی تھی۔ سرور اپنے عہد کے نمایاں فرد تھے۔ تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے اگر جلا وطنی بحکم بادشاہ اودھ ہوتی تو اس معاملے پر معاصر تذکرے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خود لکھنؤ والوں سے تو کم از کم سرور کے حالات چھپے ہوئے نہ تھے اور فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع کے خاتمہ الطبع سے صاف طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ان کے زمانے میں ان کے مخالفوں کا ایک گروہ موجود تھا۔

”اور حاسد کی بات نرالی ہے لا اُبائی ہے۔ خدا رسول کو ان کی زبان سے نجات ملی تو دوسرا کب بچتا ہے۔ ان لوگوں کو بھونکنے کی عادت ہے لکھی نہیں بچتا ہے۔“

ان کے مخالفین میں سید محمد فخر الدین حسین خاں متخلص بہ سخن دہلوی مصنف ”سروش سخن“ نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر سرور فی الواقع جلا وطن کئے گئے ہوتے تو دوسرے مخالفین کے علاوہ سخن دہلوی ”سروش سخن“ کے دیباچے میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔ ”جلا وطنی“ والی بات محض زیب داستان کے لئے کسی نے کہہ دی ہوگی جس کی بظاہر

۱۵ فسانہ عجائب۔ مطبوعہ نولکٹر ۳۹ داں اڈیشن۔ ص ۱۵

۱۶ فسانہ عجائب۔ مطبوعہ افضل المطابع کانپور ص ۱۲۶

کوئی حقیقت نہیں لیکن تلاش معاش میں سرور کا کانپور جانا بھی تحقیق طلب ہے۔ بڑھاپے میں جب وہ تلاش معاش کے چیلے سے بنارس گئے تھے تو انھیں بنارس سے کوئی شکایت نہیں تھی اور اس زمانے کے ان کے خطوط میں کانپور کا ذکر بھی اکثر آیا ہے لیکن ان خطوں میں بھی انھوں نے اس بستی (کانپور) کی تذلیل نہیں کی۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کانپور میں سرور کو کوئی روزگار مل گیا تھا بلکہ ”فسانہ عجائب“ کے دیباچے میں سرور نے لکھا ہے ”بیکار مباحش کچھ کیا کر“۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرور وہاں بھی بیکار ہی رہے۔

”انشائے سرور“ میں سرور کا ایک خط ہے جو انھوں نے اپنے متبنی بیٹے سید احمد علی کو لکھا ہے، اس میں وہ اپنے بارے میں ایک اہم انکشاف کرتے ہیں :-

”اگر ہنگام سرور بحال خود نماند۔ زمانہ ربخ دغم ہم بسر خواہ شد۔ عالم شمارا یاد خواہ بود کہ بعلت خون گرفتار شدم۔ تمام عالم می گفت کہ ازیں منحصر جاں بر نہ خواہ شد۔ لیکن بفضل ایزدی آیسے بمن نہ رسید۔ تا حال زندہ و سلامت ہستم“

ڈاکٹر نیر مسعود کو شک ہے کہ ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں انھیں کانپور جانا پڑا۔ بر ا قیاس کتاب ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں جب وہ کانپور گئے تو اس وقت وہ قتل سے بری ہو چکے تھے۔ (ورنہ بظاہر ”فسانہ عجائب“ کے مقدمے میں اس کا ذکر کسی بھی عنوان سے نہ کرے گی کوئی وجہ نہیں) البتہ بری ہونے کے بعد مقتول کے متعلقین کی دشمنی کی وجہ سے ان کے لئے لکھنؤ کا قیام خطرے سے خالی نہ ہو گا۔ غالباً اسی لئے کانپور کے قیام کا زمانہ انھوں نے گوشہ نشینی میں گزارا۔ لیکن ان کی یہی گوشہ نشینی ادب کے حق میں فال نیک ثابت ہوئی کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے اپنی لازوال تصنیف ”فسانہ عجائب“ لکھی اور بادشاہ اول غازی الدین حیدر کی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر کے عہد میں سرور اپنے وطن لکھنؤ واپس آئے۔ سرور لکھتے ہیں :

۱۔ انشائے سرور۔ نوکلثور جون ۱۹۱۶ء۔ ۲۔

۳۔ اس قسم کی دشمنی کی مثالیں اس عہد میں ملتی ہیں مثلاً دیکھو (مجموعہ)

”۱۲۵۳ھ کو نصیر الدین حیدر داخل فردوس بریں ہوئے اور محمد علی شاہ بادشاہ بعد ہنگامے مناجان کے تخت نشین ہوئے۔ زمانے کا رنگ بدلا۔ ہر شخص بر سر حساب ہوا، مسودہ فتنہ و فساد کا باب ہوا“ اور آگے چل کر لکھتے ہیں :-

”بندۂ بھی خوش طامعی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا۔ ہر شب شب بمرات ہوئی، روز نور روز ہوا“

۱۲۵۹ھ میں فسانہ عجائب کی پہلی بار اشاعت ہوئی جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے :-

”لہ الحمد والمنہ کہ نسخہ، قصہ جان عالم شہزادہ بہ زبان اردو مسمی فسانہ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بیک واسطہ سلسلہ تلمذ و ہجرات می رسانند در ماہ جمادی الثانیہ روز شنبہ تاریخ نہم ۱۲۵۹ھ در عہد دولت مہد امجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مطبع حسینی میر حسن رضوی دہلہ میر حسن عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنؤ بمجلہ محمود نگر طبع نمود“

امجد علی شاہ کا زمانہ سرور کے لئے خوش آئند بھی ثابت ہوا اور تکلیف دہ بھی۔ اس زمانے میں ’فسانہ عجائب‘ کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوا، اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند سال کے اندر متعدد ادیشن شائع ہوئے لیکن اس زمانے سرور کو پھر بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ منصب وزارت میں تبدیلی ہوئی۔ شرف الدولہ سے بادشاہ خوش نہ تھے۔ اس لئے وہ گوشہ نشین ہو گئے اور ان کی جگہ امین الدولہ و وزیر ہوئے۔ سرور بھی اس پلیٹ میں آ گئے۔

امجد علی شاہ کا زمانہ چار سال دس مہینے پر مشتمل تھا اور یہ زمانہ سرور نے بڑی پریشانیوں میں گزارا۔

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ کا سرطان کے موذی مرض میں انتقال ہو گیا

۱۔ فسانہ عجائب مطبع مصطفائی لکھنؤ - ۱۲۶۲ھ ص ۱۹۴

۲۔ فسانہ عجائب مطبع مصطفائی لکھنؤ - ۱۲۶۲ھ ص ۱۹۷

۳۔ فسانہ عجائب، قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نقل پہلا ادیشن۔

اور اسی سال واجد علی شاہ المعروف بہ جان عالم کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ سرور نے واجد علی شاہ کی خدمت میں ایک قطعہ تاریخ پیش کیا۔

بہار جوش میں ہے اور نئی ہے کیفیت سرور سب کو ہی کہتے ہیں متقی و رند
جو زیبِ تخت ہوا شب کو شاہ نیک اختر ہوا ہے سالِ جلوس اس لئے ”جراغِ ہند“
اس کے بارے میں خود لکھتے ہیں :-

”جلوس کی تاریخ کہہ کے گزرائی اس کے جلد و میں پچاس روپیہ ہر مہینے خزانے
سے پاتا تھا جو کسی کتاب کے ترجمے کا ارشاد ہوا بجالاتا تھا چنانچہ ”شمیر خانی“
کو اردو میں لکھ کر ”سرور سلطانی“ نام رکھا اور بہت صاف اردو میں لکھا ہے۔
الغرض بوڑھا پے کے دن نکلتے ہوئے ہیں۔ گھر میں بیٹھا تمام کرتا تھا، پیری
کی صبح کو شام کرتا تھا“

اس کے ساتھ ہی سرور نے ایک عرضداشت بھی لکھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا جیسا کہ
”احوالِ واجد علی شاہ“ کے تذکرے میں سرور خود لکھتے ہیں :-

”یہ رنگ دیکھ کے سرور محزون کو بھی ملازمت کی تمنا ہوئی۔ عرضداشت
پیش کی۔ یادری تقدیر سے تاریخِ جلوس سمیت مانوس پسند آئی۔ عرضداشت
مزین بہ دستخط فرمائی۔ ذمہ ملازمین میں شمول ہوا۔ ترقی خواہ قدیم کو جدید اعزاز
حصول ہوا۔“

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء سے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء تک سرور نے کئی کتابیں لکھیں،
جن میں ”شرع عشق“ بہت مشہور ہوئی۔ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں امجد علی خاں رئیس سندیلہ
کی فرمائش پر ”شکوہِ محبت“ لکھی۔ اسی دوران میں ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں سرور دلی
بھی گئے، جہاں ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی۔ اس کا حال ”تذکرہ غوثیہ“ میں
مندرج ہے :-

”ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف ’فسانہ عجائب‘

۱۔ انشائے سرور - رقعہ نمبر ۹ - ص ۱۱

۲۔ فسانہ عبرت - رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید محمود حسن رضوی ص ۷

۳۔ تذکرہ غوثیہ - شاہ گل حسن قادری خلیفہ خاص مطبوعہ ۱۳۲۹ھ - ص ۱۰۱-۱۰۲

لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ ”مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے“ — کہا ”چار درویش کی“ ”میاں رجب علی بولے“ اور فسانہ عجائب کیسی ہے“ ”مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔“ ”اجی لا حول ولا قوۃ“ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک ٹمک بندی اور بھٹیاری خانہ جمع ہے“ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ”ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔“

”دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے (سید غوث علی شاہ قلندر قادری رحمۃ اللہ علیہ) پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ ”حضرت! یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آئیے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کرائیں“ ہم اُن کے ہمراہ ہوئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے، مزاج پر سی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ ”جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانہ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی اور نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو۔ اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا“ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت سرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزادی بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔“

اس واقعہ کی صداقت میں زرا شبہہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود مرزا غالب اس اسلوب کو پسند کرتے تھے کیونکہ بعد میں انھوں نے ”گلزار سرور“ کی تقریظ بھی لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تقریظ کو غالب نے کسی مجبوری کے تحت تو لکھا نہیں ہوگا اور غالب بے جا تعریف کے قائل نہ تھے منشی ہر گوپال تفتہ نے اپنی کسی کتاب کی تقریظ کے متعلق مرزا غالب کو شکایت لکھا کہ ”آپ نے تقریظ کچھ بھی نہ لکھی یعنی جو طریقہ

فرمودہ اس وقت اپناے روزگار کا تھا۔ آپ نے اس کی تقلید نہیں کی، تو مرزا صاحب جواب میں لکھتے ہیں :-

”واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی مدح تمہاری کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں۔“

اس کے پیش نظر اب ”گلزار سرور“ کی تقریظ میں مرزا غالب لکھتے ہیں :-

”مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان دشواری تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ

تحریر ہے۔“

فسانہ عجائب نے سرور کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ وہ اپنے آپ کو فخریہ ”مولف فسانہ عجائب قصہ جان عالم“ لکھتے تھے۔ یہ قصہ قبول عام کی سند حاصل کرتا رہا۔ لیکن جس طرح چڑھتی دھوپ کو زوال آتا ہے سرور کو بھی جلد ہی برے دن دیکھنے پڑے۔ جب انگریزوں کی دخل اندازی سے تنگ آکر واجد علی شاہ نے انتظام سلطنت سے علیحدگی اختیار کی اور سلطنت کا کام نواب علی نقی خاں کے سپرد ہوا تو قطب الدولہ جن کے توسط سے سرور کو ملازمت شاہی ملی تھی، وہ جلا وطن کر دیے گئے۔ چنانچہ سرور پر اس کا اثر پڑا۔ ان کی تنخواہ بھی مہینوں نہ ملتی تھی۔ سرور نے تنگ آکر ایک عرضی نواب علی قلی خاں وزیر کی خدمت میں پیش کی، جس میں بڑی جرأت کے ساتھ اپنے معاملے کو پیش کیا۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے :-

نیاز مند نو برس بیکاری میں مثل جرس نالوں، بے سرو سامان، مبتلائے

لہ خطوط غالب۔

۱۵ گلزار سرور، تقریظ مرزا غالب، طائفل کی پشت پر۔

۱۶ فسانہ عبرت، مصنفہ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ص ۱۱۱

۱۷ ایضاً ایضاً ایضاً

بلائے روزگار رہا۔ قافلے کے قافلے منزل مقصد کو پہنچے، مگر یہ گم کردہ راہ گزشتہ
بادیہ ادبار رہا۔ عجب گردش سے فلک کج رفتار میں دنوار پھرتا تھا کہ یہ شامت
زدہ شام و گچاہ بے جرم و گناہ حلقہ غم و دائرہ الم میں بسان نقطہ پر کار ہر بار
گھرتا تھا۔ نہ سامان مفر ہوتا تھا، نہ طلال سے مفر ہوتا تھا۔ جس کو بچے میں بیکاری
کو طمانا تھا، جو راہ بعد اکرہ نکالتا تھا، اُس مرحلے میں اُلجھ کے منہ کی کھاتا تھا
گتھی نہ سلجھتی تھی، اُلجھن بڑھتی تھی۔ اس پیچ میں یہ بل پڑتا کہ دم گھبراتا۔ کچھ بن نہ آتا تھا۔

یہ عرضی اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص انداز میں
جذبات کے سہارے تخیلی پیکر بنائے ہیں اور دل کی بات اس طرح کہی ہے کہ زبان و بیان کے
تصنع کے باوجود اثر کرتی ہے اور اخیر میں سرور نے لکھا ہے کہ :-

”حضور عالم قدرداں ادنیٰ و اعلیٰ کے ہیں اس وجہ سے عرض حال ہے کہ کس دناکس
سے التجا کا سخت طلال ہے کسی سخی دانا کے ذمے تنخواہ کا اہتمام ہو کہ شکایت بخت کی کہانی
کا قصہ تمام ہو؟“

سرور کی اس تحریر کو ڈاکٹر نیر مسعود نے جرات رندانہ سے تعبیر کیا ہے۔ سرور نے
سخت زندگی گزاری، مصائب کا مقابلہ کیا، لیکن ان کی شخصیت میں خم نہ پیدا ہوا۔ ”انشائے سرور“
میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”تین دن میں یہ خط لکھا ہے، طبیعت کیا کیا کرتی ہے، کمر جھک گئی ہے مگر گردن نہیں جھکتی ہے۔“

۱۸۵۶/۱۲۷۲ء میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی اور بادشاہ معزول کر کے کلکتہ بھیج دیے گئے۔ وہ اس
بربادی سے تباہ حال ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سرور کو مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ نے بنارس بلایا۔ جہاں انکی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔
۱۸۵۷/۱۲۷۳ء میں غدر ہو گیا۔ سرور اس سانحے کی تاب نہ لاسکے اور افسان و
خیزاں لکھنے پہنچے جہاں ”ایک عالم کو تسکین عظیم میں مبتلا پایا، شہر میں شائما، چھوٹا بڑا آفت میں مبتلا، ہر گلی
کوچے میں انگریزی بندوبست، اپنے اپنے حال میں ہر ایک پست؟“

سرور پر اس کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے جا بجا اس کا اظہار کیا۔ سرور کی مالی
پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس زمانے میں انھوں نے بیگمات اودھ کی طرف سے بھی
کچھ خطوط واجد علی شاہ کے نام لکھے۔ یہ رقعات نمبری ۲۶ تا ۳۲ (۳۱ سے ۳۳ تک)

۱۲۸۰ھ فسانہ عبرت۔ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ص ۱۲۸

انشائے سرور میں ملتے ہیں۔

لکھنؤ کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ سرور کا بھی لکھنؤ میں دم گھٹنے لگا اور بقول خود ”شہر کاٹے کھانے لگا۔“

جب مہاراجہ بنارس کو ان کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بلا بھیجا اور سرور ۱۶ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کو بنارس گئے۔ جہاں ان کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار ہو گئی لیکن یہ تنخواہ کبھی پابندی سے نہیں ملی۔

بنارس میں سرور نے گیارہ سال قیام کیا۔

سرور کی بقیہ زندگی پریشان حالی میں گزری۔ کچھ ضعیفی، کچھ بیماری اور کچھ تنگ دستی نے سرور کو کہیں کا نہ رکھا۔ وہ آنکھ کے علاج کے سلسلے میں کھکتے بھی گئے (۱۲۸۰ھ) جہاں ان کی ملاقات واجد علی شاہ سے بھی ہوئی۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر کو آنکھ دکھائی، لیکن فائدہ تو کیا ہوتا، رہی سہی آنکھ اور بھی خراب ہو گئی۔ وہاں سے بے نیل و مرام واپس آئے ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں۔

”میرا دم گھبراتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے، کوئی پرسان حال نہیں کہہ دے کیوں ہو، جان کھوتے کیوں ہو، باہر جاتے ہیں تو پاؤں لڑکھڑاتے ہیں، ایسے وقت میں تم سے جدائی ہے، دیکھئے کیا مرضی الہی ہے۔ ہمارا حال قابل دید ہے، بلکہ دید ہے نہ شنید ہے جس قدر رنج و الم سے بھاگتا ہوں۔ بے سبب اس کا سامنا ہوتا ہے۔ تین چیزیں دنیا میں سخت تر ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، ضعیفی میں تنہائی، غربت میں بیماری، مفلسی میں قرضداری۔ کیا کہوں لکھ نہیں سکتا۔“

آخر ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کو اس مصیبتوں سے بھری ہوئی زندگی کا خاتمہ ہوا اور سرور لکھنؤ سے دور بنارس میں دفن ہوئے، گویا علی دو گز زمین بھی نہ ملی کوٹے یار میں۔ اس طرح ایک بڑا انشا پرداز زندگی کی مصیبتیں جھیلتا ہوا ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر نیر مسعود نے سرور کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے:۔
سرور کا زمانہ وہ تھا کہ رئیسوں اور بادشاہوں کے وابستگانِ دولت

محض چکنی چپڑی باتوں اور معمولی سی اداکاری کے بل پر اپنے گھر بھر لیتے تھے۔
 سرور کی جگہ اگر کوئی موقع پرست شخص ہوتا تو اپنے اتنے قدر دانوں سے فائدہ
 اٹھا کر خود رئیس بن سکتا تھا لیکن ان ذریعہ موقعوں کے ہوتے ہوئے بھی سرور
 کی تنگ دستی شہادت دیتی ہے کہ وہ آن بان سے زندگی گزارنا چاہتے تھے۔
 تیرہ بجتی عموماً خود داری کے دامن سے پسٹ جایا کرتی ہے، سرور کی پریشان حالی
 کے معنی کا بنیادی حل اُن کے کردار کا یہی پہلو ہے۔“

فسانہ عجائب

مختلف اڈیشنوں کا جائزہ

میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں "فسانہ عجائب" پڑھی تھی لیکن اس کے نقوش دھندلے پڑ چکے تھے۔ پچیس سال بعد جب میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو مجھے کسی اچھے اڈیشن کی تلاش ہوئی۔ لیکن جتنے بھی اڈیشن ملے وہ ایسے تھے کہ ان کا پڑھنا مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ نہ تو ان میں پیراگراف تھے، اور نہ اضافیتیں۔ اشعار بھی مسلسل لکھے ہوئے تھے۔ میں نے کلاس میں پڑھاتے ہوئے محسوس کیا کہ طالب علموں کے لئے اس کی عبارت کا پڑھنا اور زیادہ دقت طلب تھا۔

اس کے علاوہ "فسانہ عجائب" کے جو اڈیشن بازار میں ملتے ہیں، ان میں نو لکچور کا مطبوعہ نسخہ عام طور پر قابل ذکر ہے۔ اس وقت جو نو لکچور کا آخری اڈیشن پیش نظر ہے، یہ چالیسواں اڈیشن ہے۔ نو لکچور کے اڈیشنوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے اڈیشنوں کو بنیاد بنایا۔ نو لکچور مالک مطبع اودھ اخبار کو حق تالیف "فسانہ عجائب" کا مصنف نے ہیہ کیا ہے اور حسب منشاء دفعہ ۱۸ ایکٹ ۱۸۶۷ء یہ کتاب رجسٹر نمبر ۲۶۶ میں بہ صیغہ رجسٹری سے درج ہوئی۔ اس کا پہلا اڈیشن "بڑی آب و تاب اور خاص اہتمام سے شائع ہوا۔"

اس کے بعد اس مطبع سے یہ کتاب مسلسل چھپ رہی ہے۔ مختلف نسخوں میں جو

اختلاف ہے وہ مصنف کی تصحیح کی بنا پر نہیں ہے بلکہ یہ اغلاط ہیں جو مختلف ایڈیشنوں میں اپنے طور پر ہوتی رہی ہیں۔ کہیں کاتب کی تصحیح ہے تو کہیں کاپیاں پڑھنے والے کا سہو ہے۔ اس کے بعد دوسرے مطبعوں میں جو ایڈیشن چھپے وہ عام طور پر نو لکثور کے ایڈیشنوں سے ماخوذ تھے اس لئے اُن میں بھی وہ اغلاط داخل ہو گئیں۔

تین سال پہلے طالب علموں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو ایڈٹ کیا جائے۔ اگر کچھ اور بھی نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ہو جائے کہ پیرا گراف قائم کر کے، ضروری اعراب کے ساتھ اسے شائع کیا جائے۔ میں نے اپنے کاموں کو چھوڑ کر اس کا بیڑا اٹھایا اور سوچا کہ دو مہینے کے اندر یہ کام ہو جائیگا۔ لیکن جب یہ کام شروع کیا تو احباب نے رائے دی کہ مندرجہ ذیل کام اور بھی کر دیئے جائیں۔

● اس وقت ایک مفصل فرہنگ کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ فسانہ عجائب کے مشکل الفاظ اور مترادفات کے سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔ خاص طور پر طالب علموں کے لئے یہ فرہنگ اور بھی ضروری ہے۔

● 'فسانہ عجائب' میں 'بیان لکھنؤ' میں جن ہنرمندوں اور فن کاروں کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھا کر دی جائیں تاکہ پڑھنے والے ان لوگوں سے کسی حد تک واقف ہو جائیں۔ جن اشخاص کے نام اس میں آئے ہیں، ان کے حالات تحریر کر دیے جائیں۔ یہ بات اس لئے زیادہ اہم ہے کہ خود بقول سرور "خامہ مؤلف اختصار رقم ہے۔"

● مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں لکھنؤ کے محاورات کا جگہ بہ جگہ استعمال ملتا ہے ان محاوروں کی تشریح کر دی جائے تو کتاب کی افادیت بر طہ جاتی ہے۔

● انھوں نے جا بجا عربی کے فقرے اور آیتیں بھی تحریر کی ہیں، جن کو سمجھنے میں آج کے طالب علم کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ ان کو علیحدہ مع ترجمے کے مرتب کر دیا جائے۔

● فسانہ عجائب میں رسومات لکھنؤ کا ذکر بھی ہے۔ ہر چند یہ رسمیں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ پھر بھی عام قاری کے لئے اُن کی تفصیل

اور تشریح ضروری معلوم ہوئی۔

● فسانہ عجائب کو مصنف نے خود اپنی زندگی میں بار بار بہ نظر اصلاح دیکھا اور ”جو فقرہ سست پایا“ اسے چُت کیا۔ یہ تصحیح شدہ نسخے مختلف مطبعوں سے شایع ہوتے رہے۔ یہ مطبعے چونکہ سب کے سب بالآخر نیرنگی چرخ دوراں کا شکار ہوئے، اس لئے ان تصحیح شدہ نسخوں کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف نو لکثوری کا مطبع ایسا تھا جو باقی رہ گیا۔ چنانچہ پھیلے ستر اسی سال میں فسانہ عجائب جہاں سے بھی چھپی اس کا متن نو لکثوری ایڈیشن سے ماخوذ تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مختلف نسخوں کی مدد سے ”فسانہ عجائب“ کا صحیح متن تیار کیا جائے۔

اس طرح یہ کام رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ جب میں نے فسانہ عجائب کے مختلف ایڈیشنوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کا کام کس قدر دشوار ہے۔ لیکن دوستوں اور بزرگوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے ان مشکلات پر قابو پانے میں مدد کی۔ اس کام میں مجھے دو سال سے زائد ضرور لگے۔ لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اس عظیم کتاب کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنے میں سہولت پیدا ہو گئی اور ہر مرتبہ مجھ پر جو کچھ نئی حقیقتیں منکشف ہوتی تھیں، وہ نئے مسائل میرے سامنے پیش کرتی تھیں۔

’فسانہ عجائب‘ نے اپنے زمانے میں تہلکہ مچایا۔ اس کے مصنف کے دو تین جملے اردو نشر کی تاریخ میں بڑے ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا ثابت ہوئے۔ سید فخر الدین سخن دہلوی نے جو خود کو غالب دہلوی کا شاگرد بٹاتے ہیں برافردختہ ہو کر ’فسانہ عجائب‘ کا جواب پیش کیا۔ اس میں انھوں نے لکھا :-

”مگر صاحب موصوف نے جو اپنی تالیف میں بیچارے میرامن دہلوی کو

بنایا ہے۔ اپنی زبان کی تیزی سے اس صاف گو کو ایک آدھ کڑا فقرہ سنایا ہے

تو ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانہ عجائب کو درست

کیا جو فقرہ سست پایا، اُسے چت کیا، مگر غلطی نظر نہ آئی۔ کئی مرتبہ کتاب چھپی

۱۰ سرور سخن - سخن دہلوی - نو لکثوری

مگر وہ بات نہ چھپی۔

سخن دہلوی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے اس کی تصحیح اٹھارہ بار کی۔ یہ فقرہ یونہی نہیں لکھا ہے بلکہ مختلف ایڈیشنوں کو دیکھنے کے بعد اس کی واقعیت پر یقین سا آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن تصحیحات کا ذکر سخن نے کیا ہے وہ کتاب کے پھینے کے بعد عمل میں آئی ہوگی اور سخن دہلوی نے پہلے ایڈیشن (۱۲۵۹) کے بعد کے ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی ہوگی۔ جو مصنف کتاب چھپ جانے کے بعد بھی اسے بہتر سے بہتر کرنے میں لگا رہے، پھینے سے پہلے اس نے کتنی بار درست کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ بہت مشکل نہیں۔

سرور نے ”باعث تحریر اجزائے پریشاں“ میں اس کے بارے میں جو بیان دیا ہے اور بعض نسخوں کے خاتمۃ الطبع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میں جس نتیجے پر پہونچا ہوں مجملہ درج ذیل ہیں۔

سرور لکھتے ہیں :-

”ربیع الثانی کے مہینے میں سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ سے چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبور کردہ کانپور میں ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوچ و پڑ ہے، اشرف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشین، عزت گزین۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دل دشت منزل سخت گھبرایا، کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے، تیرہ بجتی سے روزِ سیاہ پیش آئے، لیکن یہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقت اسطوفت بقراط حکمت حکیم سید اسد علی صاحب شیرِ مشہر علم و کمال، سخن فہم ظریف فروش خصال طبع سودا خیز اور سرجنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی وہ حالِ فقیر دلیگیر پر الطاف و کرم فرماتے تھے۔ تدبیریں نیک و احسن دافع رنج و محن بتاتے تھے؛ ایک روز ان سے بعد اظہارِ مکلف فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ ”ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں“ سن کے فرمایا بیکار مباحث کچھ کیا کر۔ میرے میسر نہیں پیر تم کا ہلی اللہ سے نام خدا ہو جو ان کچھ تو کیا چاہئے

اس وقت یہ کلمہ تو سن طبع کو تازیانہ ہوا..... نیاز مند کو اس تحریر سے نمود نظم و نثر جو دت طبع کا خیال نہ تھا، شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی۔ جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اُسے دور کیا۔“

اس عبارت سے یہ ہرگز واضح نہیں ہوتا کہ فسانہ عجائب ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو گئی بلکہ صاف ظاہر ہے کہ اس سال سرور کو اس فسانے کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ غلط فہمی کی بنیاد وہ تاریخی قطعے ہیں جو مصنف کے علاوہ اور لوگوں نے بھی لکھے۔

جس نے سنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم بے ساختہ جی بولا نشر ہے رگ دل کا ۱۲۴۰ھ

یاد ہوش کا شعر ہے

ہوئی جو مد ہوش کو یہ خواہش کہ سال تاریخ اس کا لکھے

تو کہیں کہ آہ، دل سے نکلا، خزاں سے رنگ بہا دیکھا

”فسانہ عجائب“ کے زمانہ تالیف کے تعین کے سلسلے میں سرور کا یہ بیان اہم ہے :-

”یہ فسانہ بہ عہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور

تمام بہ عصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ ہوا۔“

اگرچہ عام طور پر بعض محققوں نے سرور کے اس بیان کی صداقت پر شک و شبہ کا اظہار بھی کیا مثلاً حامد حسن قادری یہ لکھنے کے بعد کہ ”فسانہ عجائب کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سنہ دریافت نہیں ہوئے“ لکھتے ہیں :-

”یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں

کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کا پورے گئے اس سال کے اندر یہ کتاب

لکھ لی اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دیے۔ یہ بالکل

قرین قیاس ہے لیکن ۱۲۴۰ھ (۶۱۸۲۴) غازی الدین حیدر کے زمانے

۱۵ فسانہ عجائب نو لکھتہ ۱۸۵۰

۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

۳۵ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری ص ۱۴۲

کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ ”نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔“

ڈاکٹر نیر مسعود کا خیال ہے کہ :-

”اصل فسانہ ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو چکا تھا لیکن نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سرور نے فسانہ عجائب کا وسیلہ بنا کر یہ چاہا کہ نیا بادشاہ ان کو لکھنو آنے کی اجازت دے دے۔ اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سرور نے ضروری سمجھا کہ کسی طرح ”فسانہ عجائب“ کی تالیف کو عہد نصیر الدین حیدر کا کارنامہ قرار دیا جائے۔“

یہ حقیقت ہے کہ فسانہ عجائب اپنی ابتدائی شکل میں ۱۲۴۰ھ میں ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن اس میں ترمیم و اضافہ کا سلسلہ بہت بعد تک جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے ۱۲۴۰ھ میں یہ فسانہ لکھ کر بادشاہ ادل غازی الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ شامل کیا اور ان کی خدمت میں اس کے ساتھ پیش کیا کہ یہ مقبول ہو اور انھیں لکھنو آنے کی اجازت مل جائے یا اس کے صلے میں بادشاہ انھیں لکھنو آنے کی دعوت دے دیں۔ غالباً ان کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ نصیر الدین حیدر کی وفات (۱۲۴۳ھ) کے بعد سرور نے فسانہ عجائب پر نظر ثانی کی، متن میں اضافہ و ترمیم کی اور نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ شامل کیا اور دیباچہ میں کچھ اضافہ کیا اور خود ان کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ غالباً اس مرتبہ بھی سرور کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ سرور نے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ کے عہد میں بھی قسمت آزمائی کے لئے فسانہ کو پیش کیا یا نہیں لیکن یہ بات کہ بادشاہ چہارم امجد علی شاہ کے زمانے میں انھوں نے پھر اس فسانہ کو پیش کر کے اپنی قسمت آزمائی تھی، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غالباً تیسرے بادشاہ کے زمانے میں بھی انھوں نے یہی عمل کیا ہوگا۔ بادشاہ چہارم کے عہد میں سرور نے اپنے فسانے میں بہت اہم اضافے کئے۔ فسانہ عجائب میں ”بندر کی تقریر“ زندگی اور موت اور

۱۔ جب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۲۹

۲۔ ”عطر سہاگ“ ملک پری، ایجاد نصیر الدین حیدری ارگہ محمد شاہی ”فسانہ عجائب نو کشور“

جبر و اختیار جیسے مسائل پر سرور نے بڑی عالمانہ تقریر کی ہے۔ بے ثباتی دنیا پر سرور کا بیان قابل غور ہے :-

”انجام شاہ دگدا، دو گز کفن اور تختہ تابوت سے سوا نہیں،

کسی نے ادھی یا مہودی کا دیا یا بہ تحریر کہ بلا کسی کو گزی، گاڑھا، میسر ہوا،
بصد کرب و بلا، اس نے صندوق کا تختہ لگایا۔ اس نے بیر کے چلیوں میں چھپایا

کسی نے بعد مرگ سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مرمر کے گور گڑھا پایا،
کسی کا مزار مطلقاً منقش رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینہ جاہل گورنگ ہے،

حسرت دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرش خاک ہوا، نہ امیر سمور و
قائم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لاسکا۔ بعد چند سے

جب گردش چرخ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ کو بجایا تو ایک نے نہ بتایا
کہ دونوں میں یہ گور شاہ ہے، یہ لحد فقیر ہے۔ اس کو مرگ جوانی نصیب

ہوئی۔ یہ استخوان بوسیدہ پیر ہے، سو یہ بھی خوش نصیب ہے۔ نیک کمائی
والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں۔ نہیں تو سینکڑوں ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں۔

لوگ درگور چلے آتے ہیں۔ کتے بلی چیل، کوسے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے
ہیں۔ دامن دشت عریاں کفن گور بے چراغ، صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و

حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے روتا ہے، تنہا پھٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔
سالہا مقبروں کی عمارت غای اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریع الیر

رہے۔ ہزاروں ربخ، گور بے چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے، سہے،
طرفہ نقل ہے کہ والی وارث ان کے سر پر سلطنت، مسند حکومت پر شب و روز

جلوہ افروز رہے۔ مگر تنہیہ غفلوں کو قدرت حق سے گنبدوں میں آشیانہ زاغ
و زغن، میناروں پر مسکن بوم شوم، قبروں پر کتے لوٹتے دیکھے۔“ — الخ

بندر کی تقریر کا پورا حصہ غور سے پڑھنے کے بعد ”احوال محمد علی شاہ“ کا وہ
حصہ اگر پڑھا جائے جہاں محمد علی شاہ کے جنازے کے جلوس کا ذکر ہے۔ یہ بیان تقریباً

اسی لب و لہجہ میں ہے جس میں سرور نے بندر کی تقریر لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فسانہ عجائب
لے فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرور ص ۱۲۲۔ ص ۱۲۵

سے منقول نہ ہوگا بلکہ یہاں فسانہ عبرت میں لکھنے کے بعد سرور کو اپنے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنے کا خیال آیا کہ کیوں نہ اسے فسانہ عجائب جیسی شہرہ آفاق کتاب میں استعمال کیا جائے۔ یہ تقریر یوں بھی اس قصے میں کچھ اضافی سی معلوم ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقباس ملاحظہ فرمائیے۔

”طلسم خانہ عجیب جا، جو غبار طبع بار خاطر سمجھے، دل صفا منزل مکدر ہوئے وہی منزل اول میں ہزاروں من مٹی کے تلے سوئے، کبھی مالکِ تخت صاحب دیہیم و تاج ہو، طرفۃ العین میں زیرِ خاک فاتحے کا محتاج ہو۔ کبھی پہلو میں شیر، دست بستہ رو برد و ذریعہ، جڑاؤ چھپر کھٹ، مظلّا مسہری، بالیں قائم باش پر ہو کبھی یار نہ غم گسار، قبر تیرہ و تار، مسہری پھولوں کی اوپر، آپ خاک کے تلے، نشتِ لحد زیرِ سر ہو۔ جیتے جی لطفِ تخت و سریر ہے، تیز پلاس و حریر ہے۔ بعد مرگ جب گردشِ گنبد بے ستون نے مہقرہ ڈھایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو اتنا بھی کوئی بتانے کو نہ آیا کہ یہ صاحبِ تاج تھا، یا مفلح محتاج تھا اور اتنی تیز نہ کہ سکا کہ گورِ شاہ یا مزارِ فقیر ہے، مدفن نوجوان یا پیر ہے۔ دنیا میں گاہ صاحبِ نقارہ دکھ س ہے، کبھی یہ نوبت آئی کہ مبتلائے حسرت و افسوس ہے۔ تاج مرصع ٹیڑھے تاروں کے سبب جو کج رہتا تھا کجا، پُر ذر کلاہ کہاں — الخ“

اس کے علاوہ ”بیان لکھنؤ“ میں بادشاہ کی مدح بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حقیقت کو پیش کرنے کی دھن میں، ان کا قلم غیر شعوری طور پر ہجو ملیح کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ نصیر الدین حیدر کے بارے میں لکھتے ہیں:—

”عیش و نشاط کی طرف طبعیت جو آئی، ایک ایک ادنیٰ کنجھن، ہفت ہزار یوں سے اعلیٰ بنائی۔ محمد شاہ کی گور تھرائی۔ شہزادیوں کو کہا دیوں پر رشک آیا۔ خواہوں کو صاحبِ نوبت کیا، چند ڈول سکھیاں میں چڑھایا۔“

۱۰ فسانہ عبرت۔ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۱۳۵۶ھ۔

۱۱ فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور۔ نو لکھنؤ ۱۳۵۱ھ۔

”قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی۔ معارف دستان فلک ہفتم پر پہنچائی۔

کئی کروڑ روپے اس منظور نظر نے صرف کئے۔ خزانے خالی کر محتاجوں کے

گھر بھر دیئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔“

مذکورہ بالا بیان اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے ہمیں اس کی تحریر کی

تاریخ کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

محمد انصار اللہ نظر لکھتے ہیں :-

”قدسیہ محل کا عقد بادشاہ کی تخت نشینی کے تقریباً دو سال بعد ہوا“

اغلب ہے کہ ”خواصوں“ سے ان کی طرف اور ”کنجروں“ سے ملکہ زمانہ کی

طرف اشارہ ہو کیونکہ ملکہ زمانہ فی الاصل کسی ”کوری“ کی لڑکی تھیں (ہیگلیت

اور دھند) قیاس کیا جاتا ہے کہ ان دونوں کے حالات ان کے زوال بلکہ انتقال

کے بعد لکھے ہوں کیونکہ ان کے عروج و اقبال میں اس طور پر اشارہ کرنا بھی

قیاس کم تھا۔ ملکہ زمانہ کا انتقال ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ اور قدسیہ محل

کا ۱۲۵۰ھ میں ہوا۔ اس طرح بھی ان تحریروں کا زمانہ امجد علی شاہ کی بادشاہت

اور جان عالم کی دلی عہدی کا معلوم ہوتا ہے۔ فسانہ عجائب کے کچھ اور مندرجات

سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں

مثلاً محمد رضا برق کے مشاعرے کا تذکرہ ہے جو تقریباً ۱۲۵۰ھ یا اس کے

کچھ بعد کی بات ہے۔“

غرض ”فسانہ عجائب“ تقریباً ۱۹ سال تک بنیادی ترمیم و تنسیخ کی منزلوں سے گزرتی

رہی۔ یہاں تک امجد علی شاہ کے عہد میں سرور کی مراد برآئی اور ان کے فسانے کو چھپنا

نصیب ہوا، خود سرور کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے :-

”لہ الحمد والمنہ کہ نسخہ قصہ جان عالم شاہزادہ بہ زبان اردو مسمی بہ

فسانہ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بہ یک واسطہ

لہ فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور۔ نو لکھنؤ ص ۱۱

۲۵ نواب امین الدولہ مہر۔ محمد انصار اللہ نظر اردو ادب شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۶۶ء ص ۶

۳۵ منقول از نسخہ قلمی راقم سردار خاں، نقل مطبع حسنی اڈیشن۔

سلسلہ تلمذ راہ جہلات می رسانند در ماه جمادی الثانیہ روز شنبہ تاریخ
نہم ۱۲۵۹ھ در عہد دولت مہد امجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ
و سلطانہ در مطبع حسنی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت
لکھنؤ بمجلہ محمود نگر طبع نمود۔ قطعہ تاریخ از شیخ کرامت علی انظر سے
اس کتاب جان عالم چو حسن فرود طبع معنی نورا علی نورا زوی آمد در ظهور
خاتمہ انظر پئے تاریخ وقت انطباع ز در رقم از طبع باشد جان عالم پر سرور
انظر کے قطعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہی "فسانہ عجائب" کا پہلا
اڈیشن ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن اسی مطبع حسنی سے جب چھپا تو اس کے لئے
پھر شیخ کرامت علی انظر نے تاریخ لکھی
فرمود دو بار طبع در مطبع خود
بنوشت وقت انطباعش انظر
اس اڈیشن میں خاتمہ الطبع کے طور پر سرور نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی
ہے، جس پر سرور کی مہر بھی ثبت ہے۔

"لشدا الحمد والمہ کہ یہ فسانہ رنگین بھد زیب و تہذیب لسان قند

مکرر پسند خاطر سراپا قصور اعنی سرور کے پچھا اور جناب میر حسن صاحب نے
بفضل رب ذو المن کوئی احتیاط کا دقیقہ اٹھانہ رکھا اور ابتدا سے انتہا
تک نظر مولف سے گذرا۔ نسبت فسانہ سابق اکثر جاراقم نے محل اور موقع
جو پایا اس کو بڑھایا، ملاحظہ ناظرین پر تمکین میں جو آئے گا یقین ہے کہ

لہ جہاں تک شیخ کرامت علی انظر کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق طبقات الشعرا
ص ۲۹ پر درج ہے "انظر تخلص شیخ کرامت علی رہنے والا لکھنؤ کا ہے اس کا
حال اور ہم کو کچھ ظاہر نہیں ہوا مگر ایک قطعہ تاریخ فسانہ عجائب کا جو تصنیف مرزا
رجب علی سرور کا ہے، اس کی تاریخ طبع کی، جو اس نے لکھی ہے اس سے
معلوم ہوا کہ شاعر ہے۔"

۲۵ فسانہ عجائب مطبع حسنی ۱۲۶۳ھ ص ۲۰

۲۶ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۰

لطف دکھائے گا۔ یہ نسخہ اور بزرگوں نے بھی طبع کیا الا بطرز زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ کم و بیش ہو گیا جو فقرہ نہ پڑھا گیا وہ اپنے طور پر گڑھا گیا۔ اس نشیب و فراز کو امتیاز شرط ہے۔ لہذا پیاس خاطر جناب میر صاحب ممدوح کہ بندے کے محسن ہیں اور صفحہ دہر پر انتخاب ہیں۔ ہر ایک سے میرا سوال ہے کہ لا جواب ہے۔ اس کی صحت و غلطی میں بہت کد ہوئی کوشش از حد ہوئی اور جو بعض جا سہو بشریت سے ہوا اسکا صحیح نامہ لکھا۔ غرض کہ اس شغفانی سے اکبر علی خاں نے لکھا کہ گو خط سات ہیں ہفت قلم کا تبوں کو کہتے ہیں مگر اس کا حسن خط نو خطوں سے گوئی سبقت لے گیا دیکھنے والے حیران رہتے ہیں اگر زنگ حد طبیعت سے دور ہو تو آنکھ پڑتے ہی دل مسرور ہو، ہر سطر زلف مسلسل عنبریں مویاں ہے اور بن السطور سے صفائی عارض مہر ویاں جلوہ کناں ہے۔ ہر ایک صفحہ آئینہ حلب ہے صاف باطنوں سے داد طلب ہے دگر نہ بجمہوری یہ حرف زبان پر آجائے گا کہ جیسا منہ ہوگا ویسا نظر آئے گا۔ گواہ اس فقرے کی مہر فقیر ہے خدا شاہ ہے یہ مطبع بے نظیر ہے۔“

اس عبارت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فسانہ عجائب میر حسن کے مطبع ہی سے نہیں شایع ہوتی تھی بلکہ دوسرے مطبعوں سے بھی یہ کتاب چھپتی رہی تھی۔ چنانچہ مطبع حسنی کے دوسرے اڈیشن سے پہلے ۱۲۶۲ھ میں مطبع مصطفائی سے یہ کتاب چھپی مصنف نے اس کی بھی تصحیح کی اور اس میں بھی بعض اضافے کئے چنانچہ خاتمۃ الطبع کی عبارت میں ہے :-

”یہ فسانہ کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں۔ نظر آتا نہیں، کوئی پاتا نہیں۔“ بالفعل اس کے پھاپنے کا خیال دل صفا منزل میں جناب حاجی حرمین مولوی محمد حسین دام اللہ وصلہم کے آیا۔ انھوں نے مولف فسانہ سے تابع فرمان بہ دل و جان ہے، ارشاد کیا کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جائے خدشہ رہنے نہ پائے۔ حسب ارشاد

۱۰ فسانہ عجائب مطبع مصطفائی ۱۲۶۲ھ ۱۳۶۱-۱۳۶۲ (ڈاکٹر نیر مسعود نے اس کا سن

طباعت ۱۲۶۱ھ دیا ہے۔ مجھے یہ سو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ — اظہر پو دیند)

اس نجستہ نہاد کے نیاز مند قدیم نے کوشش عظیم سے جہاں موقع پایا کچھ بڑھایا۔ خوشنودی طبع کے بعد امید دار دعا ہوں کہ اب بد سر منزل آپہنچا ہوں، شائق اس کو جب پڑھیں گے، دنیا میں بڑھیں گے، کم نہ ہوں گے، یہ فسانہ رہ جائے گا اور چندے مگر ہم نہ ہوں گے۔ جس تکلف سے اب کی بار چھپا ایسا کبھی نہ تھا۔ فقط“

۱۲۶۲ھ میں ہی مطبع ”مرآۃ الاخبار“ کلکتہ سے منشی عنایت علی کے اہتمام سے نستعلیق طائپ میں طابع منشی محمد تقی، ناشر مرزا عنایت علی۔ بہ تصحیح مولوی محمد عبداللہ کالجی اور حافظ لکھنوی۔

اس درمیان میں ”فسانہ عجائب“ کا ایک خاص اڈیشن مطبع رفاہ عام دہلی سے منشی کریم الدین پانی پتی نے ۱۳- شوال ۱۲۶۱ھ میں شائع کیا۔ یہ پہلا دہلوی اڈیشن ہے اس اڈیشن کے بارے میں منشی کریم الدین، ”طبقات شعرائے ہند میں لکھتے ہیں۔

”ایک فقہ فسانہ عجائب زبان اردو میں اس کی تصنیف سے بہت مشہور ہے جو کہ دو دفعہ لکھنؤ میں چھپا اور ایک دفعہ میرے اہتمام سے دہلی درمیان مطبع بندہ کے ۱۲۶۱ھ میں چھپا۔“

لیکن اس کے چھپنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۶۷ھ ”مولوی محمد حسین کی فرمائش پر انھوں نے (رجب علی بیگ سرور) فسانہ عجائب پر نظر ثانی بھی کی ہے اور جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا ہے۔ یہ مطبع محمدی کانپور سے چھپا تھا۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :-

”فسانہ عجائب کا پہلا اڈیشن شایع ہونے کے بعد سے سرور گویا ”فسانہ عجائب“ کے درمیان سے غائب تھے۔ مطبع محمدی کے اڈیشن میں ہماری ملاقات پھر سرور سے ہوئی ہے۔ اس کا خاتمہ الطبع سرور نے خود لکھا ہے

۱۴ یہ نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۵ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۲۹

۱۶ فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ۔ مطبع محمدی کانپور۔

۱۷ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص ۱۳۵

اور یہ بتایا ہے کہ محمد حسین کی فرمائش پر انھوں نے 'فسانہ عجائب' پر
نظر ثانی کی ہے اور جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا ہے۔ سرور کی ان تبدیلیوں
اور اضافہ کی وجہ سے فسانہ عجائب کا یہ اڈیشن دوسرے اڈیشنوں سے
قدرے مختلف ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود کے اس بیان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے ۱۲۵۹ھ
سے ۱۲۶۷ھ تک "فسانہ عجائب" پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ حالانکہ خود مطبع میر حسن سے جو
دوسرا اڈیشن ۱۲۶۳ھ میں اور ۱۲۶۲ھ میں مطبع مصطفائی سے جو اڈیشن چھپے، ان پر
بھی سرور کی تحریر کردہ عبارت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظر ثانی کی۔
اس کا ذکر اور تفصیل سے ابھی چکا ہے۔

فسانہ عجائب کے پچھلے نسخوں میں کچھ نمایاں فرق نہ تھا سوائے دیباچے کے جس
میں سرور ہر بار کوئی نمایاں تبدیلی کر دیتے تھے۔ اس نسخے میں غیر معمولی تبدیلیاں ہیں۔
شاید ہی کوئی جملہ ہو جس کو سرور نے جوں کا توں رہنے دیا ہو۔ یہاں تک کہ عنوانات میں
بھی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں تک دیباچے کا تعلق ہے اس میں بھی زیادہ ترمیم و
تسحیح ہے۔ "بیان لکھنؤ" کے لئے مندرجہ ذیل عنوان ہے۔

"تقریر مورخ دل پذیر کیفیت شہر اور ذی کمال بے مثال ہر علم و فن

کے کچھ اہل حرفہ دکاندار یا دگوار۔"

اس میں فقروں کی تبدیلی کے علاوہ ایک نمایاں تبدیلی اور بھی ہے۔ عام طور
پر اس کے دوسرے نسخوں میں جب لکھنؤ کے مطبعوں کا ذکر کیا گیا ہے تو مطبع میر حسن
کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ لیکن اس نسخے میں مطبعوں کا ذکر سرے سے نہیں ہے اور
لکھنؤ کے بارے میں دعائیہ اشعار کے بعد اکدم سے اپنے استاد محترم کا ذکر کرنے کے
بعد اس کو ختم کر دیتے ہیں۔

۱۲۷۱ھ میں "فسانہ عجائب" کا ایک اڈیشن بسعی مولوی فضل حسین عرف

محمد فیض لکھنوی متخلص فضل، مطبع جناد اس اور بلد یو سہائے چھپی۔ اس کا قطعہ
تاریخ فضل حسین نے لکھا ہے۔

ہر اک کہانی ہے دل لگی کی ہر ایک قصہ ہے ایک دفتر
 بہ وقت چھاپہ یہ دل میں آیا لکھوں میں سالِ مسیح کو بھی
 سر جمال جیل سے لی سنِ مسیحی تو فضلِ خوش تر
 یہی حکایت ہے جانِ عالم جہاں میں شہرہ مچا ہے گھر گھر
 اس کے ساتھ ہی محمد عبد البصیر متخلص بہ حضور بلگرامی کا قطعہ بھی شامل ہے جس میں
 آخری مصرعہ سرورِ سینہ عشاق جانِ عالم باد (۱۲۷۱ھ)
 اس کے خاتمے پر مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

’خاتمہ طبع طبع زاد مصنف کتاب ہے، اس کا بھی ایک فقرہ لا جواب
 ہے، بہ مثل زبان زد خاص و عام ہے، محقق کا کلام ہے کہ قبولِ خاطر و لطفِ سخن
 داد ہے۔ چنانچہ فسانہ عجائب کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں
 نظر آتا نہیں کوئی پاتا نہیں۔ کس قصے کو اس سے ہمہری ہے۔ اس کی نتائج تک
 قدر دانوں کے سینے میں بھری ہے۔ یہ فقط عنایتِ پروردگار ہے۔ اس کا رشک
 حسد بیکار ہے۔ بالفعل اس کے چھاپنے کا خیال دل صفا منزل میں لالہ جنناد اس
 دام اللہ فضالہم کے آیا۔ بسکہ لالہ صاحب موصوف یصفات پسندیدہ معروض
 ہیں۔ تحریر فقیر اس مقدمے میں بیکار ہے۔ کاشمیں نصف النہار عالم آشکار ہے
 جو کتاب اس کا رخانے کی ہے، انتخاب ہے۔ کار پر داز ہوشیار کار فرما لا جواب
 جو جو سرگرم کاروبار ہیں۔ انہوں نے مولف فسانہ سے کہ تابع فرمان بدل و
 جان ہے ارشاد کیا کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جاتے،
 خدشہ رہنے نہ پائے۔ جب ارشاد اس خجستہ نہاد کے نیاز مند قدیم نے
 کوششِ عظیم سے ملاحظہ کر کے جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا۔ یقین کامل ہے کہ
 اب جس کی نظر سے یہ گذر جائے گا تازہ لطف نظر آئے گا۔ اگر چاہا، دل کو جو
 لگایا ہے۔ تازہ فقرہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقات کو بے کار نہیں کھویا ہے در شہوار

۱۰ فسانہ عجائب۔ مطبع لالہ جنناد اس۔ کانپور ۱۲۷۱ھ ص ۱۳۷

۱۱ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۳۷

۱۲ ایضاً ایضاً ایضاً اشاعت ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء

سلک تقریر میں پردیا ہے منصفوں سے داد طلب ہوں
 کہ کیا کیا خون دل پایا، لخت جگر کھایا ہے
 جب اس طرح کا مضمون ہاتھ آیا ہے۔ دو
 فقرے پسندیدہ لکھنا دشوار ہے۔ یہ تو ایک قصہ
 طول بڑا طومار ہے۔ خوشنودی طبع کے بعد امیدوار
 دعا ہوں کہ اب برسر منزل آہنچا ہوں، شائق اس کو
 جب پڑھیں گے دنیا میں — کم نہ ہوں گے۔ جس تکلف سے اب کی
 بار چھپا، ایسا کبھی نہ تھا جس طرح سے یہ مشہور ہوا سرور
 کو سرور ہوا فقط“

اس اڈیشن کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض اس اڈیشن کی نقل
 ہے جو ۱۲۶۷ھ میں حاجی حرمین شریفین محمد حسین کے مطبع محمدی میں شائع ہوا تھا۔
 اس میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ اس کے خاتمۃ الطبع کی عبارت میں جہاں حاجی حرمین
 محمد حسین کا ذکر ہے وہاں پر لالہ جنناداس کا نام لکھ دیا ہے۔ اسی طرح تمت کی عبارت
 بھی وہی ہے۔ گویا یہ نسخہ ۱۲۶۷ھ کے نسخے کی ہو ہو نقل ہے۔ اس میں سرور نے کوئی
 ترمیم تفسیح نہیں کی۔

اب دو نسخوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک نسخہ وہ جو کانپور سے مطبع
 افضل المطابع محمدی سے مولوی محمد یعقوب انصاری نے شائع کیا۔ یہ نسخہ ۱۲۷۶ھ میں چھپا
 اور اس کی کتابت و طباعت بڑی اعلیٰ درجے کی ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ آفرط یا بلاک
 سے چھاپی گئی ہے۔ اس کا خاتمۃ الطبع بھی سرور نے بطور خاص لکھا ہے :-

”فسانہ عجائب کہ اسم بامسمیٰ اور لا جواب ہے۔ کتب خانہ کائنات میں انتخاب

ہے۔ دوستوں کی تحریک سے باوجود مکروہات زمانہ ناہنجار اور فکر معاش کے انتشار

میں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کانپور میں چھاپا اور

مصنف سے نظر ثانی کو ارشاد فرمایا۔ وہ ان کا حکم بجا لانا موجب مسرت جانتا

ہے پھر اس کی دیکھا بھالی ہوئی صرف نازک خیالی ہوئی۔ یہ فقط کارخانہ قدرت

ہے عقل اس میں عاری ہے۔ برسوں سے اس کے چھینے کا دور تسلسل جاری ہے۔ دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرطِ فرصت نیا کر دینے کا آمادہ ہے۔

مولوی محمد یعقوب انصاری فرنگی محل کے رہنے والے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کے خاص دوستوں میں سے تھے اور سرور نے اپنے بیٹے کے خطوط میں متعدد بار ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ ایک اجبارِ طلسم بھی نکالتے تھے۔ "بلکہ اس دور کے مقفیٰ اور مسیح عبارت آرائی کے بھی مرد میدان تھے۔ واجدی عہد میں سرور کی رنگینی بیان لکھنؤ کی روزمرہ بول چال میں بھی داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اگر انقلاب ۱۸۵۷ء نہ ہو گیا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ یہ رنگ عرصے تک لکھنؤ کے مزاج پر غالب رہتا۔ اس مخصوص طرز انشا کے لکھنے والوں میں مولوی محمد یعقوب کا تیسرا درجہ تھا۔"

مولوی محمد یعقوب انصاری کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔

سرور کو مولوی محمد یعقوب انصاری سے خصوصی تعلق تھا۔ اس کا اندازہ خاتمۃ المطبع کی عبارت سے بھی ہوتا ہے اور اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ بیان لکھنؤ میں سرور نے مطبع میر حسن کے ذکر کے بجائے مولوی صاحب کے مطبع کا ذکر کیا ہے :-

"مطبع اس شہر میں اکثر رنگ کے ہیں۔ نمونے نیرنگ کے ہیں۔ مگر ہمارے

شفیق دھربان یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب

مدظلہ عزیز دہا ہمہ صفت موصوف ہیں۔ دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابق

اذیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا۔"

سرور نے بڑے ذوق و شوق سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نسخے سے یہ بھی معلوم ہوتا

ہے کہ یہ جب چھپا تو سرور بنارس میں تھے اور اس پر نظر ثانی کا کام بھی وہیں ہوا۔ یہ نسخہ

غیر معمولی محنت سے تیار کیا گیا اس میں مولوی محمد یعقوب انصاری کی دلچسپی اور اصرار کو

بے حد دخل تھا۔ سرور لکھتے ہیں :-

۱۷ "انیسویں صدی میں لکھنؤ کی اردو صحافت از نادیم سیٹاپوری مطبوعہ نیا دور۔ لکھنؤ ص ۱۱

۱۸ فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع ص ۱۱

”دفعۃً فلک نے یہ چکر کھایا حوت غلط کی طرح رگڑ کر شہر کو مٹایا۔
 پردوں سے نبات الغش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر نہ کسی کی
 خبر پائی۔ فقیر حسب اطلب مہاراج ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر راج بنارس
 دام حشمت بنارس میں آیا۔ شکر صد شکر کہ رئیس دالاجاہ رعیت پناہ عزیز نواز
 غزبا پرور، باریک بین، قدر شناس، سخی شجاع سخن فہم عدل گسریا یا۔ دریغ والا
 دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغل پارینہ منظور ہوا۔ پہلے عزم فسانہ
 سرور ہوا۔ اس کی صحت کی خاطر بندہ کو لکھا بحر اقرار چارہ نہوا انکار گوارا
 نہ ہوا۔ ہر چند یہ فسانہ بطرز زمانہ ہر ایک چھاپہ خانہ میں نیا نیا رنگ لایا جس
 نے چاہا، جس فقرے پر پانی پھیرا، صفحہ کتاب سے بہایا۔ بقول فقیر جو مضمون
 سمجھ میں آیا یا نہ پڑھا گیا وہ کُند بسولے سے گڑھا گیا، جودت قلم نثاروں
 کی ہوئی، اصلاح خط یاروں کی ہوئی۔ فقیر نے اس کے دیکھنے میں عرق ریزی
 از حد کی، حضرت کے خوف سے انتہا کی کد کی، جس جگہ محل اور موقع پایا ہے کیا کیا
 جملہ بڑھاپے میں بڑھایا ہے۔ ایسی متاعِ گراں بہا کس گنجینے میں ہے، جس کی
 جگہ ذی فہم قدر شناسوں کے سینے میں ہے۔“

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرور اس کی طباعت سے مطمئن نہ تھے اور یہ
 کتاب فی الواقع ایسی ہی چھپی جیسی کہ انھیں توقع تھی۔

ایک دوسرا نسخہ وہ ہے جو اس کے تین سال بعد مطبع احمدی شاہدہ دہلی ضلع
 میرٹھ سے محمد حسین صاحب مہتمم سابق مطبع مصطفائی دہلی نے ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ کو
 شایع کیا۔ یہ ایڈیشن بھی بے حد احتیاط سے چھپا ہے۔ اس کا خاتمۃ الطبع محمد حسین خاں
 نے خود لکھا ہے :-

”شکر خدا کا کہ داستان دلکش تیسری بار چھپ کر اختتام کو پہنچی —

نہایت زیب و زینت سے انجام کو پہنچی۔ حسن صورت آشکار ہے ہمیں اس میں
 مبالغہ بیکار ہے۔ صفحہ، صفحہ آئینہ سے دیکھ لیا چاہئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا

چاہئے۔ پہلے نقل اس نسخہ مطبوع سے لی ہے جس پر مصنف نے اپنی مر
کی ہے۔ پھر ان کے دستخطی نسخے سے مقابلہ کیا۔ ہر چند یہ کتاب جا بجا کمرہ چھپی
مگر اس تہذیب کے ساتھ کم تر چھپی — غرض حسن صورت و معنی ایسا پسند
ہوا کہ ایک زمانہ اس کا خواہش مند ہوا۔ اس کثرت سے خریداری ہوئی کہ تین بار
شہر لکھنؤ میں چھپ کر دوبارہ صفحہ بصفحہ سطر بستر مطبوعہ لکھنؤ سے نقل کر کے مطبع
احمدی کے کہ شاہ درہ دہلوانی ضلع میرٹھ میں واقع ہے، ساتھ اہتمام من ایچ پڈا
کچ مچ زبان امید دار مغفرت یزدان — یہ شاید معنی زیور طبع محلی ہو کر منظور
طابع شایقین ہوا۔“

اس نسخے میں مطبعوں کے ذکر میں پھر مطبع میر حسن کا ذکر ملتا ہے۔
میں نے اپنے نسخے کی بنیاد ان دو نسخوں پر رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان سے
بہتر نسخے ہیں بھی نہیں۔ مطبع احمدی کا نسخہ سرور کے انتقال سے چھ سال پہلے چھپا۔
اس کے بعد ہمیں ایک اہم اڈیشن اور ملتا ہے۔ یہ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء کا چھپا ہے۔
اس اڈیشن کو گورنمنٹ ہند صیغہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے حکم سے باہتمام میجر ڈبلیو ناسولیس
صاحب بہادر، سکریٹری بورڈ آف انکزامینرز، کالج پریس، کلکتہ، سے ٹائپ میں چھپایا۔ اس
سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اسے نصاب میں شامل کیا۔ اس کے ٹائٹل پر لکھا
ہے کہ ”صاحبان عالیشان کی ڈگری کے امتحان کے لئے مقرر ہے۔“
یہ اڈیشن بہت صاف ستھرا ہے اور اس کی تصحیح بھی بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔
ایک ٹائٹل انگریزی میں بھی ہے، جس میں لکھا ہے ”A new and revised
edition“ — گمان غالب کہ یہ اڈیشن سرور کی زندگی میں ہی چھپا تھا لیکن اس میں
خاتمۃ الطبع کی عبارت نہ ہونے کی وجہ سے مزید تفصیل نہیں معلوم ہوتی۔
اس اڈیشن سے کئی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :-

۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں منشی نوکشور نے سرور سے فسانہ عجائب کا
حق تالیف خرید کر رجسٹری کرایا۔ ۱۸۶۷ء میں فسانہ عجائب کا نوکشوری اڈیشن

۱۵ فسانہ عجائب مطبع احمدی ص ۱۵

بڑی آب و تاب اور خاص اہتمام سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر نیر نے اس ضمن میں ایک غیر قانونی اڈیشن کا ذکر کیا ہے جو دکن پریس لاہور سے میاں چراغ دین اور میاں سراج الدین نے شائع کیا۔ وہ لکھتے ہیں :-

”مطبوعہ نو لکھنؤ نے ”فسانہ عجائب“ کے نسخوں سے بازار کو بھر کر رکھا تھا۔ لیکن ”فسانہ عجائب“ کے کاپی رائٹ کی مدت (پچاس سال) ختم ہونے کے

بعد دوسرے ناشروں نے بھی آزادانہ اس کتاب کو چھاپنا شروع کر دیا۔“

ڈاکٹر نیر مسعود کی نظر سے غالباً یہ کالج پریس۔ کلکتہ کا ایڈیشن نہیں گزرا۔ جو واضح طور پر

۱۸۶۸ء کا چھپا ہوا ہے یعنی معاہدہ نو لکھنؤ سے ایک سال بعد۔ اس کے غیر قانونی

ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انگریزی ٹائٹل کے مطابق ”Published

under the orders of the Govt. of India in the Home

Deptt“ ہے۔

اس سے یہ قیاس آرائی بھی کی جاسکتی ہے کہ نو لکھنؤ سے معاملہ ہونے سے پہلے ہی

سرور نے کالج پریس کو اس اڈیشن کی اجازت دے دی تھی۔ چونکہ اس کا مقصد محدود تھا اس لئے منشی نو لکھنؤ کو اعتراض بھی نہ ہوا۔

یہ نسخہ بہت اچھا چھپا ہے لیکن یہ طلباء کے لئے تیار کیا گیا ہے اس لئے اس میں

کچھ جملے جو وصل سے متعلق ہیں، حذف کر دیئے گئے ہیں۔ باقی اور کوئی نمایاں تبدیلی نہیں

ہے جو اور دوسرے ایڈیشنوں میں نہ ہو۔

اس کے بعد تو ”فسانہ عجائب“ نو لکھنؤ دور میں داخل ہوئی اور پھر برس ہا برس

نو لکھنؤ پریس سے چھپتی رہی اور اس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ نو لکھنؤ نے ایک جدت

یہ کی کہ اس کے مصور اڈیشن بھی چھاپے۔ ایک مصور اڈیشن پر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے

تقریباً بھی لکھی۔ اس وقت جو نو لکھنؤ ری اڈیشن بازار میں ملتا ہے اس میں بھی تصویریں

ہیں۔ بعض تصویریں بہت اچھی ہیں لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان تصویروں کے بنانے

میں نو لکھنؤ پریس کے خوشنویسوں ہی کا ہاتھ ہے۔ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ کا جو اڈیشن ہے

۱۳۶۶ھ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۳۶

۱۳۷۵ھ ایضاً ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۳۷

اس کی کتاب شیخ امیر اللہ تسلیم نے کی اور اس اڈیشن کا قطعہ بھی لکھا جس کا آخری مصرعہ ہے - ع

چھپا کیا بے مثال افسانہ عشق

جیسا کہ ان مختلف نسخوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے اپنی اس اہم کتاب پر بار بار نظر ثانی کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تصحیح سے خود مطمئن نہیں ہوئے اور خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں لگے رہے یہاں تک کہ نظر ثانی کرنے کے بعد پھر اس کو ٹھیک کرنے کا خیال رکھتے تھے جیسا کہ افضل المطالع کے اڈیشن سے معلوم ہوتا ہے -

”دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرط فرصت نیا کر دینے کا آمادہ ہے۔“

تاہم جب ہم بہ نظر غور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے متن قصے میں بھی کچھ تبدیلیاں کی ہیں - خیال یہ ہے کہ پسر محبت کا قصہ عہد نصیر الدین حیدر میں لکھ کر شامل کیا ہوگا - لکھنؤ میں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں انگریزوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا، خیال ہے کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے غیر شعوری طور پر سرور کو متاثر کیا ہو، اس کے علاوہ انجن آرا کے جہیز کے سامان میں ”عطر سہاگ“، ”مہک پری“، ”ایجاد نصیر الدین حیدری“، ”گجہ محمد شاہی“ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس کا اضافہ عہد نصیر الدین حیدر میں کیا گیا ہوگا - یہ اضافہ ایک آدھ جگہ اور بھی محسوس ہوتا ہے - سرور نے بندر کی تقریر میں زندگی اور موت کے فلسفے پر جو نثر لکھی ہے اس نثر سے بہت ملتی جلتی ہے جو محمد علی شاہ کے جنازے کے موقع پر ”احوال محمد علی شاہ“ میں ’فسانہ عبرت‘ میں لکھی ہے - اس سلسلے میں گزشتہ اوراق میں بحث کی جا چکی ہے - متن قصے کے علاوہ سرور نے فقرہوں اور ترکیبوں میں بھی تبدیلیاں کی ہیں - ”بیان لکھنؤ“ میں یہ تبدیلیاں بہت نمایاں ہیں - میری نظر سے ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ گذرا ہے - افسوس کہ اس پر نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ سن تحریر موجود ہے، جس سے اس نسخے کے بارے میں زیادہ معلومات

۱۷ فسانہ عجائب نو لکچر - ۱۲ واں اڈیشن ۲۲۲

۱۷ افضل المطالع ۱۲۷۷ھ ص ۱۳

حاصل ہو سکیں۔ یہ نسخہ کبھی کسی مرتضیٰ حسین صاحب کی ملکیت تھا جس پر ان کی دستخط ہے اور یہ مرتضیٰ حسین روڈ لکھنؤ درج ہے۔ اب یہ نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس نسخے میں بعض قابل توجہ تبدیلیاں ہیں۔ میں نے اسے اپنے نسخے میں شامل کیا ہے۔ اس میں تقریباً پانچ چھ صفحے زیادہ ہیں جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتے۔ اس میں لکھنؤ کا ذکر ذرا تفصیل سے ہے لیکن چونکہ بقول خود سرور ”بسکہ خامہ مولف اختصار رقم ہے“ اس حصے کو بعد کے نسخوں سے نکال دیا۔ یہ صفحات لکھنؤ کے بارے میں مزید روشنی ڈالتے ہیں اس لئے میں نے اسے خاص طور پر شامل کر دیا ہے۔

بیان لکھنؤ کی تحریک کے سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود کا خیال ہے کہ :
 ”سرور کے ذہن میں لکھنؤ کا حال لکھنے کا خیال پیدا کرنے کے ذمہ دار بظاہر میر حسین عطا خان تھیں۔ تحقین نے ”نوطرہ مرصع“ کے دیباچے میں اپنے دارالسلطنت اودھ فیض آباد کا تعریفی بیان کیا ہے۔ یہ بیان اگرچہ مختصر ہے اور اس میں محض عبارت آرائی کی گئی ہے لیکن سرور کے ”بیان لکھنؤ“ کی تحریک غالباً اسی سے ہوئی۔ تحقین اور سرور کے بیانات کی ابتدا میں ہلکی سی مماثلت بھی ملتی ہے۔ تحقین لکھتے ہیں :-

”بھان اللہ! ہر صفحہ اس صحیفہ فیض کا — ایک گلشن ہے — اور

ہر کوچہ — اس کا علیحدہ علیحدہ ایک گلبن ہے“

سرور لکھتے ہیں :-

”بھان اللہ و بچہ! عجیب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی کوچہ دلچپ باغ و

بہار ہے“

”تحقین کے علاوہ سرور میر حسن سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں“

لیکن مجھے یہ دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ محض چند جملوں کی مماثلت بہت اہم نہیں۔ معاملہ غالباً یہ تھا کہ سرور شاہی ملازمت حاصل کر کے لکھنؤ آنا چاہتے تھے تاکہ وقت اور اعزاز زیادہ ہو اور وہ حاسدین پر غالب آسکیں اس لئے انھوں نے بادشاہ اور اس کے مستقر کی مدح سرائی کی — غازی الدین حیدر نے دہلی کے

بادشاہ سے علیحدگی اختیار کر کے بادشاہت کا اعلان کیا۔ اہل لکھنؤ نے زندگی کے کم و بیش ہر شعبے میں آزادی اختیار کی تھی۔ چنانچہ سرور نے بھی لکھنؤ کی تعریف اور کانپور کی عزت کی (کانپور انگریزی عملداری میں تھا) ناسخ نے بھی لکھنؤ کی تعریف کی ہے۔ ناسخ کے شاگردوں میں آغا علی خاں مہر نے بھی بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر غزلوں میں دہلی اور اصفہان کی مذمت اور لکھنؤ کی تعریف کی ہے۔ یہ جذبہ اہل لکھنؤ میں اس وقت بھی موجود تھا اور اب بھی ہے۔

سرور نے جو غزل لکھنؤ پر لکھی ہے اس میں بادشاہ وقت کی مدح بھی سموی ہوئی ہے اور لکھنؤ جانے کا جذبہ بہ شدت تمام منطوم ہے۔

رشتک کھا کھا گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ تب میں جاؤں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ
یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کو چہ ہائے لکھنؤ
سرور لکھنؤ کی تہذیب سے ہر طرح متاثر تھے۔ انھیں لکھنؤ نے محبت بھی دی تھی اور سزا بھی دی۔ یہ سزائوں کے لئے اور بھی زیادہ اس لئے تھی کہ وہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ اپنی دولت لٹا رہا تھا لیکن سرور کے حصے میں اس دولت کے پھول نہیں کانٹے ہی آئے۔ اس لئے انھیں قلق بھی زیادہ ہے۔ اس کے بعد جب وہ واپس آئے تو لکھنؤ کی یہ چاندنی چند روزہ تھی۔ ۶۱۸۵۶ میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی، بادشاہ معزول ہو گئے اور پھر ۱۲۷۳/۶۱۸۵۷ میں غدر کی تباہی آئی۔ سرور پریشان حال رہے اور ۶۱۸۵۹ مہاراجہ بنارس کی دعوت پر بنارس چلے گئے۔ بنارس سے انھوں نے اپنے بیٹے کے نام متعدد خطوط لکھے جو انشائے سرور کے نام سے بعد میں چھپے لیکن ان میں لکھنؤ کا ذکر کسی خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

سرور حقیقت پسند ہیں۔ وہ مبالغہ کے اسی حد تک قائل ہیں جتنا ادب کے لئے ضروری ہے۔ ان کا دیباچہ دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ جو روایتی طریقے سے حمد، نعت، منقبت اور بادشاہ وقت کی مدح پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو بیان لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہے۔

سرور نے اپنے حمد کے مزاج کو اپنی شخصیت میں سمو لیا تھا اور انھوں نے ان انشائے سرور کی اشاعت مرزا حبیب علی بیگ سرور کے انتقال کے بعد مطبع نو لکھنؤ ہوئی اس کی ان کے صاحبزادے احمد علی نے ترتیب دیا۔ سن طباعت ۱۲۹۷/۶۱۸۸۲

تمام روایات کو برقرار رکھا جسے اُن کے عہد نے سینے سے لگایا تھا۔ بادشاہِ وقت کی مدح بھی ایک جانب روایت کی تائید میں اور دوسری جانب اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد میں لکھی گئی ہے۔ سرورِ خود دار تھے۔ وہ خود بھی لکھتے ہیں:-
 ”تین دن میں یہ خط لکھا ہے۔ طبیعت کیا کیا رکتی ہے، مگر جھک گئی مگر گردن نہیں جھکتی ہے۔“

فسانہ عجائب

ایک تنقیدی مطالعہ

”فسانہ عجائب“ اردو کی اہم ترین داستانوں میں سے ہے اور اس کا شمار انیسویں صدی کی ان کتابوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنے زمانے کے ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ یہ اپنے عہد کی ان چند کتابوں میں گنی جاتی ہے جنہیں آج بھی اردو داں طبقہ نقادوں کی رایوں سے متاثر ہوئے بغیر بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فسانہ عجائب کے بغیر اردو نشر کا مطالعہ نامکمل ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

ادب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں اپنے عہد کی روح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم عہد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ہر عہد اپنے ماضی کی بنیادوں پر کھڑا رہتا ہے اور یہ ماضی دکھائی نہیں دیتا، لیکن بنیادیں بھی تو دکھائی نہیں دیتیں۔ ماضی حال میں اس طرح گھل مل جاتا ہے جیسے دو دریاؤں کے پانی سنگم پر آکر ایسے بہتے ہیں کہ ان کا فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زمانہ حال اس لحاظ سے دلچسپ ہوتا ہے جہاں اس کی آغوش میں ماضی ہوتا ہے وہاں اس کے بطن میں مستقبل پرورش پاتا ہے۔ گویا ہر حال اپنی جگہ پر ایک اکائی ہوتے ہوئے بھی ماضی اور مستقبل کے

سروں کو جوڑتا ہے۔

رجب علی بیگ کا قصہ جان عالم اور انجن اراکا — اپنے عہد کی روح کو بڑی کامیابی سے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں ہمیں داستان، قصہ اور ناول کا ایک امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ اس عہد کی تصنیف ہے، جب صدیوں کے ہندستانی سماج میں اُتھل پُٹھل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہم ادب میں داستانوں کے دور سے آگے بڑھ چکے تھے، لیکن داستانیں ہمارا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ روپ بدل بدل کر ہمیں لبھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ داستانوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اس کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ یہ مافوق الفطرت عناصر سے آراستہ ہوتی ہے لیکن اپنے عہد کی معاشرت اور اس کی روح کی غماز بھی۔ آپ داستانوں کے آئینہ خانے میں ماضی کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو انسانیت کے بچپن کی کلکاریاں نظر آئیں گی۔ ممتاز حسین نے صحیح لکھا ہے :-

”داستانوں سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس کچھ زیادہ بڑھی ہے کیونکہ اب ہم داستانوں کی جذباتی اور داخلی گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ آج ان کا تجزیہ ہم خارجی انداز سے کرنے پر قادر ہیں۔“

داستانیں ایک ایسے عہد کی پیداوار ہیں جو فطری عہد کی کشش بھی رکھتا ہے۔ یہ جاگیرداری تمدن کی روایات کو ادب اور تہذیب کی شکل میں محفوظ بھی رکھنا چاہتا تھا۔ یہاں خواب و خیال کی دنیا بھی تھی، اور انسانی تخیل کی اڑان بھی، جو کبھی ستاروں کو چھو لینا چاہتا تھا تو کبھی پاتال پر بھی اپنے نقش قدم چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ انسانی تہذیب کے اوائل کے تجربے کی بہترین مثال ہے۔ انسان اپنے تخیل کی بنا پر بڑی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے وہاں تک پرواز کرنا چاہتا ہے، جہاں خود اس کے پر جلتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کو تصویروں میں ڈھال لیتا ہے اور زندگی میں جو کچھ حاصل نہیں کر سکتا، انہیں خواب و خیال کی دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے خوابوں کی نفسیات کے جواز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ آرزوئیں جنہیں ہم دن کی روشنی میں حاصل نہیں کر سکتے، انہیں خوابوں کے دھندلکے میں حاصل کرتے ہیں۔ گویا انسان اپنے مقاصد کے حصول میں کسی طرح مایوس نہ دیا چہ باغ و بہار سے اقتباس۔

نہیں ہوتا۔ وہ اگر اپنی ناتوانی کی بناء پر دشمن پر قابو نہیں پاسکتا تو پھر کسی درویش کی لوح یا حضرت سلیمان کے تعویذ یا کسی رشی کا بتایا ہوا عمل اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی لئے ہمیں داستانوں کو پرکھتے ہوئے حقیقت پسندی اور صداقت کے نئے معیاروں کو نظر انداز کرنا ہوگا بلکہ یہ سمجھنا ہوگا کہ داستان زندگی کے ارتقا کا استعارہ ہے۔ یہاں زندگی کا راز امید پر ہے نہ کہ ناامیدی پر۔ اس کا انجام ارتقاء کے اصولوں کی طرح ہمیشہ رجائی ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی شکست نہیں ہوتی۔ یہاں انسان ہارتا نہیں، ورنہ اس کے خواب چکنا چور ہو جاتیں۔ یہاں اگر وہ بندر بھی بن جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی شکل مل جاتی ہے۔ اگر وہ مارا جاتا ہے تو ایک نئی جدوجہد کر کے اس کا سر دوبارہ جوڑ لیا جاتا ہے۔ وہ بوٹیاں تلاش کی جاتی ہیں جو اسے نئی زندگی عطا کریں۔ کبھی انسانوں کی غلطی سے یہ سر غلط جوڑ جاتے ہیں لیکن داستان لکھنے والا غیر انسانوں سے انسانوں کا مذاق نہیں اڑوانا چاہتا، اس لئے اس سر کو دوبارہ کاٹ کر جوڑ لیا جاتا ہے اور پھر یہ انسان اپنے دشمنوں پر فتح پاتا ہے۔ کوئی داستان المیہ پر ختم نہیں ہوتی۔

داستانوں میں وہ معصومیت ہوتی ہے جو ابتدائی انسان کا خاصہ تھیں۔ یہاں زندگی دو خانوں میں بنٹی ہوئی ہے، نیک و بد میں۔ ہماری موجودہ تہذیب اس طرح دو خانوں میں نہیں بانٹی جاسکتی۔ داستان کا ہیرد ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جہاں اسے نہ روٹی کا مسئلہ پریشان کرتا ہے اور نہ اس کے ذمے کوئی فرائض ہیں۔ اور بقول مار جوری بولتیں وہ زخم سے چور چور ہو کر مر سکتا ہے لیکن کوئی بیماری اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ داستانوں میں ہمیشہ بڑے بڑے واقعات ہی پیش آتے ہیں۔

جس دور نے داستانوں کو جنم دیا، انھیں پر دان چڑھایا، وہ دور جب ختم ہونے لگا تو اس وقت انسان کی فطرت کے سامنے مجبوری ختم ہو چکی تھی اور مخلوقات میں اس کی حیثیت کسی غیر اہم مخلوق کی سی نہ تھی بلکہ وہ ان معنوں میں اثرات مخلوقات تھا کہ اس نے اپنے بل بوتے پر نہ صرف یہ کہ ماضی طریقے اختیار کر لئے تھے موسموں کے سامنے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا تھا بلکہ اس نے اپنی ضروریات زندگی سے آگے بڑھ کر اپنی آسائش کے وسیلے تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے اور اس کی حیرت میں بھی کمی ہو چکی تھی جو تہذیب کے بچپن کی علامت تھی۔ داستانیں انسانوں کے سینے کے اندر نہیں اترتیں،

دہاں داخلی اور باطنی دنیا کی پیچیدگی نہیں، خارجی دنیا کے صاف و شفاف مناظر میں جنہیں تخیل کی مدد سے مبالغے کی صورت دی گئی ہے۔ ناول میں زندگی کی حقیقی تصویریں اپنی بدلی ہوئی شکل میں ملتی ہیں۔ یہاں آپ کو جو کردار نظر آتے ہیں وہ بڑے عظیم الشان ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں عظمت اور صلابت ہوتی ہے لیکن ذہن کا عنصر نہیں ملتا۔

داستانوں میں احساسِ عزت اس بات میں ہے کہ جنگ و جدل برپا کیا جائے۔ بات بات پر تلواریں سونت لی جائیں۔ بہادری اس میں ہے کہ ہر چیلنج کو قبول کر لیا جائے۔ یہاں موت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے گویا اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں محبت اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس کا کوئی انعام ملے گا بلکہ اس کے لئے کہ محبت اپنا انجام خود ہے اور اصل محبت وہ ہے جس کے لئے تکلیفیں اٹھائی جائیں، جہاں محبت کے لئے ناممکن کو ممکن کر دیا جائے۔ داستان کو عقیدے کے اعتبار سے عینیت پرست یا آدرش وادی ہوتا ہے۔

ہمارے عہد کے ناولوں میں زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے۔ ناول کے لئے زندگی کی ترجمانی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں اگر زندگی سے کوئی انحراف ہے تو صرف اتنا کہ زندگی کا دریا آزادانہ بہتا ہے، اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر ایک مخصوص ہیئت دے دی جاتی ہے۔ داستانوں میں آرزو مندی ملتی ہے جب کہ ناول میں بے درد حقیقتوں کا سامنا کیا جاتا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں :-

”ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں، وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیاری ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کے تخیل کی ابتدائی نوخیز قوت پر داز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم، تڑپناٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی آئینہ میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں، جن میں وہ قوم شروع میں دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی اور جذباتی قوتوں پر زور محرکات کا کام کرتی

تھیں۔ اسی آئینہ میں وہ سب باتیں نظر آتی ہیں۔ جن میں اسے یقین کامل تھا اور جنہیں وہ واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہناتی تھی۔ اسی آئینہ میں وہ سب تصورات بھی ملتے ہیں جو محض تصورات نہ تھے بلکہ اس کے خیال میں ہونے والے واقعات سے زیادہ مضبوط اور پائدار تھے اور اسی آئینہ میں وہ مافوق العادت ہستیاں، واقعات، چیزیں وہ دہم دگمان کے مرتعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں، جنہیں وہ صحیح سمجھتی تھی۔ الغرض ان کہانیوں سے قوم کی ابتدائی مجوسی اور اس کے افراد کی انفرادی کاوشوں کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔“

متذکرہ بالا تجزیے کی روشنی میں اگر ہم فسانہ عجائب کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے یہ مشکل ہو جائیگا، ہم اسے کس خانے میں رکھیں۔ اس میں وہ رجائیت ملتی ہے جو داستانوں کی عام خصوصیت ہے، لیکن یہاں زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی بھی نہیں ہے۔ یہاں ناول کی طرح بڑے بڑے واقعات سے قطع نظر چھوٹے چھوٹے واقعات بھی نہیں ملتے، جن کے سہارے زندگی چلتی ہے اور جو کرداروں کے عمل اور رد عمل کی تشکیل میں مدد کرتے ہیں۔ یہاں ایک مربوط قصہ ہے جو اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے، جہاں واقعات اور حادثات کو ایک پلاٹ کے اندر ایک دور میں پرو دیا گیا ہے۔ یہ دور نہ تو کہیں ٹوٹتی ہے اور نہ کہیں سے ٹکتی ہے بلکہ اس میں تناؤ بھی ہے اور ہمواری بھی۔ اس کے پلاٹ میں وحدت بھی ہے اور تسلسل بھی۔ یہ اس طرح قائم رکھا گیا ہے کہ ہر کردار اور ہر واقعہ اپنے اپنے زاویے سے پلاٹ کی طرف روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اسے داستان سے زیادہ ناول کی طرف لے جاتا ہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:-

”تفصیل اور تکلف کے باوجود فسانہ عجائب کا بھی ناول کے ارتقاء میں

خاص حصہ ہے۔ وہ طبع زاد ہے لکھنو کی حقیقی زندگی کا مرقع ہے اور اس

تہذیب و ذہنیت کا نقشہ جو اس وقت دورِ سرور میں محبوب و مقبول تھی۔“

پلاٹ کی خصوصیت کے علاوہ ’فسانہ عجائب‘ میں کردار نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ جو فرد کے ساتھ ساتھ معاشرت کی جھلکیاں بھی پیش کرتے ہیں۔ کرداروں کا عمل ان کے

اپنے مخصوص مزاج کا آئینہ دار ہے۔ سرور نے جس عہد میں جنم لیا وہ زمانہ قصوں میں کردار نگاری کا زمانہ نہیں تھا۔ کرداروں کا عمل کسی مخصوص سماجی یا نفسیاتی رد عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اگر اس عہد کی داستانوں میں ہمیں کہیں کہیں کردار نگاری کی جھلکیاں مل جاتی ہیں تو وہ ایک حد تک قصہ نگار کی غیر شعوری کوشش ہے۔ عزیز احمد نے درست لکھا ہے کہ

”طلسمی داستانوں کے دور میں اور اس کی پیدادار کے طور پر ایک کتاب ایسی ظہور میں آئی جو ناول سے بہت قریب ہے۔ یہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانہ عجائب ہے“

لیکن ”فسانہ عجائب“ اس لحاظ سے اپنے عہد کی داستانوں سے مختلف ہے۔ گویا وہ ایک ایسے دور کی نشاندہی کرتا ہے جب کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے، کی طرح سرور کے ایک طرف داستان تھی تو دوسری طرف ناول کی پیدائش کا زمانہ بہت قریب تھا۔ وہ داستان کے عہد کا اختتامیہ اور ناول کے عہد کی بشارت ہیں۔

رجب علی بیگ سرور نے اپنے ماحول سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور اس ماحول کو اس خوبصورتی سے قصے کے پس منظر میں سمویا ہے کہ کبھی کبھی پڑھنے والوں کو یہ ماحول حقیقی کے بجائے تخیلی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ فن وہی ہے، جسے فن کا چھپانا بھی کہہ سکتے ہیں۔

رجب علی بیگ اس شہر کے رہنے والے تھے جس نے کم و بیش ایک صدی تک ہندوستانی تہذیب پر اپنا سایہ ڈالا ہے۔ لکھنؤ کو ان معنوں میں مرکزیت حاصل نہ تھی، جن معنوں میں دہلی کو حاصل تھی کہ وہ شمالی ہند کی شاہراہ عام بنا ہوا تھا بلکہ لکھنؤ الگ تھلک تھا۔ اسی لئے جب دہلی کے اجڑنے کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو لکھنؤ میں ایک دربار جما۔ یہاں کی تہذیب نے بہت جلد اپنی روایتوں کی بنیادیں مضبوط کر لیں کہ یہاں کا کہا سنا بھی مستند سمجھا جانے لگا۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:-

”آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا تو اچانک

لکھنؤ شمالی ہند کا مرکز بن گیا۔ آصف الدولہ کی دلاؤینہ شخصیت، بے اندازہ فیاضی، علم دوستی، اور اہل ہنر کی قدردانی نے بہت جلد لکھنؤ کو مرجع خلافت بنادیا۔ جس وقت دہلی سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا لکھنؤ کے چراغ کی کوئی اپنی ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ادبیات کے واقف خوب جانتے ہیں کہ اُس زمانے میں لکھنؤ کے کتنے اہل ہنر، اہل علم اور شاعروں نے لکھنؤ کو آبسایا۔ گردش زمانہ نے دہلی کے چراغ کا بچا کچھا روغن لکھنؤ کے چراغ میں اندھیل دیا۔ دہلی ہی نہیں، ہندوستان بھر سے قدردانی اور محاش کے طلب گاروں نے کھینچ کھینچ کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا اور یوں لکھنؤ کی تہذیب کی تشکیل ہوئی۔ اس تہذیب کے پس پشت صدیوں اور قرون کے تجربات و حوادثات کا رفرما نہیں تھے چند سال کے اندر اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کر لیں اور پھر بہت تیز رفتاری کے ساتھ ثقافت اور معاشرت کے لحاظ سے ایک واضح اور منفرد شکل اختیار کر کے اپنے عروج کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔“

اگرچہ سیاسی طور پر لکھنؤ کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہ تھی اور نہ لکھنؤ نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن تہذیب کے میدان میں لکھنؤ نے اپنا سکہ جمایا اور شمالی ہند میں بہت دنوں تک تہذیب و شرافت لکھنؤ سے منسوب ہوتی رہی۔ تہذیب و معاشرت کے جننے میں ہمیشہ کچھ اصولوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور ان اصولوں کے لئے قوانین اور ضوابط اپنے آپ مرتب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا یہ انداز ہمیشہ کلاسیکی ہوتی ہے اسے اپنے ان اصولوں کی بنا پر بغاوت سے چشم پوشی بھی کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرز کن پر اڑنا کبھی کبھی اس کا مقدر بھی بن جاتا ہے۔ یہی بات لکھنؤ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ یہاں تہذیب و معاشرت اپنے مقررہ قوانین پر برسوں قائم رہی اور اس سے انحراف خلاف تہذیب سمجھا جانے لگا۔ ان معاشرتی اور تہذیبی اصولوں کی گرفت بہت مضبوط اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کی کار فرمائی تھی۔ چلنے، پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، لکھنے پڑھنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے آداب۔ غرض زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جو ان قوانین کی گرفت سے آزاد ہو۔

جہاں معاشرتی و تہذیبی قوانین اتنے مضبوط اور منضبط وہاں ادب اس کی گرفت

سے کیوں کر آزاد رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا پرتو ادب پر بھی پڑا۔ اگر ہم اس زمانے کے لکھنوی ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں لکھنؤ کے معاشرے کا کٹر پن صاف طور پر نظر آئے گا۔ انیسویں صدی عوام کی صدی نہیں تھی۔ یہ خواص کی صدی تھی۔ روٹا، امرا، یا بالفاظ دیگر شرفا کی، جو شرافت اور نجابت کے امین و پیاسان سمجھے جاتے تھے۔ کسی چیز کا عوامی ہونا، اس کے گھٹیا اور پست ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اعلیٰ اقدار کے پاسدار عوام نہ تھے اس لئے کہ وہ تہذیب سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے اور رکھتے بھی کیوں، تمدن کی ساری اجارہ داری تو خواص کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے اس عہد کے ادب میں عوامی زندگی کی جھلکیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے ادب میں لکھنؤ کی زندگی جھلک رہی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لکھنؤ کے عوام اناس کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ انیسویں صدی میں لکھنؤ کی زندگی عبارت تھی، لکھنؤ کے شرفا کی زندگی سے۔ اس لئے انیسویں صدی کی داستانوں میں لکھنؤ کی جس زندگی کی عکاسی ملتی ہے، وہ یہی خواص کے طبقے کی زندگی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ عوام کے ذکر سے ہمارا ادب بے نیاز رہا بلکہ ضمنی طور پر کہیں کہیں ان میں عوام کی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن اس کی حیثیت محض ایک جھلک کی ہے۔

اسی لئے جب ہم اس عہد کے ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کہ آج کے معیاروں سے انیسویں صدی کی معاشرت کا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس عہد کے ساتھ پورا انصاف نہ ہو سکے گا۔

نسانہ عجائب میں ہمیں خاص طور پر عوامی کردار اور شخصیتیں نظر نہیں آتی۔ یہاں بھی ہمیں شہزادے، شہزادیاں، وزیر زادے نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ خادماں، آیائیں یا اس قبیل کے کردار نظر آتے ہیں تو ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تصویر کے رنگوں کو ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی چڑیا ہے تو اس کی اپنی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رجب علی بیگ کے جادو نگار قلم نے چڑیا اور اس کی بیوی کے کردار کو جاندار بنا دیا ہے۔

رجب علی بیگ کا سارا زور شرفا پر ہے۔ یہ شرفا لکھنؤ کے ہیں، چاہے وہ دیار ملک مہرنگار ہو یا ملک زرننگار ہو۔ — جان عالم کے شہر فحش آباد کا ذکر کرتے ہوئے

سرور لکھتے ہیں :-

”مینو سواد، بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابلِ بود و بایش

خوبانِ زمان، شمیم صفت، — زمین اس کی رشکِ چرخ بریں، گلی کوچہ
نجلتِ دہ گلشن، گلزارِ بسانِ تختہ چمن —“

جب جانِ عالم کا گذر ملکِ زرنگار میں ہوتا ہے۔ سرور بیان کرتے ہیں :-

”شہر دیکھا، قطعدار، ہموار، قرینے سے بازار، کرسی ہر دکان کی کمر

برابر، مکان ایک سے ایک بہتر و بدتر، بیچ میں نہر، جا بجا فوارے —

سب عمارات شہرِ پناہ کے میل کی، جواہر نگار ساپنچے کے ڈھلے، ہاتھ کا کام

معلوم نہ ہوتا تھا، نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی، ایک کا جواب

دوسری طرف۔ ادھر بنانا تو ادھر بھی نہ آت کے مقابلِ صرافت، بازار کا صحن،

نفیس شفات۔ جوہری کے ردِ بد جوہری، زر و جواہر کا ہر سمت ڈھیر، نقد و

جنس سے ہر شخص سیر، کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار میں

نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا۔ جنوب و شمال کا خریدار

تھا، حلوائی، نانباں، کنجڑے، قصائی، سقوں کے کٹوروں کی جھنکار، میوہ فروشوں

کی پکار، دلالوں کی بول چال، جہاں کا اسباب و مال، نہر کی کیفیت جدا،

قد آدم آبِ مصفا، فواروں سے کیوڑہ گلاب اچھلتا، بازار مہک رہا۔ ہر

طرف دھوم دھام، خلقت کا اثر دھام، چلنے پھرنے والوں کے کپڑے لٹے

ہوئے جاتے تھے۔ دہم دگمان کشمکش سے بار پاتے تھے — جب چوک

میں آیا، پوچھا ”ایوانِ جہاں پناہ دولت سرائے شاہ کدھر ہے“

سرور کو لکھنو سے عشق ہے، وہ جب کسی شہر کا ذکر کرتے ہیں، تو انھیں لکھنو یاد

آجاتا ہے اور بقول خود ان کے —

”خطہ بے نظیر، دلپذیر، رشک گلشنِ جنان، مسکنِ عور و غلام، جاٹ

۱۱۱ فسانہ عجائب۔ نو لکھنور ۱۲ داں اڈیشن ۱۸۵۰

۱۱۲ فسانہ عجائب۔ نو لکھنور ۱۲ داں اڈیشن ۱۸۵۰-۶۶

۱۱۳ فسانہ عجائب۔ نو لکھنور ۱۲ داں اڈیشن ۱۸۵۰

مردم خیز۔ اگر دیدہ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے۔ سبحان اللہ بجمہ عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کو چہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ دو روئے بازار، کس انداز کا ہے، ہر دکان سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان ہے۔“

گویا لکھنؤ صرت ”بیان لکھنؤ“ میں ہی نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ پوری داستان کے پس منظر کا کام کرتا ہے۔ وہ انجن آرا کی شادی اور رخصتی ہو یا مہر نگار کی رسم نکاح۔ لکھنؤ کی رسومات واضح طور پر دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ رسومات عوام کی رسومات نہیں ہیں۔ یہ خواص کے رسم و رواج ہیں جن سے لکھنؤی معاشرت مراد لی جاتی ہے۔ سرور اسی طبقے کے عکاس ہیں۔ لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں جہاں چل پھل ہے، شور ہے وہاں وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کا شہر، شہر خموشاں معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت بش نرائن در لکھتے ہیں:

”سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے، صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں، حلوائی کی دکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تینولیوں کے ہاں کی گولیاں دیکھ کر ہمارا جی لپچاتا ہے۔ جوہری بنے، بقال، کبڑے سب چوکھا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسرے بازار اور سیرگاہیں جواب باقی نہیں، ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ ان بلند عمارتوں اور کمروں پر بھی جاتی ہے، جہاں سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں۔ ہم چوک میں ہو کر گزرتے ہیں۔ لیکن وہ ایک شہر خموشاں ایک سونی بستی معلوم ہوتی ہے راہ اور دکاندار سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوے سے کھوا نہیں چھلتا۔ کمرے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں۔ تینولیں کد شہ ناز میں مصروف ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔ زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ مشہور مشہور گویے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر ان کا ناسننے میں نہیں آتا۔ شعراء فوجی سپاہی بادشاہ وزیر سب سامنے سے فانوسی

تصویروں کی طرح گزر جاتے ہیں مگر سب خاموش ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ تصویریں بے ہوشی کے عالم میں کھینچی ہیں، لہذا یہ کتنا بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خوشاں ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود، پنڈت بشن ندائن در کے متذکرہ بالا خیالات سے متفق نہیں ہیں اسلئے کہ انھیں فسانہ عجائب کے لکھنؤ میں دکانداروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

”یہ کیسا شہر خوشاں ہے جہاں تمہاری بگھارنے کی سریلی چھٹکار تک سنائی دے رہی ہے، جہاں خواپنچے فالوں اور دکانداروں کی آوازیں گوبنچ رہی ہیں۔“ گنڈیریاں ہیں پونڈے کی۔“ میاں ٹکے کو ڈھیر لگایا ہے۔“ مزہ انگور کا ہے رنگ تروں میں۔“ لکھیے کا منہ کالا ہے۔“ مہویہ گرو کر ڈالا ہے، غیر ہے نہ گل لال ہے، کتھے چونے سے ادھی میں مکھڑا لال ہے۔“ کیا اس شہر کو شہر خوشاں کہا جاسکتا ہے جس کی گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی ہے۔“ شیر مال ہے گھی اور دودھ کی۔“ کدھر لینے والے ہیں، منٹ کی قفلیاں اور کھر کے پیالے ہیں۔“ کیا خوب بھٹنے بھر بھرے ہیں، چنے پر مل اور مرمرے ہیں۔“ جہاں کے بازاروں میں پھول والے چلا رہے ہیں۔“ بیلے کے ہار ہیں، شوقین البیلے کو، پن سے چلا جائزگی محل کے میلے کو۔“ بلکہ یہاں تو باغ میں کوئل، پیپہ اور مور کا شور بھی سنائی دے رہا ہے۔ سرور لکھتے ہیں ”سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا۔“ اسی چوک کے متعلق یہ کہنا کہ ”ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوسے سے کھوا نہیں چھلتا“ اور جہاں مدارے حقوں کا تہا قاسنائی دے رہا ہو وہاں کے راہ گیروں اور دکان داروں کو محو خواب بتانا، کہاں تک درست ہے؟“

در اصل سرور خود اس بازار میں نہیں ٹھہرتے، وہ عوام کا دل لیکن خواص کا دماغ رکھتے ہیں۔ اس لئے بازار کی یہ ہڑ بولنگ ان کے دل کو لبھاتی بھی ہے اور ان کے دماغ کو گراں بھی گزرتی ہے۔ سرور ان کا ذکر تفصیل سے نہیں کرتے، کیونکہ وہ عوام ہیں جو ننگے پاؤں ننگے سر پھرتے ہیں۔ ان کے یہاں مخصوص کردار نہیں ملتے یہ محض نمونے ہیں۔ سرور ان کے خدو خال پیش نہیں کرتے۔ وہ ان کی ”کان پڑی آواز“ سن کر آگے بڑھ

جاتے ہیں۔ اگر وہ لکھنؤ میں ہوتے تو شاید ان کا ذکر بھی نہ کرتے لیکن لکھنؤ سے باہر رہ کر لکھنؤ کے گلی کوچے، صحن و بازاہ، ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور یہ بات فطری بھی ہے۔ دور سے ڈھول کی آواز بھی سہانی سنائی دیتی ہے۔ یادیں خوشگوار بھی تو ہوتی ہیں۔ سرور جب نصیر الدین حیدر بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اور محل سرا کا نقشہ لکھتے ہیں تو اس بیان میں ان کی زبان بھی چٹخارہ لینے لگتی ہے اور یہاں ہم کو جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں ان کے کردار اور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ سرور نے چند سطروں میں نصیر الدین حیدر کے عہد کا چربہ بڑی خوبصورتی سے اتارا ہے۔ کہ ہم ذرا اسی دید کو اس عہد میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہیں محل کا نقشہ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس ماحول میں سانس لینے لگتے ہیں اور اس عہد کی روح کھنچ کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

”یہ فسانہ بعہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام

بعض سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ ہوا۔ اللہ الشدید عجب شاہ جہاں ارکھ نشین ہوا کہ حاتم کا نام صفحہ سخا سے، مثل حرف غلط مٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنا دیا۔ عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کتھڑن ہفت ہزار یوں سے اعلیٰ بنائی۔ شہزادیوں کو کمار یوں پر رشک آیا۔ خواصوں کو صاحبِ نوبت کیا، چند ڈول سکھیاں میں چڑھایا۔ ہزار بارہ سے جلے دالی جوردش، برق صفت، بکبک رفتار، نغز گفتار، از پاتا فرق، دریائے جواہر میں غرق، ہر دم دست بستہ رو بہ دکھڑا رہی۔ جہاں ان کی نعمت اُن کے سامنے پڑی رہی۔ اسیلوں کو کرڈڑوں روپہ دیے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کئے قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی معارفیت و شان فلک ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کرڈڑ روپے اس منظور نظر نے صرف کئے خزانے خالی کہ محتاجوں کے گھر بھر دیئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اس طرح بنوائے کہ فلک گردان نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اندر اس گلشن ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی، چشم و گوش عالم نے دیکھی نہ سنی۔ دوازدہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ

گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی۔ اندر اس میں عطر کا عوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔ مغلائیوں نے گوٹے کناری کی کڑیوں سے چاندی سونے کے محل اٹھائے۔ خاصے دایوں نے لانگ الائیچی، زعفران کے اپنے گھروں میں خاصے ڈبیر لگائے۔

یہ قصہ رجب علی بیگ سرور کا طبع زاد ہے۔ ہر چند اس میں جو واقعات ملتے ہیں، وہ اس زمانے کی اکثر کتابوں میں نظر آتے ہیں، لیکن اس میں نقالی کا جذبہ نہیں بلکہ اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرتی روایات کو اختیار کرنے کا جذبہ ہے اور مجھے تو یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ عمل بھی غیر شعوری ہوگا۔ اس کے پیچھے کوئی جانا بوجھا اور سوچا سمجھا رویہ نہیں معلوم ہوتا۔

’فسانہ عجائب‘ کی اہم خصوصیت جس کی طرف میں خاص طور پر اشارہ کرنا چاہتا ہوں، اس کا ہندوستانی مزاج ہے۔ یہ ہندوستانی مزاج نہ صرف نفسِ قصہ میں نظر آتا ہے بلکہ پلاٹ کی بناوٹ میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ ہندوستانی قصوں میں توڑنے کی اہمیت غیر معمولی رہی ہے اور اکثر اس کی حیثیت ایک کردار کی رہی ہے۔ رجب علی بیگ نے بھی اس قصے کا محرک توڑتے ہی کو بنایا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ملک محمد جاسی نے اپنی زندہ جادید ہندی تصنیف ”پدمادیت“ میں ہیرامن توڑتے سے کام لیا ہے، جس کا قصہ یوں ہے کہ :-

”گندھپ سین جزیرہ سنگدھپ کا راجا تھا، اس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام پدمادیتی تھا۔ پدمادیتی کے پاس ایک توتا تھا۔ ہیرامن —

۱۵ ملک محمد جاسی (سنہ ۱۰۴۹ھ۔ سنہ ۱۱۰۴ھ) وطن محلہ کھنانہ کلاں قصبہ جالس ضلع رائے بریلی تھا۔ آپ فیرمنش بزرگ تھے۔ آپ کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ کہتے ہیں کہ غلطی سے ایک بھٹے نے رات کے اندھیرے میں جنگلی جانور سمجھ کر آپ کو مار دیا تھا۔ ملک صاحب کا درجہ ہندی ادب میں بہت بڑا ہے۔ آپ کی تصانیف ہیں۔

۱۶ پدمادیت کا سن تصنیف ۱۱۶۷ھ ہے۔ اس میں بادشاہوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اس نظم میں پرانے زمانے کے رسم و رواج بھی ملتے ہیں۔ اس میں محاورے، مقولے، ضرب المثل اور پسند و نفاق بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

پدمادتی نے ہیرامن سے شوہر تلاش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ خبر بادشاہ
 تک پہنچ گئی۔ اس نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ خیر سے اس نے جان
 بچائی اور جنگل کو بھاگ گیا۔ وہاں سے پھر کسی شکاری کے ہاتھ لگا جس نے
 چھوڑ لاکر اُسے بیچ دیا۔ اس توڑے کو راجارتن سین نے خریدا۔ ایک دن
 رتن سین کی رانی ناگمتی سنگار کر رہی تھی۔ سنگار کے بعد وہ ہیرامن توڑے
 کے پاس آئی اور اس سے پوچھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی خوبصورت
 ہے۔ توڑے نے اس کے جواب میں پدمادتی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور
 طنزاً کہا کہ پدمادتی اور تم میں وہ فرق ہے جو دن اور رات میں ہوتا ہے۔
 یہ سن کر ناگمتی توڑے پر غضبناک ہوئی۔ اس نے ہیرامن کو مار ڈالنے کے
 لئے نوکری کے سپرد کیا لیکن نوکری نے اُسے مارا نہیں۔ جب راجا شکار سے
 پلٹے اور توڑے کو نہ پایا تو اسے اتنا افسوس ہوا کہ اس نے کھانا پینا تک
 چھوڑ دیا۔ جب راجا کے ربخ میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا تو پھر توڑے کو
 اس کے سامنے لایا گیا۔ ہیرامن نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جب راجا رتن سین
 نے پدمادتی کے حسن کی تعریف سنی تو بے دیکھے اس کا عاشق ہو گیا اور ہیرامن
 توڑے کی رہبری میں پدمادتی کی تلاش میں نکلا۔ اور بسنت پنچمی کے دن مہادیو جی
 کے مندر میں پہنچا جہاں پدمادتی اس روز پوجا کرنے آیا کرتی تھی اور وہاں
 اس نے دونوں کی ملاقات کرائی۔ اس کے بعد ایک بڑی لڑائی کے بعد
 پدمادتی کو جیت کر واپس آیا اور بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہوئی۔
 اس کے بعد علاء الدین پدمادتی کے حسن کی تعریف سن کر غائبانہ اس پر عاشق
 ہوا اور اسے حاصل کرنے کے لئے رتن سین کو قید کر لیا۔ پدمادتی نے یہ
 سن کر اپنے آپ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔
 بادشاہ نے استقبال کی تیاریاں کیں۔ محاذ شاہی محل کے سامنے آکر رکا
 مگر پدمادتی کی جگہ راجپوت تلوار لئے ہوئے نکل آئے اور رتن سین کو
 آزاد کرایا۔ اب علاء الدین خلجی نے رتن سین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا
 خوب گھمسان لڑائی ہوئی۔ ایک اک راجپوت مارا گیا۔ رتن سین بھی لڑتے

ہوئے ختم ہو گیا۔ رتن سین کی موت کی خبر سن کر دونوں رانیوں ناگفتی اور پدمادتی نے راجپوتوں کی رسم کے مطابق ”جوہر“ کر لیا اور آگ میں جل کر خاک ہو گئیں۔ یہ ہے ”پدمادوت“ کا پلاٹ، جو میں نے اضافی طور پر پیش کر دیا ہے ورنہ مقصد تو یہ کہنا تھا کہ توتے سے بھی رجب علی بیگ نے وہی کام لیا ہے۔ یعنی شاہزادہ جان عالم بازار سے ایک لاکھ روپے کا توتا خرید کر لاتے ہیں اور بارہ ماہ طلعت (جان عالم کی بیوی) بناؤ سنگار کرنے کے بعد ”دیکھ آئینے کو کتنی تھی اللہ رے میں“ پھر توتے سے فرمایا ”ایسی صورت کبھی دیکھی ہے“ توتے نے بے اعتنائی سے کہا ”ایسا ہی ہو“ ماہ طلعت برہم ہو کے بولی ”میاں مٹھو جینے سے خفا ہو، جو ہمارے روبرو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہوئے“ اتنے میں جان عالم تشریف لائے، عجب صحبت دیکھی۔ شہزادے نے پوچھا: ”خیر باشد۔“

توتا بولا ”آج نرا شر ہے، اگر آپ اور گھر ہی بھر دیر لگاتے تو میرا طائر روح گر پڑ غصیب شہزادی سے مجروح پرواز کر جاتا۔“

ماہ طلعت نے کہا ”اگر میری بات کا توتا جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی آنکھیں ملوں گی، جب دانا پانی کھاؤں گی“

شہزادے کے اصرار پر توتے نے کہا ”مجھ سے سچ نہ بلو ایسے، میرا منہ نہ کھلو ایسے، انجام راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی، بادیہ پیماؤ نصیب ہوگی۔ شمال کی راہ میں عجائب زرنگار ہے، وہاں کی شہزادی ہے انجن آرا۔ اس کا تو کیا کہنا، اگر ان کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ دیکھیں تو چلو بھر پانی میں محبوب ہو کے ڈوب جائیں۔“

جان عالم نے پنجرہ اٹھایا اور دیوان خانے میں لے جا کر مفصل حال دریافت کرنے لگا اور نادیدہ انجن آرا کا عاشق ہو گیا اور توتے کو رہبر بنا کر قصد ملک زرنگار کا کیا۔ اس کے بعد راستے کی دشواریاں توتے کا کھو جانا، ملکہ مہرنگار کا ملنا، انجن آرا کا حاصل کرنا، وزیر زائے کا فریب دینا، راستے میں جادوگر نی سے سرکہ اور منزل پر پہنچتے پہنچتے گویا کمند کا ٹوٹ جانا، کشتی کا طوفان کی نذر ہونا اور پھر دردِ فراق اور صدمہ الم سہنا، بالآخر جوگی کی مدد سے بچھڑوں کا ملنا۔ اور پھر اپنے ملک ”فست آباد“ واپس آنا۔

داستان میں بنجومیوں اور رمالوں کا بیان — اس عہد کے عقائد کا آئینہ دار ہے۔

۱۵ دیکھے بنجومیوں اور رمالوں کا ذکر ص ۱۱، ۸۵، ۱۹۸ لوکچور ۱۲ واں ادیشن

جب اپنی بے بسی کی تسکین تقدیر کے اٹل فیصلوں سے ہوتی تھی۔ درباروں میں بخوموں، پنڈتوں، جعفر دانوں کو خاص طور پر اہمیت حاصل تھی۔ برہمنوں کی بھی عزت کی جاتی تھی اور ان کی بڑائی اور ہمہ دانی کا سکہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے دلوں پر تھا۔ مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح اپنی جنم پتریاں بنواتے تھے۔ واجد علی شاہ کے بھی زاپٹے بنے تھے۔ فسانہ عجائب میں جب شہزادہ جان عالم پیدا ہوتا ہے تو یہ لوگ بلائے جاتے ہیں۔ زاپٹے دیکھتے ہیں۔ برہمنوں نے عرض کی —

”مہاراج کا بول بالا ہو، جاہ و شہم مرتبہ دو بالا اعلیٰ رہے۔ ہماری پوتھی کہتی ہے۔ بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرماں بلی ہے، جو گرہ ہے وہ بھلی ہے۔ دیگ نیگ کا مالک رہے۔ دھرم مورت یہ بالک رہے۔ جلد راج پر براہجے، پرتھی میں دھوم مچے، ایسی شادی رچے، مگر چندرھو برہس مشتری بارھویں آئے گی، سینچر پاؤں پڑے گا۔ ایک بکھیرو سوئے کے برن میں ہاتھ آئے گا۔ تریا کے کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھڑا، دیں بدیں لے جائے گا۔ ڈگر میں شہزادہ بھٹکے، کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے ڈانوا ڈول، پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک، کرپا کر کے راہ لگائے کوئی کلنکن لو بھی ہو، کشت دکھائے، وہاں سے جب چھٹے رانی ملے، مہاسندر، وہ چرن پر پران وارے، پتا اس کا گیانی، گن کی تکھتی دے، اس سے کئی پلچھ مارے، دکھ میں آڑے آئے، بڑے کام بنائے، جب اس نگر پہنچے، جس کے چت میں گھر چھوڑے تو لاب بہت ہو، درب گھنے ہاتھ آئیں۔ دور سب کلیں ہو جائے۔ پر ایک ہتی من کا کپٹی، استری پر ددیت ہو، کھٹائی کرے، جھج پڑیں، زرناری لڑیں اور کچھ جل میں بھی ہل چل پڑے، پرتی لوگ چھٹ جائیں، نگر نگر کھوج میں پھر آئیں، سب بچھڑے مل جائیں، ماتا پتا کے ڈھک آئیں۔ استری تین ہو، ددکا پرمان رہے۔ ایک کی ہین ہو، بڑا راج کرے، دیا دھرم کے کاج کرے، گتیاں کی کرپا سے جان کی کیر ہے، بڑی بڑی دھرتی کی سیر ہے۔“

یہ طویل اقتباس برہمنوں اور پنڈتوں کے انداز بیان کا غماز ہے۔ "بادشاہ گو نہ ملوں ہوا۔ پھر ان سب کو بقدر حال فراخ کمال مالا مال کیا، خلعت و انعام دیا۔" یہ بھی ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کی دلیل ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اندر جو اتحاد کی لہر نظر آتی ہے اس کی ایک ہی مثال نہیں ہے بلکہ اس داستان میں اس کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔

انجن آرا اور جال عالم کی شادی طے ہو گئی ہے نکاح کے لئے ساعتِ سید (شب گھڑی) دیکھنے کے لئے رماں، پنڈت، جفرداں طلب کئے گئے ہیں کہ وہ علم ہیئت اور ہندسے اور نجوم کی مدد سے طے کریں کہ اس نیک کام کے لئے کون سا وقت مناسب ہے۔

"کسی نے قرعہ پھینکا، زائچہ کھینچا، شکلیں لکھیں، کسی نے پو پھٹی کھولی، کوئی حرث مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا کوئی ملک، برچھک، دھن، مکہ، مین، میکہ، متھن، کرگ، سنگھ، کنیاں گن کر بچارنے لگا۔"

اس طرح بقول سرور بوجہ حکم "منجھان صدر نشین، مند کشت و دیر، حکم ردایان خوش فال، مانجھے کا جوڑا دولہن کے گھر سے چلا" اور ان رسومات کا سلسلہ شروع ہوا جو خالصاً ہندوستانی ہیں۔ "بٹنا ملنے کا کنگنا، ننگی ملتان کی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پر خندہ زن ہو۔ عطر سہاگ مہک پری ایجاد" نصیر الدین حیدری ارگہ محمد شاہی، زعفران کا تختہ — سکھیاں اور چنڈوؤں میں زنانی سواریاں۔"

اور اس خوشی کے موقع پر رنگ کھیلنا کہ بقول سرور "خلقت ہولی کی کیفیت بھولی شہر میں شہاب و زعفران کے سرخ و زرد نالے بھے۔ گلیوں میں عجیر دگلاں کے ٹیلے ٹیکرے رہے۔"

یہی نہیں شادی کی ضیانت میں سرور نے جو اہتمام کیا ہے اس میں ہندوستانی روایات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ رواداری ہماری تہذیب کا ایک اہم جزو تھا۔ ڈاکٹر سید

۱۵ فسانہ عجائب نو کشور ۱۲ داں اڈلشن ص ۸۵

۸۵-۸۶

۸۶

۸۴ ایضاً

۸۳ ایضاً

عابد حسین نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

” معاشرتی زندگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو اثر ایک دوسرے پر ڈالا ہے اور اس کی وجہ سے ان کے رسم و رواج میں جو یکسانی پیدا ہوئی وہ حیرت انگیز ہے اس لئے کہ دونوں کے معاشرتی ادارے ان کے مذہبی عقیدوں سے بہت قریبی تعلق رکھے ہیں اور ان عقیدوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ڈاکٹر تارا چند صاحب فرماتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں پر جو اثر ڈالا اس کو جس قدر اہمیت دی جائے کم ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت اور خوشنمائی کے ساتھ یہ اثر روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں گانے، بجانے میں وضع اور لباس میں کھانے پکانے کے طریقوں اور شادی بیاہ کی رسموں میں میلوں اور تیوہاروں میں مرہٹے، راجپوت اور سکھ رئیسوں کے درباروں کے آداب میں نظر آتا ہے۔“

سرور نے اس تہذیب کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ یہاں کسی قسم کے دکھاوے اور بناوٹ کا فقدان ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ہندو مسلمان یوں بھی میل جول سے رہتے تھے اور ایسی منفی قدریں بھی نہ تھیں، جو ان کے اندر کسی قسم کی گڑبڑی کر سکیں۔ رواداری اس سماج کی بنیادی قدر تھی۔ سرور اپنی داستان میں دعوت کے موقع پر لکھتے ہیں :

” دن رات دوکانیں کھلی رہیں، قریب قریب ناچ ہو، ان کے کھانے کا صرف تفرنی بادرچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندوؤں کو پوری کچوری، مٹھائی، اچار۔ مسلمانوں کو پلاؤ، قلیہ، زردہ، قورمہ، ایک آبی، دوسری شیرمال، فزنی کا خواجہ، طشتری کباب کی، بہت آب و تاب کی۔“

اور اس کے بعد شادی کی دیگر رسومات، جن میں ڈومنیوں کا سینٹھنیاں اور پابونی گانا، — رخصتی کے وقت شہنائیں، بھیردوں، بھباس آلیالیت، رام کلی کا پھونکنا نقیب اور چوہداروں کا کول کی طرح کوکنا — اور ان پر مستزاد بکرا ذبح کرنا اور انگوٹھے میں لہو لگانا — خالص ہندوستانی معاشرت کی دین ہے۔ اس خوشی کے موقع پر

لے ہندوستانی تہذیب۔ مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۸ء ۶۴-۶۵

لے فسانہ عجائب۔ نو لکچور ۱۲ داں ادیشن ص ۸۶

کون ہے جو فیضیاب نہیں ہوا۔

اس کے بعد جب ملکہ مرنگار سے شادی کے بعد جان عالم رخصت ہوتا ہے تو ملکہ کا باپ عل بتاتا ہے۔ یہ عل ہے روح کو کسی دوسرے کے قالب میں لے جانے کا۔ یوں تو یہ داستان میں ایک مافوق الفطرت عنصر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن دراصل یہ تصور ہندستان میں عام معلوم ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ تذکرہ غوثیہ مرتبہ شاہ گل قادری سے بھی ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اُن کے مرشد غوث علی شاہ قلندر (معاصر رجب علی بیگ سرور) کا

”ایک روز ارشاد ہوا کہ جب بہ ارادہ حج چلے تو اور کے راستے میں ایک ہندو فقیر چار چیلوں سمیت ہمارے ہم طریق ہو گئے تھے، کہنے لگے کہ رات کو ہمارے ساتھ ٹھہرنا۔ چنانچہ ہم سب ایک دھرم شالے میں جا اترے۔ انھوں نے چیلوں سے پوچھا ”کیا کھاؤ گے“ تب نے اپنی اپنی رغبت کے موافق کہہ دیا، وہی کھانا موجود ہو گیا۔ پھر ہم سے پوچھا ہم نے کہا ”جو آپ کھائیں گے“ — کہا کہ ”میں تو مونگ کی دال اور چپاتی کھایا کرتا ہوں“ عرض جب ان کا کھانا تیار ہوا تو ہم نے بھی وہی کھایا۔ بات چیت شروع ہوئی تو ایک اُنس پیدا ہو گیا، کچھ توجہ کا ذکر آیا۔ ہم نے استدعا کی، کہنے لگے کہ ”تین روز ہمارے پاس رہو، چوتھے روز توجہ دیں گے“ خیر ہم ٹھہر گئے۔ انھوں نے تین روز تک ہم کو برت رکھوایا۔ پھر توجہ دی۔ واقع میں بڑے زبردست آدمی تھے ہم بہت لوگوں سے ملے اور توجہ لی مگر یہ تاثیر کسی کی توجہ میں نہ دیکھی۔ ان کی توجہ سے ہمارا قلب گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا اور قائم ہو گیا تھا۔ ایک دن انتقال روح کے باب میں گفتگو آئی، کہا کہ ”ہاں ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو سکتی ہے کیا یہ تماشا دیکھو گے۔ ہم نے کہا ”ضرور“ — کہا ”اچھا ایک جانور مردہ لاؤ“ اگلے دن ہم ایک مردہ توٹا لائے۔ رات کے وقت وہ دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور توٹے کو سامنے رکھ لیا۔ چراغ گل کر دیا۔ سسکی لے کر دم کھینچا، کھٹ سے ایک آواز آئی اور بجلی سی چمکی۔ توٹے میں جان آگئی۔ ہم نے اس کو پکڑ لیا اور باتیں

کرنا شروع کیں۔ وہ بول تو نہ سکتا تھا مگر اشاروں سے باتیں کر سکتا تھا۔

پھر ہم نے کہا اچھا اب اپنے جسم میں آجائیے۔ تماشا دیکھ لیا۔ غرض وہ بدستور سابق اسی چمک دمک سے اپنے جسم میں آگئے۔ ہم نے کہا ”یہ بات ہم کو بھی سکھلا دیجئے“ کہا کہ ”اچھا پندرہ دن میں سکھلا دیں گے مگر روٹی کی ممانعت کر دی اور دودھ چاول کھانے کی اجازت دی اور کپالی چڑھانی بتائی۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو چیتن تاڑی، جس میں جسم م کرتے ہیں مگر ہوش و حواس قائم رہتے اس سے پہلے ناتی، دھوتی اور کچل کر یا کرائی۔ غرض پندرہ دن میں اپنا قول پورا کر دیا۔ ہم نے چند روز کے یہ عمل چھوڑ دیا کیونکہ ایک بکھڑا تھا چونکہ کپالی چڑھانا ہم کو روکین سے یاد تھا۔ اس واسطے پندرہ دن میں یہ عمل پورا ہو گیا۔“

میں یہاں اس عمل کی صداقت یا عدم صداقت کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تصورات ہندستان میں رائج و مقبول تھے اور فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ نے ان کو بڑی خوبصورتی سے اصل قصے میں سمو لیا ہے۔ یہاں ہمیں تذکرہ غوثیہ کے بیان پر مزید حاشیہ آرائی نظر آتی ہے اور اس داستان طرازی کا ان کو بحیثیت ایک قصہ گو کے پورا پورا حق پہنچتا ہے۔ تذکرہ غوثیہ کے بیان اور فسانہ عجائب میں پیر مرد کے عمل میں یہ بات نمایاں ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایسے معتقدات کو قبول کر لینے میں تکلف نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ رجب علی بیگ نے اس کا ذکر افسانوی حیثیت سے کیا ہے لیکن اپنے مسلمان کرداروں میں ہندوؤں کے معتقدات کو منتقل کرنا بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایک دوسرے عقیدوں پر انگلی اٹھانا تو کجا، اس کو جوں کا توں مان لینے میں بھی تامل نہ تھا۔ سرور کی اس تہذیبی میل جول پر نظر تھی اور وہ مصوفانہ خیالات کو جوگی کے کردار اور اس کے ماحول کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔

”ایک طرف درخت گنجان، گھنے پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے اور

منڈھی کا گنبد، بسان گنبد گردان بے ستون کا جواب بنا، ترمول کھڑا،

کھاروے کی جھنڈی پھر پھراؤٹی، کلمہ شہادت بخط جلی اس پر لکھا۔ جب اس کے نزدیک آیا، دور دور تک مکان صاف صاف صحن شفاف پایا، مٹھ کے رو برد، درخت کے تلے، چوڑے کے اوپر ایک جوگی، سو سو سے برس کا سن دسال مگر ٹانٹھا، کمال، ڈاڑھی ناف سے بڑی، گرہ لگی، جٹا ہر ایک راکھ سے بھری، قدموں ہو رہی، پاؤں پر پڑی، پلکیں دیدہ حق ہیں کا اسرار چھپانے کو چشم حاسد سے گزند بچانے کو، مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موج دریا کی طرح جھڑیاں پڑیں، کمر میں کردھنی موٹی سی، مہین مانکی، عجب آن بان کی، کھاروے کا ننگوٹ، ستر عورتیں کی اوٹ، حقہ چوکانی منہ سے لگائے۔ افیونی کی شکل بنائے شیر کی کھال بچھائے، بھبھوت رماٹے، دید وادید سے بظاہر آنکھیں بند مگر دیدہ دل کھلا، خموشی پسند قلب گویا بولتا سوتا نہ جاگتا، آسن مارے، دنیا سے کنارے بیٹھا، میٹ سے پیٹھ لگائے۔ تیر قدر است، مثل کمان خیدہ، گویا چلہ کھینچ چکا ہے۔ زنار آسارگیں عیاں، کھال سے ہڈیوں کے جوڑ، شمع فانوس نمط نمایاں، نسیم سلیمانی، ایمان کی نشانی ہاتھ میں — ہر بھجو ہر بھجو تکیہ کلام بات بات میں، قشقہ ٹیکا ماتھے پر ہندوں کا سا اور سجدے کا گھٹا بدرکامل کی صورت چمکتا، زرد مٹی بدن میں، ذکر حق دل و دہن میں، کہیں مصلے پر سجدہ گاہ رکھی کپڑے کی جانا زبھی۔ کسی جا پوتھی کھلی، دھونی رمی، دونوں سے راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان نہ ہند نہ مسلمان بقول مرزا سودا سے

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں، بیلے چیلی کی، بہار گلکاریاں، کہیں مرشد کے ڈھیر، گرد کی چھتری بزرگوں کے مزاروں پر، موسری درخت سایہ دار، قطار قطار، درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے، باہم بحث کرتے، اٹکتے، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہ کو۔ کلمہ کے دم سناٹے کا عالم، کہیں مرگ چھالا بچھا، شیر چوک دیتا، دھونی لگی، لکڑی سلگتا۔ کسی جا بر کی کھال

کا بستر، آہوئے صحرائی اس پر بیٹھا، اودا سا تو نیا، بینتا دھرا، ایک سمت
 بھوانی کا مٹھ، تلسی کا پیڑ ہرا بھرا، گرد چٹمہ پانی کا بھرا۔ جائے دلچسپ مکان
 رعب دار، خود رو کی جدا بہار، ایک طرف بھنڈارا جاری، کرٹھاؤ چڑھا،
 موہن بھوک لمتا، کیس پلاؤ قیلے کی تیاری، چھاندا بٹ رہا تھا، کچھ منت بال
 کے، کچھ مرید حال دقال کے۔ کوئی چلے میں بیٹھا۔ کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے
 کھڑا، کسی کے خرّہ و تاج سرد تن میں کوئی چواگن میں، کیس کٹھا ہوتی کوئی
 وعظ کہہ رہا ایک طرف خنجر بختی، طنبورا چھڑتا، بھجن ہوتے، ایک سمت
 حلقہ مراقبے کا بندھا، نوحہ پڑھ رہے، لوگ روتے، عجب وہ گرد مرشد
 غریب، یہ مرید چیلے، روز ایک دو کو مونڈتا، تیسرے چوتھے دن عرس، ہر ہفتے
 میں میلے، حاصل کلام یہ ہے کہ وہ عجیب جلسہ تھا کہ دیکھا نہ سنا۔ یہ اجتماع
 نقیضین آرام دہین سے شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی مرد آگاہ دل
 روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اٹھائی، آنکھ ملائی دیدے لال لال، رعب و
 جلال۔ جان عالم کو بغور دیکھا اس نے جھک کر مودب سلام کیا۔

جوگی کے اس بیان میں سرور نے اپنے زمانے پر تصوف اور بھکتی کے واضح اثرات

کو صاف طور پر پیش کر دیا ہے۔ ان عقائد نے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں روحانی
 ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو بھکتوں کے خیالات
 کا براہ راست ایک دوسرے پر اثر پڑ رہا تھا۔ اس مسلک کو ہندو اور مسلمانوں میں
 یکساں طور پر ہر دلعزیز بنانے میں رامانند کے ایک شاگرد کبیر کا ہاتھ تھا۔ کبیر کی تعلیم میں
 ہندو اور مسلمانوں کے گہرے روحانی جذبات سموئے ہوئے تھے۔ "اس میں عاشقانہ
 ذوق و شوق، سوز و ساز، تسلیم و رضا کے ساتھ ساتھ مخلصانہ بلکہ مجاہدانہ جوش خروش بھی
 ہے۔" کبیر اور دوسرے صوفیوں کی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی
 میں ایک نئی بیداری اور حرکت، اس کے ساتھ ساتھ رواداری اور مصالحت کی ایک عام
 فضا پیدا کر دی۔

فسانہ عجائب میں جوگی کا کردار ایک مثبت کردار ہے، جو اگر کہیں منفی دکھائی دیتا
 ہے تو اسی حد تک جہاں وہ منفی قدروں کی خود نفی کر رہا ہو۔ یہ بڑا واضح علامتی کردار

ہے۔ اس کو اس کے عہد کے سماجی پس منظر میں ہی دیکھنا چاہئے ورنہ یہی اندیشہ ہے کہ ایسا نہ کیا گیا تو وہی غلطی ہوگی جو ڈاکٹر گیان چند سے ہوئی کہ انھوں نے جوگی کے کردار کو معجون مرکب سمجھا اور فرمایا کہ

”یہ اجتماع ہندین محال ہے۔ ہندو رسوم کی پابندی اسلام سے کافر گردانتی ہے اور اسلامی طرز اور اسلامی عبادت زمرہ ہندو سے خارج کرتی ہے۔ ایسا شخص دونوں مذہبوں میں دلی سمجھا جانے کے بجائے دونوں مذہبوں میں مردود قرار پائے گا۔ یہ کردار نگاری اسی طرح خرافات ہے جیسے کسی انسان کا نصف بدن عورت اور نصف بدن مرد جیسا دکھایا جائے۔“

یہ ایک طرف تصوف اور بھکتی کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے دوسری طرف ادبی طریقتہ کار سے بھی عدم توجہی ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا کہ یہ ایک علامتی کردار ہے اسے زندگی کی کھر در سی حقیقتوں سے ٹکرا کر نہیں پرکھنا چاہئے۔ جب ہم جوگی کے انجام کے بارے میں پڑھتے ہیں تو بہت سی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ جوگی نے تو ام بھائیوں کا قصہ سنانے

کے بعد

”ہر گرو کا نام لیا، پھر کلمہ جو پڑھا، دنیا سے چل بسا، دم نکل گیا، جوگی مسافرِ عدم بکینٹھ باسی رم گیا۔ جان عالم کا روتے روتے دم گیا۔ بیتا بانہ نعرۃ الفراق مارے، مرید چلیے جمع ہو کر گرو یا ہادی کہہ کر بہت پکارے، جوگی نے صدا نہ دی، منزل مقصود کی راہ لی۔ شہزادے نے بموجب وصیت غسل دیا، کفنایا، تبرک اتارتے اتارتے کچھ نہ پایا۔ آخر کار برابر کفن پھاڑ دیا۔ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مریدوں نے منڈھی میں گاڑ دیا۔ ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اڑھائی۔ وہ منت مندرا سیمہ و مصطلۃ خرقہ و جیہ اس کے منظور نظر کو دے کر جانشین کیا، مرید چیلوں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں سونپا، اسے ایک دلولہ آیا از سیر نو ان سب کو تلقین کیا کہ سُنو بچا جوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے مگر مرشد کامل کا جلوہ سائیں

۱۵ اردو کی نثری داستانیں ص ۴۳

۱۶ فناء عجائب نو لکچور ۱۲ داں ادیش ص ۱۸۱

منا

کا ظہور، ہر برگ و بار، لٹے پتے، گل و خار بلکہ در مسجد و دیوار کفشت سے
دیدہ دور میں میں عیاں ہے۔“

درویشوں، بھکتوں اور صوفیوں کے ایسے قصے ہندستان میں عام طور پر رائج تھے
اور ہندستانی عوام ان پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ بات کبیر کے بارے میں بہت مشہور ہے کہ کس طرح
اُن کی موت کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کی لاش میں کچھ بھی نہ ملا، چنانچہ یہی ہوا کہ
کفن برابر برابر پھاڑا گیا، آدھا چیلوں نے جلایا، بقیہ نصف مریدوں نے گاڑ دیا۔ میں اس
روایت پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ گمبھیریں کبیر کی سادھی بھی ہے اور
قبر بھی ہے اور مذکورہ بالا انداز سے بنی ہے۔ رجب علی بیگ نے اس تہذیبی روایت کا بڑی
خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ادب کا طریق کار بھی یہی ہے کہ جہاں وہ خارجی حقیقتوں سے
متاثر ہوتا ہے وہاں وہ معاشرتی عقائد کو بھی جذبے و تخیل کے توسط سے قبول کر لیتا ہے
اور ان کی بنیادوں پر اپنی بالائی عمارت کو تعمیر کرتا ہے۔ سرور نے یہی کیا ہے۔

سرور کی داستان بقول ضمیر حسن دہلوی کے ”کسی خاص ادبی تحریک اور سیاسی مقصد
کے تحت وجود میں نہیں آئی۔“ اس لئے اس میں کسی مقصد کی پابندی نہیں ہے جیسا کہ فورٹ ولیم
کالج کے زمانے کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ سرور کے سامنے کوئی مقصد تھا تو یہی
وہ لکھنو کی تہذیب، اس کی زبان اور محاورے کو پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کام میں وہ
یقیناً بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اُن کے بیانات میں مبالغہ ہے اور
بعض نقادوں نے سرور کی مبالغہ آمیزی کی بڑی مبالغہ آمیز طور پر مذمت کی ہے لیکن یہ
سچ ہے کہ ان مبالغوں میں ادب کا حسن چھپا ہوا ہے۔ ادب کسی مکان کی حقیقت نگاری کا نام
نہیں۔ ادیب کا کام یہ نہیں کہ خارجی حقیقتوں کی جامہ تصویر پیش کرے۔ ادیب حقیقت کو متحرک
اور زندہ شکل میں پیش کرتا ہے تاکہ پڑھنے والا اس کا اثر قبول کرے کیونکہ اس کی دلچسپی
اس کے جذباتی اور حیاتی رد عمل سے ہے۔ سرور نے ادبی تخلیق کے اس مفہوم کو صحیح طور
پر سمجھا تھا۔ ان کے یہاں جذباتی اظہار کے لئے تخیل کی مدد لی گئی ہے اور ایسی بھرپور کیفیت
پیدا ہوتی ہے جو پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ ملکہ نے قوت کے ذریعے جو خط بھیجا
ہے وہ اردو ادب میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ گویا دل کی بات دل سے کہی جا رہی ہے۔ سوز و
گداز ہے کہ عبارت کی رنگینی کے باوجود الفاظ و تراکیب کے پردے میں جھانکتا ہے اور

تمام تر کیفیت کے ساتھ پڑھنے والے پر ایک غیر معمولی اثر چھوڑتا ہے۔ ملکہ لکھتی ہے :-

”اے یار وفادار، صادق الاقرار، اللہ تجھے سلامت رکھے، شرح اشتیاق

داستان فراق قصہ طول طویل ہے، زندگی کا بکھیرا قلیل ہے۔ اگر ہماری نریت

منظور ہے جلد آؤ صورت دکھاؤ، نہیں تو تاسف کر دو گے، پچھتاؤ گے، تم نے

آنے میں اگر دیر کی تو ہم نے صدمہ ہجر سے تڑپ کر جان دی، مٹی کے ڈھیر پر

رودِ خاک اڑاؤ گے۔ مولف سہ

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے جان جاتی ہے اسی آؤ خدا کے واسطے

کوئی دم کا سینے میں دم مہمان ہے، نام کو جسم میں جان ہے، فلک نے ہماری

صحبت کا رشک کھایا۔ بے تفرقہ پردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنج

جدائی سے جان کھوتے ہیں، اتنا کبھی کا ہے کو کسی دن ہنسے تھے جیسا بلک بلک کر

فرقت کی راتوں میں روتے ہیں — تمھاری تقریر ہر دم بر زبان ہے، بے تصور

سے باتیں کئے چین کہاں ہے — ہمارے تڑپنے سے ہمایہ سخت تنگ ہے،

دولتِ زندان ہے، تیرہ و تنگ ہے — میر سہ

گریوں رہے گی بے ستاری تو ہو چکی زندگی ہماری

وحشتِ پیرامونِ حال ہے۔ ہر گھڑی فرقت کی ماہ ہے، جو پہرے وہ سال

ہے۔ تمھاری صورت ہر پہلو بردہ ہے، جس طرف دیکھا تو ہی تو ہے چشم

فرقت دیدہ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں چشمہ آبشار ہے۔ جن آنکھوں کو تم پر غم

نہ دیکھ سکتے تھے۔ اُن سے خون کے دریا بہہ گئے — دن رات کی صحبت

تمھارے ساتھ کی جب یاد آتی ہے، نیند اچھٹی ہے، بے چینی کی رات پہاڑ

ہو جاتی ہے، کالے ٹٹے نہیں کاٹتی ہے۔ چار پائی تنہائی میں پلنگ بن کر کاٹے

کھاتی ہے۔ خواب میں نیند کا خیال نہیں۔ کھانا ہجر میں حرام ہے حلال

نہیں۔ وہ سر جو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے اس کو سو سو بار بالش دبا لیں

پر دے دے پٹکا ہے —“

مذکورہ بالا خط مہر نگار کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انیسویں صدی

لے فسانہ عجائب۔ نو لکھنور ۱۲ داں اڈیشن ص ۲۰۱-۲۰۲

کی اردو نثر میں ملکہ مہر نگار کا یہ خط خاصے کی چیز ہے اور "فسانہ عجائب" کا بہترین نثر پارہ ہے۔ ان کے قلم میں بے ساختگی نمایاں ہے۔ یہ خط سرور نے سرشار ہو کر لکھا ہے۔ یہاں مقفی عبارت بھی گراں نہیں گزرتی۔ یہاں احساسات اور جذبات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اور ملکہ کا عاشق کا روپ بڑی خوبصورتی سے سامنے آتا ہے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد اگر ہم ان خطوط کا مطالعہ کریں جو سرور نے واجد علی شاہ کی ان بیگیاں کی طرف سے لکھے جو لکھنؤ سے کلکتہ نہ جاسکی تھیں۔ اور یہ خط بھی نہ لکھ سکتی تھیں۔ سرور نے ان خطوط میں بیگیاں کی قلبی کیفیات کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ مذکورہ بالا خط میں بھی تقریباً ایسی کیفیت ہے۔ جو ان خطوط سے واضح ہوتی ہے جو بیگیاں کے نام لکھے گئے — مثلاً: —

"دن رات بستر غم پر یہ قول ہمارا ہے قضا بد نام ہوگی صدمہ فراق نے مارا ہے — اگر یہی یل دنار ہے تو ناکام کام کا کام تمام ہے اب ملال دوری الم مہجوری اٹھانے کی تاب نہیں، تمام دن بیکراری گریہ و آزاری میں کٹتا ہے۔ رات کی بے تابی سے کلیجہ پھٹتا ہے۔ خیال میں خواب نہیں ہونٹوں پر جان تڑپ کر آئی ہے۔ جان عالم کی دہائی ہے تڑپتے ہیں، بلکتے ہیں، گھٹ گھٹ کے درو دیوار سے سر ٹپکتے ہیں، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں —"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: —

"آنکھیں نہیں دو پر نالے ہیں دن رات بے برسات بستے ہیں۔ سر کو کیونکر نہ ٹکرائیں۔ گردن میں باہنیں ڈالنے والا نہیں۔ چھاتی ہے اور غم کے بھالے ہیں دیکھنے بھالنے والا نہیں ہے

گریوں ہی رہے گی بیکراری تو ہو چکی زندگی ہماری

یوں پر جان ہے دم کوئی دم کا سینے میں مہمان ہے ؟
ان خطوں کی روشنی میں اگر مہر نگار کے خط کو پڑھا جائے تو اس کیفیت کا صحیح

۱۵ ایسے چند خطوط انشائے سرور میں ۳۴ سے ۴۳ تک ملتے ہیں۔

۱۶ انشائے سرور۔ نو لکھنؤ ۱۹۱۶ء ص ۳۸

۱۷ انشائے سرور اردو مقفی۔ نو لکھنؤ ۱۹۱۶ء ص ۳۵

اندازہ ہو سکتا ہے۔ مہرنگار سو فی صدی ہندستانی عاشق کی علامت ہے اور اس خط میں اپنے والہانہ جذبے کے ساتھ اظہار غم عشق کرتی ہے۔ سرور نے وضع عشق کو اس شاہانہ محفل میں بھی نبھانے کی کوشش کی ہے۔ جان عالم ملکہ سے خلوص بدلتا ہے۔ اس سے انیت اور قربت بھی محسوس کرتا ہے لیکن عشق وہ انجمن آرا سے کرتا ہے ملکہ کو سامنے سے ہٹایا جائے تو فسانہ عجائب ایک بے جان داستان ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے سرور عشق کی رسوائی نہ کرتے ہوئے ملکہ کے سینے میں ہندستانی عورت کا دل رکھ دیتے ہیں اور ملکہ عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اسی میں ملکہ مہرنگار کی انفرادیت چھپی ہوئی ہے اور اسے اردو ادب میں ایک زندہ جاوید کردار بنا دیتا ہے۔

’فسانہ عجائب‘ کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاسکتا ہے جب تک کہ ہم ان تنقیدوں کا بغور مطالعہ نہ کریں جو اس داستان کا ادبی تعین کرنے میں پیش پیش رہی ہیں۔ ۱۲۴۰ھ میں لکھی اور ۱۲۵۹ھ میں چھپنے والی یہ داستان اردو تنقید کی دنیا میں تقریباً سو سال سے موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد سرور کے وہ چند جملے ہیں، جن کا نفس داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بظاہر یہ بے ضرر جملے اردو ادب میں ایک ایسی بحث کا آغاز کرتے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ اس کے مقابلے کی داستانیں وجود میں آتی ہیں بلکہ فسانہ عجائب کے بارے میں ایک ایسے خیال کی بنیاد پڑتی ہے جو برسوں کے ادبی تجزیے کے بعد بھی تعصب سے بالاتر نہ ہو سکی۔ ایک طرح سے ان رایوں نے بیسویں صدی کی تنقید کو بھی متاثر کیا۔ سرور کی اس تصنیف کے بارے میں یوں تو خاصا اختلاف رائے رہا ہے لیکن اس امر میں قریب قریب سب کو اتفاق ہے کہ

”اگرچہ اس ہیج میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس افسانے کو بہ نظر شامی کسی کو سنائے اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندستان تھا وہاں چندے بود و باش کرتا، نصیحوں کو تلاش کرتا و تفصاحت کا دم بھرتا جیسا میرامن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیرا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن حصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر ایسی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ الخ۔“ فسانہ عجائب نوکسور

Accession Number... 7167

۱۲ واں اڈیشن ص ۱۔

Cont..... Class No.....

فسانہ عجائب ”زبان کے اعتبار سے لقصع، آورد اور رعایت لفظی کا ایک مجموعہ ہے اور غیر فطری نثر کی بین مثال۔

سرور نے جو سخن گسترانہ بات کہہ دی تھی اس کا رخ باغ و بہار واسلے میرامن کی طرف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ’فسانہ عجائب‘ کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ شرط لازمی قرار دی گئی کہ اس کو باغ و بہار سے ٹکرا کر دیکھا جائے۔ تنقید کا ایک میکانیکی انداز، جو بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سال تک بہت مقبول تھا، ’فسانہ عجائب‘ کو بھی اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معلموں نے روایتی طریقے سے دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کو ایک ہی چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اگر ان تنقیدی رایوں کو دیکھا جائے تو یہ پلڑا ہمیشہ باغ و بہار کی طرف جھکتا نظر آتا ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی بتائی جاتی ہے کہ باغ و بہار کی زبان صاف ستھری اور بول چال کی زبان ہے۔ اس میں صنائع لفظی و معنوی کی بھرمار نہیں ہے۔ اس میں لقصع کا نام و نشان نہیں۔ اور اس کے برخلاف فسانہ عجائب کی زبان روزمرہ کی زبان نہیں۔ یہ ادبی زبان ہے۔ لکھنؤ کی طبع شدہ تہذیب کی زبان ہے اس زبان میں آمد نہیں آورد ہے۔ یہ فطری ہونے کے بجائے اکتسابی اور عامیانه ہونے کے بجائے عالمانہ ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور باغ و بہار اور فسانہ عجائب کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”قریباً قریب ایک ہی زمانے کی پیداوار ہونے کے علاوہ یہ دونوں فسانے موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل متحد ہیں لیکن اس بارے میں بھی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہیں کہ اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کرنا ایک خاص دلچسپ ادبی شغل معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا ادبی شغل جس کے لئے کوئی صاحبِ ذوق مجبور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

در اصل یہ خالص ”ادبی شغل“ تھا جس نے دونوں کتابوں کو ایک ہی زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔

انیسویں صدی کے ادبی معیار کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ کسی ادب کی بڑائی کا

اندازہ اس کی زبان ہی کی بدولت کیا جاتا تھا۔ پرکھنے والوں کی ساری توجہ زبان و بیان پر ہی ہوتی تھی اور ادبی قدر و قیمت کے سارے فیصلے اسی بنیاد پر ہو جایا کرتے تھے۔ مواد کی اہمیت ادب میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان دو کتابوں کا موازنہ کیا گیا تو فیصلہ کرتے وقت فنی مطالبے ہی دزن رکھتے تھے اور ان میں سب سے زیادہ اہمیت زبان کو تھی۔ نئے معیاروں نے زبان کی سلاست اور روزمرہ کی سادگی کو ان سب پر مقدم سمجھا اور نتیجے کے طور پر اس کسوٹی پر جب کھرے کھوٹے کو پرکھا گیا تو فسانہ عجائب پوری نہ اتر سکی اور اس کا ذکر ادب میں محض باغ و بہار کی برتری ثابت کرنے کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔ گویا باغ و بہار کی اہمیت اور قدر و قیمت کو تسلیم کرانے کے لئے فسانہ عجائب کے سہارے کی ضرورت تھی **تَعْرِفُ الْأَشْيَاءَ بِأَصْنَافِهَا**۔

رجب علی بیگ کو ایسے نقاد بھی ملے جنہوں نے فسانہ عجائب کو الگ سے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی تعصب کی پرانی عینک کو اتار نہ سکے، اور انہوں نے بھی سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک اہم مضمون ”کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں“ کچھ اسی قسم کا انداز اختیار کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز بیان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسی قسم کی باتیں دہرائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

”اس کے مصنف رجب علی بیگ سرور، غازی الدین حیدر کے زمانے

میں پیدا ہوئے۔ اور غائب کی وفات سے ایک سال پہلے جاں بحق ہوئے۔

انہوں نے داجہ علی شاہ کی امیری اور اسیری دونوں دیکھیں“

یہ بیان سرسری ہے اس لئے سرور کا سن پیدائش ۱۲۰۰ھ کے آس پاس ہے۔ یہ زمانہ

آصف الدولہ تھا۔ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کی تاریخ ”وزیر نامے“ میں ۲ رجب

۱۲۲۹ھ بمطابق ۱۸۱۴ء ہے اور ان کا انتقال ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۹ اکتوبر

۱۸۲۷ء کو دیوالی کے دس کو ہوا۔ انہوں نے تیرہ سال آٹھ مہینے حکومت کی۔

رشید صاحب نے ایک فاضل اہل قلم کے حوالے سے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

”وہ آدمیوں کا حال نہیں لکھتے مرن چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ جلوائے بنوئی“

کڑیے، بالائی بیچنے والے بنے بقال سب اپنا اپنا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک

لے مضمون ”کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں“ مطبوعہ نقوش اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۲

بازار، سیرگاہیں، ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر بھی کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ بالا خانوں پر بھی جاتی ہے جہاں سے حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں۔ ہم چوک سے ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہرِ خوشاں نظر آتا ہے۔ —

”فسانہ عجائب کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی ہوئی ہے کہ اس کے دیباچے کو بھی داستان کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں ڈرامائی عنصر تلاش کیا گیا ہے یہ زیادتی شاید اس وجہ سے بھی ہوئی کہ سرور نے ”بیان لکھنو“ میں اس عہد کے لکھنو کی روح کو اسیر کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نقادوں کی توقعات اور بڑھ گئیں ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں ڈرامائیت کی کمی کی شکایت کی جاتی۔ لیکن ایسا نہیں کہ سرور کے نقادوں کو محض ”بیان لکھنو“ سے شکایت ہو۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں: —

”غرض فسانہ عجائب میں ہر جگہ لکڑیاں گیلی ہیں، بہادری، جادوگری، عشق بازی، ماحول کی عکاسی، کسی چیز میں تخیل نے جان نہیں ڈال دی ہے

اس وجہ سے ہر چیز بے لطف و بے اثر ہے۔ جس طرح مختلف عناصر بے لطف ہیں، اسی طرح ان کے امتزاج کی صورت، تنظیم میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔“

کلیم الدین احمد نے بار بار ”فسانہ عجائب“ میں لکڑیاں گیلی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میں اس کا مفہوم واضح طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن ادب کو اس طرح سیہ و پید کے خانوں میں رکھ کر جانچنا ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ میں تنقید کے اسی انداز سے اختلاف رکھتا ہوں۔ یہ اچھا ہوتا کہ ہمارے نقاد سرسری طور پر دیکھنے کے بجائے اس پر گہری نظر ڈالتے اور اس کا سنجیدگی سے تجزیہ کرتے۔

ادب کا یہ طریق کار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو لیکن سچ ہے کہ بہت عرصے تک اگر جھوٹ بھی بولا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے۔ بقول سرور ”جھوٹے کے سامنے سچا رو دیتا ہے۔“

میں چاہتا ہوں کہ ”فسانہ عجائب“ کا مطالعہ آزادانہ طور پر کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کی زبان سے قطع نظر اس کے نفس مضمون میں اتر کر دیکھا جائے۔

میں روایتی نقادوں کے رویے کا ذکر کرتے وقت ایک بات اور کہنا چاہتا

ہوں کہ رجب علی بیگ سرور کے یہ نقاد ہر کتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسین آزاد سے لے کر پروفیسر رشید احمد صدیقی تک — وہ نقاد جو ترقی پسند نظریات کے حامل ہیں اور وہ بھی جو غیر ترقی پسند ہیں — اس امر پر سب متفق ہیں کہ فسانہ عجائب کا مطالعہ کرنے کے لئے نفسِ مضمون کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ معنوی حیثیت سے سمجھنے کے بجائے ظاہری اور لفظی حیثیت سے دیکھ کر فیصلہ کر دینا کافی ہے کیونکہ اگر معنوی طور پر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو چند پہلو اور بھی نظر آتے ہیں، جن کی طرف میں آگے چل کر اشارہ بھی کروں گا اور بحث بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر معروضی طور پر 'فسانہ عجائب' کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں وقتی طور پر اس کی زبان کے اندر جھانک کر دیکھنا ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرور نے اپنی زبان کا ایسا پردہ ڈال دیا ہے جو اتنا بوجھل ہے کہ بعض اوقات اٹھائے نہیں اٹھتا اور بالآخر پڑھنے والا اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر قاری زبان سے آشنا ہوا تو وہ زبان اور بیان کے چٹخارے لینے لگتا ہے اور لفظوں اور فقرہوں کی صنائی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ فسانہ عجائب کی بار بار تصحیح کے دوران میں (اور اگر سخن دہلوی کے بیان کو سچ مان لیا جائے تو سرور نے اٹھارہ بار تصحیح کی) سرور نے سارا زور زبان پر دیا۔ گویا وہ پڑھنے والے پر اپنی لیاقت کا سکہ جمانا چاہتے تھے لیکن سکہ تو کیا جتا، بقول شخصے کہ لینے کے دینے پڑ گئے، اور ان کی یہ ریاضت کتاب کے حق میں اور مضرت ثابت ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ سرور کی جیسی زبان لکھنا اور سمجھنا معمولی بات نہیں اس لئے کہ اس زبان کو سمجھنے کے لئے بھی جس مبلغِ علم کی ضرورت ہے وہ سادہ زبان سمجھنے کے لئے ضروری نہیں ہے۔

میرامن نے "باغ و بہار" میں سادہ زبان کا انتخاب اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ اس زبان کو اردو کی مستند اور معیاری زبان کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے — اور یہ بھی کہ وہ رنگین عبارت لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ باغ و بہار ایک مخصوص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھوائی گئی تھی اور یہ ضرورت تھی فورٹ ولیم کالج کے طلباء کو ہندوستانی زبان سکھانے کی۔ یہ بات ہے سنہ ۱۲۱۵ھ کی — اس وقت

لے "ہم اب بھی کہتے ہیں کہ سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانہ عجائب کو درست کیا، جو فقرہ سست پایا اسے چیت کیا مگر غلطی نظر نہ آئی کئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی"۔ سرور سن ۱۲۸۱ھ — ۵۵

اُردو نشر کی کتابیں محدودے چند تھیں اور وہ بھی ایسی ادبی زبان میں تھیں کہ وہ طلباء اُن سے فیضیاب نہ ہو سکتے تھے جن کی مادری زبان اُردو نہ ہو۔ سر جان گلکرسٹ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے :-

”ایسی ہندوستانی کتابوں کے عام فقدان نے، جن پر کچھ بھی بھروسہ کیا جاسکے مجھے فوری طور پر حب ذیل کتابیں چھاپنے پر مجبور کر دیا ہے..... اور کلکتہ کے تمام چھاپے خانوں کو میں نے اس کام پر لگا دیا ہے“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ :-

”ابھی ہندوستانی نشر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے سکوں۔“

فورٹ ولیم کالج کا مقصد بھی یہی تھا اور اس کی وضاحت گورنر جنرل کے ایک خط سے ہوتی ہے جس میں اس نے صاف طور پر لکھا تھا کہ

”مسٹر گل کرسٹ کی زیر نگرانی ہندوستانی بول چال کی زبان میں (نووارد رائی ٹر) جو مہارت حاصل کریں گے، اس کی بدولت کپنی کی ملازمت کے دوران میں اپنے منصب کے تمام فرائض بھی وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے“

سر جان گلکرسٹ نے اسی لئے یہ کام اپنے ذمے لیا اور چند ایسی کتابیں خود تیار کروائیں جن سے انگریز طالب علم فیضیاب ہو سکیں۔ اس لئے میرامن نے بھی اُن کی فرمائش پر ”نو طرز مرصع“ کو آسان اور بول چال کی زبان میں لکھا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ اس اصل مقصد کو کیسے نظر سے اوجھل ہونے دیتے۔

”فسانہ عجائب“ کے مصنف کے سامنے ایسا کوئی معیار اور ایسی کوئی فوری ضرورت یا مجبوری نہ تھی۔ وہ کتاب لکھتے وقت اپنے زمانے کے معیاروں کو ہی سامنے رکھ سکتے

۱۵ گل کرسٹ اور اس کا عہد - محمد عتیق صدیقی - انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۰ء ص ۱۲۱

۱۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً

تھے اور انھوں نے اس کا خیال رکھا۔ اسی لئے انھوں نے اپنے قصے کا ڈھانچا بھی خود ہی بنایا۔ اور یہ ڈھانچہ آگے چل کر ان کو فسانہ عجائب لکھنے پر مجبور بھی کرتا ہے اور اس کی طرف سرور نے "سبب تالیف کتاب" میں اشارہ بھی کیا ہے :-

"اس زمرے میں ایک آشنائے با مزا فقیر کے تھے وہ بولے کہ "اس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو — فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب نہ جانا چند کلمے گوش گزار کئے — وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں کہا "اگر بہ طبعی تمام تو اس پراگندہ تقریر کو از آغاز تا انجام قصے کے طور پر زبان اردو میں فراہم و تحریر کرے تو نہایت منظور نظر اہل بصر ہو —"

آخر میں لکھتے ہیں :-

"قصہ یہ دلچسپ بے نظیر ہے مطالعے سے خاطر خطیر اگر شاد ہو تو عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔ اس کے لکھنے میں نمود نظم و نثر کا خیال نہ تھا شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی یا فارسی کا مشکل نظر آیا۔ اپنے نزدیک اس کو دور کیا اور جو کلمہ سہل متنع روزمرے یا محاورے کا تھا رہنے دیا —"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے سامنے نفسِ مضمون پر زیادہ زور تھا۔ وہ یہ کتاب میرامن سے مقابلہ کرنے کے لئے نہیں لکھنا چاہتے تھے بلکہ ایک اچھا طبع زاد قصہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس پلاٹ کی خوبصورتی کے لئے یہ دلیل بھی کچھ کم نہیں کہ انیسویں صدی کے اکثر و بیشتر قصے اسی پلاٹ کے ارد گرد گھومتے تھے اور اس کی سب سے اچھی مثال تو خود سخن دہلوی کی تصنیف "سردش سخن" ہے۔ نواب حیدر علی خاں کی تصنیف "جادہ تسخیر" کا تانا بانا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ خلیل الرحمان داؤدی، سردش سخن کے مقدمے میں لکھتے ہیں :-

پرانے آدمی ضعیف۔ پھر کہاں اُن کی تالیف اور کہاں ہماری تصنیف ہم نوجوان وہ صدباراں دیدہ سنجیدہ و نمیدہ پیرکین، پھر کہاں فسانہ عجائب اور کہاں سرودش سخن، مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہمسری، ذرے کو سہا سے کیا برابری، جو لفظ و نشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے مگر صاحب موصوف نے جو اپنی تالیف میں بیچارے میرامن دہلوی کو بنایا ہے اپنی زبان کی تیزی سے اُس صاف گو کو ایک آدھ کڑا فقرہ سنایا ہے تو ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانہ عجائب کو درست کیا جو فقرہ سُست پایا، اسے چُست کیا مگر غلطی نظر نہ آئی۔ کئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی۔ قصہ اپنا از سر نو ملاحظہ فرمائیں۔ ابتدا سے انتہا تک دیکھ جائیں اور سمجھیں کہ کئی جگہ تانیث کو تذکیر لکھا ہے اور تذکیر کو تانیث باندھا ہے ارباب بنیش پر سب آشکارا ہے حاجت تصریح نہیں اکثر غلط ہے بالکل صحیح نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلیٰ کی زبان نہیں جانتا، تذکیر و تانیث کو نہیں پہچانتا، جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا وہ فسانہ کیا لکھے۔

سخن دہلوی اپنے آپ کو "حضرت غالب مدظلہ العالی کا نواسہ اور شاگرد" کہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب سرور کے قائل تھے۔ غالب اپنے ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں :-

"تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ لیا کرو اور دبتے ہوئے حروف بھی اُن سے پوچھ لیا کرو۔"

سخن کی تذکیر و تانیث کی شکایت یوں بھی بے جا ہے اس لئے کہ اس امر میں لکھنؤ اور دہلی کا اختلاف پر اتفاق ہے۔

سخن کی "سرودش سخن" رجب علی بیگ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی لیکن انھوں نے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا بلکہ ہلکے پھلکے اشارے کئے جن کا اطلاق سخن دہلوی پر بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء میں سرور کے ایک شاگرد محمد جعفر علی شیون کا کوری نے "طلسم حیرت" لکھ کر سخن دہلوی کا جواب دیا اور سرور کی

پر زور حمایت کی۔ اور اشاروں کنایوں میں سخن دہلوی پر حملے کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-
 ”بالکل صاف صاف کہہ نہیں سکتا، خلاف کہہ نہیں سکتا کہ اس میں
 مد مقابل کی قلمی کھلتی ہے معیوب ہے بند بند لکھنا خوب ہے۔ راقم اسیر
 تشویش ہے۔ دستِ تحریر دریش ہے کہ جن حضور نے سرور پر طعن تشنیع
 میں ذہنِ کند کی تیزی دکھائی ان کو کیا سمائی ہے۔ صاحبِ من جب آپ کے
 ہم وطن پر اس غضب کا فقرہ جھونکا کہ آپ سے ہوا خواہوں نے جھونکا کھایا۔
 یہ بُرا دن پیش آیا۔ شیخی برباد کر دی۔ بارے ظرافت کی طبیعت شاد کر دی پھر
 آپ کے مقدمے میں تو کچھ سخن نہیں گو بندہ ان پر طعنہ زن نہیں پر غالب یوں
 ہے کہ اگر حضرت کے استاد طنز کرتے تو نیر جو ہر شمشیر زبانی کو اختر تاثیر
 بناتے گو کہ آپ کے نزدیک برجِ اسد پر ہے اپنی حد پر ہے گا و زمین دکھا
 دیتا آہو گیری کا مزا چکھا دیتا مگر جائے شفقت ہے کہنے والوں کو مقامِ گفت
 ہے کہ استاد فصاحت بنیاد بلبل ہزار داستان طوطی ہندستان نے گلزار
 سرور پر باغ باغ ہو کر وہ رنگین تقریظ فرمائی کہ باغِ دہار پر خزاں آئی
 پھر حضور نے کیا سمجھ کے کلام سرور میں شاخ نکالی، نکتہ چینی کی نظر سے آنکھ
 ڈالی۔ چرخِ حقہ باز نے تازہ گل کھلایا۔ کل ہی وہ تھا۔ آج یہ ماجرا نظر آیا کہ
 گڑ گڑا ہی رہے چیلے شکر ہو گئے۔ شاگردِ اسادی کا دم بھرنے لگے اپنی تحریر پر
 مرنے لگے۔ یہ لیاقت اور سرور پر زبانِ طعن دراز مثل مشہور ہے یہ منہ اور
 نواب کا زیر انداز۔ ابھی کچھ کہوں تو بیچ در بیچ ہو کر کٹے جھول جھاں چھوڑ
 لکھنو سے ٹیکے اور چونکہ آجکل آپ کی طلاق کا بیخرا کھلا ہوا ہے لیاقت
 کا ڈر با کھلا ہے فقرہ کا سقم تحریر ٹاپا جائے قرینہ لڑایا جائے پر بیضہ سے پائے
 اپنا سر کھائے۔ اے صاحبِ آپ ابھی اندھے کے ملوک ہیں دو ہی دن گزرے
 ہوں گے کہ دولت خانے سے قدمِ خاکی فرماتے گلزار لکھنو کی بلبل دیکھ عقل
 کے طوطے اڑائے، صیغوں کے الحان متروک ہیں یہاں کی زبان میں لبنی

۱۵ قصہ طلسم حیرت - محمد جعفر علی شیون لکھنؤی - مطبع نامی منشی نوکثور - چوتھا اڈیشن

چوڑے ہانکے بے کڑیز کھائے پرکٹے اڑاٹے گو سر بہ گریباں پیشانی میانی سے
 آشنا اپنی دوخانی کھڑکی جھانکے، غالباً اگر چندے یہاں اڑا آپ کا اور رہا
 ہم صفر بریز بریز بولیں گے آپ ایسا تیز لڑیں گے۔“
 اور طلسم حیرت کے بعد یہ بحث چلتی رہی اور لوگ اسی انداز کی داستانیں قلم کرتے رہے۔
 لیکن طلسم حیرت کی داستان پلاٹ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ یہ بھی لکھنؤ کی معاشرت کا بہت
 خوبصورت مرقع پیش کرتی ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے طلسم حیرت منفرد ہے۔ تمام تر کتاب
 ضلع جگت میں ہے شاید ہی کوئی جملہ ہو جو رعایت لفظی سے عاری ہو۔ اردو نثر میں صنائع و
 بدائع کی فراوانی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں :-
 ”طلسم حیرت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر
 تک لفظی رعایتوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس میں سے نکلنے کی کوشش جال
 کو اور مضبوط بنا دیتی ہے، اس لئے کہ ذہن کو دھماکہ یا پھلانگ لگا کر
 کوئی راہ فرار تلاش بھی کرے تو فوراً کسی اور جال کے حلقے اسے اسیر کر لیتے
 ہیں۔ ایک تو اس کو بات اختصار کے ساتھ کرنی نہیں آتی اور دوسرے وہ
 سیدھا راستہ چلنا نہیں جانتا۔ چھوٹی سی بات کو بلا ضرورت پھیلاتا ہے اور
 سیدھی سی بات کو پیچیدہ بنا کر کہتا ہے اور ان دونوں کاموں میں لفظی رعایتوں
 کا ایسا التزام رکھتا ہے کہ باہر شاید“
 ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں :-

”طلسم حیرت تمام کا تمام ضلع جگت میں ہے اردو نثر میں کوئی کتاب
 ضلع جگت میں اس قدر کامیاب نہیں جتنی کہ طلسم حیرت“
 یہ کتاب لکھنؤ کا سکھ جانے کے لئے لکھی گئی۔ شیون نے سرور کی شاگردی کا
 حق تو ادا کیا ہے مقفے و مسجع نثر کے فن میں اپنی استاد کا سکھ بھی جمایا ہے کہ اس کی
 رعایتوں کو دیکھ کر سرور کی نثر بھی سادہ معلوم ہوتی ہے۔
 طلسم حیرت میں نہ تو داستان کی لذت ہے اور نہ کہ دار نگاری کے مرقعے ہیں لیکن

۱۷ ہماری داستانیں - وقار عظیم ۱۳۳۳ء

۱۸ شمالی ہند میں اردو کی نثری داستانیں - انجمن ترقی اردو کراچی ۲۵۵

زبان و بیان نے اسے اردو کی ایک منفرد کتاب بنادیا ہے۔

اسی زمانے میں اسی قبیل کی ایک اور داستان وجود میں۔ دالی رامپور کے بھائی
نواب حیدر علی خاں نے "جادہ تسخیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء
میں چھپی بقول مصنف "سنہ ۱۲۸۳ھ میں اس قصہ رنگین اور فسانہ دلنشین کو شروع
کیا۔ مدتوں فکر و اندیشے سے کام لیا، تسلیم سہوانی نے قطعہ تاریخ لکھا۔

یہ کتاب ایسی چھپی فضل خدا سے عمدہ بند تعریف میں جس کی لب تقریر ہوا
لکھو تسلیم سن طبع اگر لکھتا ہے جوئے تسخیر، مگر 'جادہ تسخیر' ہوا

نواب حیدر علی خاں نے "سبب تالیف کتاب" میں گوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے
کسی طرف اشارہ مقصود ہو لیکن اس کے خاتمۃ الطبع میں تسلیم سہوانی نے یہ لکھ دیا کہ
"حق تو یہ ہے کہ مصنف نے اپنا نیا سکہ بٹھایا مرزا رجب علی بیگ منظور

سرور کا پرانا نقش اٹھایا وہ ہندی کی چندی نکال کر عجب نقشہ اتارا ہے
کہ مدعی تک کہتے ہیں کہ گھر بیٹھے میدان مارا ہے۔ — بہر حال یہ کتاب اپنی
خوبیوں میں یکتا ہے فرد ہے آگے اس کے اعجوبگی کے فسانہ عجائب گرد ہے
کارنامہ ہے۔"

"جادہ تسخیر" کا پلاٹ فسانہ عجائب سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ صاف معلوم
ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں فسانہ عجائب کا تصور غالب ہے جس طرح فسانہ عجائب
میں دیوؤں اور جادوگروں سے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی خورشید گوہر پوش اسی
طرح دشمن کے جھکے چھڑا کر ایک کے بدلے دو کو لے کر لوٹتا ہے۔

"جادہ تسخیر" کی زبان بڑی صاف ستھری، روزمرہ اور محاورہ روانی سے استعمال
ہوا ہے۔ لفظی رعایتیں اور قافیے کا اہتمام بھی، لیکن آورد سے زیادہ آمد معلوم ہوتی ہے۔
"وزیر زادی نے کہا کون سادخت ہے جسے ہوا نہیں لگی۔ ظاہر میں ب

پار سائی کا دم بھرتے ہیں۔ بڑی بڑی نیک زنیں بڑی بڑی عصمت دالیاں

۱۵ جادہ تسخیر حیدر علی خاں۔ مطبع نامی نو لکھنؤ ۱۲۸۹ھ ۳۶۶

۳۶۵-۳۶۴

۱۴۲۵

"

"

"

۵۲

"

"

"

۵۳

برقع میں چھپ چڑھے کھاتی ہیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں نوالے نوش کرتی ہیں۔
حضور برہم نہ ہوں دشمنوں کا جیتا نہ ہوگا آپ کا چاہیتا اوروں کا چاہیتا نہ ہوگا۔
لیجئے مبارک یہ حضور کی شادی کا بیان ہے اللہ رکھو خانہ آبادی کا ساماں ہے۔
بادشاہ نے شاہزادے کو خلعت سرفرازی سے سرفراز کیا۔ شادی کی تاکید کی
خانہ دامادی کا حکم دیا۔

میں نے فسانہ عجائب کے ضمن میں تین اہم داستانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے
شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کا عکس قبول کیا تھا۔ سرور نے اپنی اس داستان کو ناول
سے قریب کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایک مربوط پلاٹ کے ذریعہ اپنے قصے کو پیش کیا
بلکہ اس میں کردار نگاری کے نونے بھی پیش کئے۔ اس سے قبل داستانوں میں کردار نگاری کا
کوئی وجود نہ تھا۔ فسانہ عجائب سے متاثر ہو کر جو داستانیں لکھی گئیں ان کے مصنفوں نے بھی
اس بات کا خیال رکھا۔ غالباً اسی تہمت کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کے پلاٹ ”فسانہ عجائب“ سے
غیر معمولی مماثلت رکھتے تھے۔ اور صرف پلاٹ ہی نہیں بلکہ کرداروں میں بھی اُن کی جھلک نظر
آتی ہے۔ مثلاً جان عالم اور آرام دل (سروش سخن کا ہیرو) میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔
جس طرح جان عالم کی اتفاقاً سربراہی ملکہ مہرنگار سے ملاقات ہوتی ہے اور اس سے شادی
کا وعدہ کر کے انجن آرا کی جستجو میں چلا جاتا ہے، اسی طرح آرام دل کی ملاقات بھی صنوبر شہزادی
سے ہوتی ہے اور وہ بھی وعدہ کر کے اپنی منزل پر حسن افروز کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔
جس طرح فسانہ عجائب کے آخری حصے میں سرور نے جان عالم کو سمندر کے سفر پر روانہ کیا
اسی طرح سروش سخن میں بھی آرام دل کو ”لہر آتی ہے۔“
فسانہ عجائب کے کرداروں کی کمزوریاں سروش سخن میں مستعار ہیں۔ یہی حال جادہ سخن
کے کرداروں کا بھی ہے۔ ان میں بھی یہ مماثلت نمایاں ہے۔

فسانہ عجائب کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے اس کے چند کرداروں کا مطالعہ ضروری
ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ یہ ایک مربوط قصہ ہے جس میں مختلف کردار اپنے اپنے
نرا دیوں سے واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ داستانوں میں چونکہ زور قصے اور اس سے
متعلق واقعات پر ہوتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ افراد قصہ میں سے چند ایک کا تجزیہ
کیا جائے۔ قصہ گو کا مقصد کردار نگاری ہوتا ہی نہیں بلکہ قصہ گو تو اُن سے اپنے قصے کو

آگے بڑھانے میں مدد لیتا ہے۔

فسانہ عجائب ایک منفرد داستان ہے جس میں محدود سے چند کردار ہیں لیکن ان کرداروں میں محض چند کردار ہیں جن پر سرور نے پوری توجہ صرف کی ہے۔ سرور نے کرداروں کا بیان کمائی کے اندر اس طرح سمودیا ہے کہ انھیں اشارہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور ہم انھیں پہچان لیتے ہیں۔

فسانہ عجائب میں مندرجہ ذیل کردار نظر آتے ہیں:۔

- ۱۔ جان عالم - ۲۔ ماہ طلعت - ۳۔ ملکہ مہرنگار - ۴۔ انجن آرا - ۵۔ دنیہ زادہ۔
- ۶۔ چڑیا - ۷۔ دیو - ۸۔ چڑیا کی بیوی - ۹۔ سوداگر - ۱۰۔ ملکہ کا باپ - ۱۱۔ توتا۔
- ۱۲۔ کالا دیو - ۱۳۔ سفید دیو - ۱۴۔ جوگی۔

ان کے علاوہ ضمنی قصوں میں بھی کچھ بڑے جاندار کردار ملتے ہیں جیسے فسانہ شاہ یمن میں 'خدا دوست' کا کردار — لیکن یہ کردار نفس داستان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان پر بحث کا یہ وقت نہیں ہے۔

اس معاملہ میں قطعی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ فسانہ عجائب کا سب سے جاندار کردار ملکہ مہرنگار کا ہے۔ یہ کردار گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ یہ ایک عاشق کا کردار ہے۔ عورت کا یہ روپ ہندوستانی ادبیات کی روایات میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے سرور کی یہ بدعت اجتہادی حیثیت نہیں رکھتی۔

ملکہ مہرنگار سرتاپا عاشق ہے۔ وہ ایک نظر میں جان عالم پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ ملکہ کوئی دل پھینک قسم کی عورت نہیں ہے۔ وہ دل کے ساتھ دماغ بھی رکھتی ہے۔ باپ کے اصرار کے باوجود شادی نہیں کرتی۔ کیونکہ باپ کی فقیری کی بنا پر وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرتی ہے اور باپ کی کمی کو سلطنت کے امور میں پورا کرتی ہے۔ اس کے سامنے شادی ایک مسئلہ ہو کر آتی ہے کہ اس حکومت کے کاروبار کا کیا ہو گا اور یہ سوچ کر اپنی ذات کی قربانی پیش کرتی ہے۔ لیکن جان عالم پر عاشق ہونے کے بعد اسے دنیا دماغ کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ تن من دھن اس پر نثار کرتی ہے اور پھر ہم ایسے عاشق کو دیکھتے ہیں جس کا راستہ مصلحت نہیں روک سکتی۔ وہ سلطنت پر ٹھوکر ماردیتی ہے اور عشق عاشقی کی روایات کو تازہ کرتی ہے لیکن اس عشق میں دل کے ساتھ اس کا دماغ بھی ہم سفر ہے، وہ عقل کی رہبری کو تسلیم کرتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ

جانِ عالم انجنِ آرا کے عشق میں گھر سے نکلا ہے تو اسے مایوسی اور اندھیرا نظر آتا ہے کیونکہ اس نے بھی انجنِ آرا کے حُسن کا چہرہ چائُن رکھا ہے۔

لیکن جانِ عالم اس کے حُسن سے متاثر نہیں ہوا تو کیا، اس کے حُسنِ سیرت کی چھاپ تو پڑی۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ ایک قابلِ قدر ہے۔ یہ رفیقِ حیات بن سکتی ہے۔ یہاں محض اس کی محبت کی قدر کا احساس نہیں ہے بلکہ اس کی ذات کا انکشاف ہے، جو مختصر سی ملاقات میں ہو جاتی ہے اور پہلی مدد جو بر بنائے دور اندیشی کرتی ہے وہ یہی کہ اپنے باپ سے ملنے کے لئے کہتی ہے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اس کا عاملِ باپ اس کی مدد کر سکتا ہے اور اس کی منزل کی کٹھنایوں کو دور کر سکتا ہے۔

جانِ عالم اپنی منزل پر روانہ ہو جاتا ہے اگر ملکہ مہر نگار قدیم داستان کا کردار ہوتی تو وہ اُسے بھول جاتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتی ہے ایسے ہی جیسے کوئی عاشق تڑپتا ہے۔ ملکہ مہر نگار کے لئے ہجر کے یہ دن بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ جانِ عالم کی یاد میں گزارتی ہے، سہیلیوں کی کوئی تسلی اس کو سکون نہیں دیتی۔

’فسانہ عجائب‘ اس روش کی عام داستانوں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ یہاں عاشق سچا عاشق ہے۔ ملکہ مہر نگار جانتی ہے کہ اس کے ساتھ شہزادہ شادی کر سکتا ہے، سو سکتا ہے لیکن عشق کسی اور سے کرتا ہے۔ وہ اس عہد کے مردِ عاشق کی طرح ہر جاؤں نہیں ہے اس کے یہاں مکمل پیردگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے سامنے آزمائشیں بھی سخت آتی ہیں۔

مہر نگار کا کردار اردو ادب کے منفرد کرداروں میں مانا جاتا ہے۔ تاریخ ادبِ اردو کے مصنف نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ :-

”اس میں شک نہیں کہ ملکہ مہر نگار کے کرکٹلر میں سچی محبت، بادنائی،

دلیری، معاملہ فہمی، جرات اور متانت دہر بادی کو نہایت واضح طریقے سے

دکھایا ہے۔“

ڈاکٹر گیان چند فسانہ عجائب میں کردار نگاروں سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں کہ :-

”کردار نگاری کی جان مہر نگار کا کردار ہے۔“

سید ضمیر حسن دہلوی لکھتے ہیں۔

”ملکہ مہر نگار کا کردار ہر اعتبار سے بخت اور فن کا رانہ کردار ہے اور ہمارے ادب میں اس سے پہلے آنا جاندار کردار اگر کوئی ہے تو صرف رانی کیشی کا کردار ہے جو انشا اللہ خاں انشا کی لافانی تخلیق ہے۔“

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں۔

سرور نے ملکہ مہر نگار کے دل آویز کردار کو اس چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ وہ فسانہ عجائب کو مسحور کر لیتی ہے۔“

ملکہ مہر نگار کے کردار کے جاندار ہونے کے باوجود دورائیں نہیں ہیں لیکن اس کے تجزیے میں ضرور اختلاف ہے اور یہ بات فطری بھی ہے اس لئے اس عظیم قصے کا یہ کردار ایک دیوار ہے جس کے سامنے عام انسان بولنے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فسانہ عجائب کے نقاد اس کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

سید ضمیر حسن دہلوی جب اس کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں گویا۔

”یہ کردار لکھنوی عورتوں کے اس سلیم الطبع فرقے کی نمایندگی کرتا ہے جو

خالص مشرقی اقدار کا حامل بھولا بھالا اور معصوم ہے جو مرد کی حماقتوں اور

کج فہمیوں کو جانتا سمجھتا اور دیکھتا ہے لیکن معاف کر دیتا ہے کیونکہ مرد کی

پرستش اس کی سرشت میں داخل ہے۔“

یہ تجزیہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملکہ مہر نگار کا کردار ایک

انفعالی عورت کا کردار نہیں ہے۔ وہ متحرک اور فعال شخصیت ہے۔ مرد کی پرستش

اس کی فطرت نہیں ہے۔ وہ مرد کی پرستش محض اس لئے نہیں کرتی کہ وہ ایک مثالی مشرقی

عورت بنا چاہتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ عاشق ہے جسے اپنے محبوب سے والہانہ محبت

۱۔ اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند ۲۵

۲۔ ”فسانہ عجائب“ کا تنقیدی مطالعہ۔ سید ضمیر حسن دہلوی۔ ص ۶۹-۷۰

۳۔ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص ۲۰۹

۴۔ فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۸

ہے۔ وہ اس کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہے۔

ملکہ دل ہی نہیں دماغ بھی رکھتی ہے اور یہاں وہ عام عاشق سے زرا مختلف بھی ہو جاتی ہے۔ وہ جان عالم کی حماقتوں اور کج فہمیوں کو اس لئے معاف نہیں کرتی کہ مرد کی پرستش اس کے لئے جزو ایمان ہے بلکہ اس لئے کہ وہ جان عالم سے محبت کرتی ہے۔ سرور نے ملکہ کے کردار کو خوب اچھی طرح سوچا سمجھا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کہیں انھوں نے جان عالم کو اس کے عشق میں مبتلا کر دیا ہوتا کہ وہ انجن آرا کا خیال چھوڑ دیتا تو ملکہ مہرنگار کے جسم سے اس کی روح نکل جاتی اور یہ کردار نہ صرف اپنی عظمت کو کھو دیتا بلکہ بے جان بھی ہو جاتا۔ جان عالم کا انجن آرا سے عشق ہونا ہی ملکہ کی شخصیت پر جلا کرتا ہے۔ اس کے اندر سوز و گداز بھی پیدا ہوتا ہے اور درد و کرب بھی۔ اور یہی عاشق کے اندر بڑاٹی پیدا کرتا ہے اور یہی بڑاٹی ہے کہ جس نے اس کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔ جب جان عالم اور انجن آرا کی سواری ملکہ کے مکان پر پہنچتی ہے اور انجن آرا اسے گلے لگاتی ہے اس وقت ملکہ آبدیدہ ہو کر بولی —

”تم نے مجھے محبوب کیا، میں فقیر کی بیٹی، تم شہزادی — ہر چند شاہ و گدا

دونوں بندہ خدا ہیں الا تمہارے قدم آنکھوں پر رکھوں تو بجا ہے — آپ

کے آنے سے مجھے بڑا افتخار ہوا —“

اور انجن آرا ملکہ کو اپنا رقیب نہیں، رفیق بنا لیتی ہے اور ملکہ بھی آخر تک رفاقت کا حق ادا کرتی ہے۔ سرور نے ملکہ کے کردار کا تصور مجموعی طور پر کیا تھا۔ یہ کردار ڈھلا ڈھلایا اُن کے ذہن میں اُٹھا تھا اور بڑے کردار عموماً اسی طرح مصنف کے ذہن میں داخل ہوتے ہیں اور سرور نے جیسے ہی ملکہ مہرنگار کو اپنی تمام تر بھرپور شخصیت کے ساتھ دیکھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ انجن آرا کو بھول جاتے ہیں لیکن مہرنگار جُدا نہیں ہوتی۔ جہاز کے ٹوٹنے پر وہ مقید ہو کر سامنے آتی ہے اور سرور انجن آرا کو بھول جاتے ہیں۔ جان عالم کا کردار خاصا جاندار کردار ہے اور انسانی شخصیت کے مختلف مظاہر کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ایک عاشق اور جانثار ہے۔ حالانکہ اپنی تلون مزاجی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے وہ کسی جگہ ٹھہرتا نہیں، نہ اسے کوئی گھنی چھاؤں

بیٹھنے پر اُکساتی ہے۔

جانِ عالم مصیبتیں جھیلے جھیلے خطہٴ زرنگار میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمنِ آرا جس کے لئے اس نے اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں، اُسے دیو اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس وقت وہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس جہاد پر روانہ ہو جاتا ہے۔

قسمت داستان کے ہیرو کا ساتھ دیتی ہے لیکن خطرات اس کے انسانی ذہن کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

جانِ عالم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ناعاقبت اندیش ہے اور اس ناعاقبت اندیشی کی سزا اسے چار بار بھگتنی پڑتی ہے۔

● پہلی بار جب وہ بے سوچے سمجھے تالاب میں پھلانگ لگاتا ہے۔

● دوسری بار جب وہ وزیرِ زادے کو روح کو دوسرے کے قالب میں لے جانے کا عمل بتاتا ہے۔

● تیسری بار جب وہ نقشِ سلیمانی کو خواص کے حوالے کر دیتا ہے۔

● چوتھی بار جب وہ دریا کی سیر کو جاتا ہے اور ملکہ کے منہ کرنے کے باوجود کشتی پر سوار ہو جاتا ہے۔

یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ جانِ عالم کو ملکہ مہرنگار مل جاتی ہے اور اس محبمِ دل کے لئے پاسبانِ عقل کا کام کرتی ہے اور اس کو پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود جانِ عالم بڑی خوبیوں کا مالک بھی ہے۔

جانِ عالم کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:-

”نازوں کا پالا ہوا، شہزادہ، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، دارِ ثنّت و تاج

ہے اس کو تمام ضروری علوم و فنون کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر دی گئی ہے۔

وہ نہایت لائق، خوش گفتار، طاقت ور اور فنونِ جنگ کا ماہر ہے اور

اس کی نمایاں خصوصیتیں دو ہیں۔ خوبصورتی اور خوش گفتاری۔“

اسی کردار کے بارے میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ یہ کردار،

آخری تاجدارِ اودھ و اجد علی شاہ المعروف بہ جانِ عالم کے نام کی رعایت سے پیش کیا

گیا ہے۔ لیکن خارجی شواہد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جہاں تک مذکورہ بالا خصوصیت کا تعلق ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو عام طور پر ہر دشمن زادے کی شخصیت میں دکھائی جاتی ہے جیسا کہ میر حسن کے دشمن زادے بے نظیر میں کم و بیش ایسی خوبیاں ہیں۔

اس کے علاوہ کہیں ایسا ثابت نہیں ہوتا کہ اس داستان کے ہیرو کے نام میں کسی منزل پر کوئی تبدیلی ہوئی۔ یہ داستان ۱۲۴۰ھ کی ہے۔ اور داستان کا نقش اول امجد علی شاہ کی تخت نشینی سے ۱۸ برس پہلے کا ہے۔ میرے خیال سے نام کی یہ مماثلت محض اتفاقی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ سرور کو اس مماثلت کا احساس واجد علی شاہ کے عہد میں بھی نہیں ہوا، ورنہ وہ اس کردار کی بعض کمزوریوں کو یقیناً اس زمانے میں دور کر دیتے اور نفسِ کردار میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا کرتے۔ جب ملکہ مہر نگار، جان عالم کو وزیر زادے کے ساتھ خلا ملا دیکھ کر اس کو خبردار کرتی ہے اور جان عالم اس کی بات کو نہیں مانتے تو ملکہ انجن آرا سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

”برائے خدا انصاف تو کیجئے، خاطر کی نہ لیجئے، ان کے حق میں کسی بیوقوف کو تامل ہوگا۔ آپ اگر عقل کے دشمن نہ ہوتے تو کیوں حوض میں کود کر ساحرہ کی قید میں پھنستے؟“

اس کے بعد دریا کی سیر کے وقت جب ملکہ منع کرتی ہے اور جان عالم نہیں مانتا تو کہتی ہے :-

”خفقان کیسا تمہارے دشمنوں کو مایہ خویا ہے“

پھر جب جان عالم اپنے قابِ اصلی میں آجاتا ہے تو ملکہ انجن آرا کو بلا کر کہتی ہے :-

”لو صاحبِ مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہماری حرمت و آبرو کو

بچایا بچھڑے سے ملایا، یہ آپ کا احمق الذی شہزادہ ہے۔“

یہ انداز بیان یقیناً ایسا تھا کہ سرور اس میں تبدیلی کر سکتے تھے اگر ان کے ذہن

۱۔ فائدہ عجائب۔ نو لکھنور ۱۲۱۷ء اڈیشن ص ۱۲۴

۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۶۹

۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۵۳

میں واجد علی شاہ کا خیال بھی آتا تو یہ کوئی مشکل نہ تھا۔

فسانہ عجائب کی ہیروئن انجن آراہی کو کتنا چاہئے اس لئے کہ قصے کے پلاٹ کا بھی یہی تقاضا ہے۔ انجن آرا سیدھا سادا محبوب کا کردار ہے، جس سے محبت کی جاسکتی ہے ایک عاشق (ملکہ مہرنگار) کو پیش کرنے کے بعد معشوق (انجن آرا) کا تجزیہ رجب علی بیگ کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ انجن آرا کا پہلا تاثر اچھا نہیں ہے۔ جان عالم اسے دیو کی قید سے چھٹکارا دلادیتا ہے اور تنہائی کی ملاقات میں حسن و عشق کے تیر چلتے ہیں۔ انجن آرا پہلی نظر میں شہزادے کو پسند بھی کر لیتی ہے لیکن جس ناز و انداز کا مظاہرہ کرتی ہے وہ فطری ہے۔ مشرقی تمدن میں لڑکی شرمیلی ہوتی ہے وہ شادی کے ذکر سے جھینپتی اور اسے ٹالتی ہے۔ بنادٹی خفگی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ انجن آرا، مشرقی تمدن کی غمازی کرنے میں ذرا مبالغے سے کام لیتی ہے۔ سرور نے اس پر خاصا زور بھی دیا ہے۔ جب جادو گردوں کی لڑائی کے بعد جان عالم انجن آرا کو قید سے چھڑاتا ہے تو اس کی ملاقات پہلی بار انجن آرا سے ہوتی ہے۔ وہ ایک نظر میں تیرنگاہ کا گھائل ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ انجن آرا تن تنہا —

”بیکسی کے سوا کوئی ہمدم شریک زندانِ غم نہ تھا، دل قبضہ اختیار

سے جاتا رہا، حجاب ہر چند مانع آتا رہا، مگر جان عالم کا سر، سر کا زانو پر رکھا،

چہرے کی گرد جھاڑی، غشی تو کبھی آنکھ سے نہ دیکھی تھی، گھبرا کر رونے لگی،

اس طرح روئے یار دھونے لگی اور یہاں جو بوند آنسو کی منہ پر پڑی اور

دماغ میں فوشبوئے کنارِ دلدار چڑھ سی، لٹخنے کا کام کر گئی، گلاب کیوڑا

چھڑکنے کی حاجت نہ رہی، آنکھ کھول دی، سبحان اللہ سرخاک افتادہ

کنارِ یار زانوئے دلدار پر پایا، ناز و نیاز نے دماغ عرش پر پہنچایا

اور پاؤں پھیلایا، یہ اترایا، انجن آرا نے جھجھک کر گھٹنا سرکایا۔ جان عالم

نے چشم نیم وا سے شہزادی کا منہ دیکھا اور کہا ”ہماری بے ہوشی ہوشیاری

سے اچھی کھتی“

اب سرور نے بے نیازی، حجاب اور ناز و نیاز محبوبانہ کی مبالغہ آمیز تصویر

پیش کی ہے۔

”یہ کہہ کے آنکھیں بند کر لیں کہ ”پھر میں عشق آیا، کیوں تم نے زانو سرکایا“ انجن آرا نے کہا۔ ”کیا خوب، اتنا اختلاط میری چڑ ہے۔ میں نے تیری محنت و مشقت پر نظر کر کے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی، تم چل نکلتے، خدا جانے دل میں کیا سمجھے، اپنی راہ لیجئے، چلتا دھندا کیجئے، واہ وا نیکی برباد گنہ لازم“

اور یہی نہیں آگے چل کر کستی ہے :-

”عشق و عاشقی کی باتیں میری بلا جانے، رمزدکنایہ کسی اور سے جا کر کرو، اپنا چو پچلا تہ کر رکھو، اپنی صورت تو غور سے دیکھو، تم نے سنا نہیں شاید۔ مثل — حلوا خوردن را روے باید“

اس کے بعد جب یہ دونوں اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ ہم صحبت مزاجداں تارا گئیں وہ سب پاس آ آ کے کہنے لگیں۔

”یہ صورت اللہ نے دکھائی ہے یا جان عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی جس طرح ہمارے مطلب دلی ملے، خالق اس کی بھی جی کی مراد دے“ انجن آرا غصے کی شکل بنا، تیوری بھوں چڑھا، کہنے لگی۔ ”تم سمجھوں کی شامت آئی ہے، کیا بیودہ یک بک مچائی ہے، چو چلے کی خوبی، بزرگی، خوردی سب ڈوبی، واہ داتم نے میری چڑ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی بنائی، خدا جانے یہ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ سمجھوں نے میرا مغز کھایا ہے۔ اسے تو کیا کوسوں، وہ تو مسافر بے چارہ ہے، جی میں آتا ہے، اس کا منہ نوچوں، جس جس نے یہ خزا بگھارا ہے اور بھی مجھے پھیر دو گی تو رودوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی“

لیکن اس کے باوجود انجن آرا کی بناوٹ، غیر معمولی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پڑھنے والے پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بات انجن آرا کے مزاج سے بھی میل نہیں کھاتی۔ وہ کم گو ہے لیکن وہ انتہائی کوشش کرتی ہے کہ شہزادے کو صاف صاف جواب

دے دیا جائے یہاں تک کہ انکار بھی کر دیتی ہے۔

”میری قسمت کبخت بُری ہے، ایک مصیبت سے چھڑا، دوسری آفت میں پھنسا یا۔ ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا، خدا جانے وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ اپنے تئیں شہزادہ بنایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں، ہر صورت فرمانبردار، اگر کنوئیں میں جھونک دو، چاہے گھر پڑوں، ات نہ کروں، مگر جو آپ اس کی شکل پر ریچھ محنت و مشقت کو سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں، اگر مزدوری کی اجرت، خدمت کا انعام منظور ہے کہ بادشاہوں کے نزدیک احسان کسی کا اٹھانا بہت دور ہے تو ردِ پیہ، اشرفی، جاگیر پر عنایت کرو کہ اس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔“

میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہاں سرور اس کی آنکھوں سے بھی کام لینا چاہتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اس لئے زبان سے ضرورت سے زیادہ باتیں کر دیں۔ سرور نے اپنے آپ کو بڑی مشکل میں ڈال لیا ہے۔ انجن آرا کی ہم نشین جلیسیں امیرزادیاں، جن سے اس بات کے ردِ مشورے رہتے تھے، وہ اس موقع پر سرور کو اس مشکل سے عمدہ برآ کرتی ہیں۔

”اے ہے لوگو! تمہیں کیا ہوا ہے آتو جی صاحب بے ادبی صاف آپ نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا ہے، خیر ہے صاحبو، دھن سے صاف صاف کھوایا چاہتی ہو، دنیا کی شرم و حیا کیا نگوڑی اڑ گئی، اتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے جو یہ ٹالیں گی، خاموشی نیم رضا، بوڑھے بڑے کے ردِ بد اور کہنا کیا۔“

انجن آرا اس کے بعد خاموشی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے سپرد کر دیتی ہے وہ مشرق کی ایک سیدھی سادی عورت بن جاتی ہے جو اپنے شوہر کی بات فرمان سمجھ کر قبول کر لیتی ہے۔ وہ خاموش لڑکی ہو کر سامنے آتی ہے۔

دوسری بار اس کی زبان اس وقت کھلتی ہے جب وہ ملکہ مہرنگار سے ملتی ہے۔ ملنے

سے پہلے اس کے ذہن میں ملکہ کا کوئی اچھا تصور نہیں تھا لیکن پھر یہ تصویر بدل جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنے شوہر کی بیوی تسلیم کر لیتی ہے۔ اس میں بے تکلفی بھی ہے اور شوخی و ظرافت بھی۔

”ہم نے خوب کیا، زندگی یہ چونچلے کی باتیں بیگانہ دار نہ کرتی تو کیا ہوتا،

اے صاحب ہمارے تو رشتہ ہماری، سر رشتہ برابر ہی ہے اور حساب کی راہ

سے پہلے تو سلامتی سے تمہیں ہو۔ سرکار الش ہمیں ملا ہے، پہلے مزا آپ نے

چکھا ہے، جو بن لوٹا ہے۔“

اس کے بعد پھر وہ ہمیں خاموش نظر آتی ہے یہاں تک کہ پھر ہر موقع پر اپنی تقدیر کو قبول کر لیتی ہے۔ وزیر زادہ، جان عالم کو بندر بنا کر خود جان عالم کے جسم کو اپنا لیتا ہے۔ ملکہ مہر نگار اپنی ذہانت سے بھانپ لیتی ہے اور اس کا ذکر انجن آرا سے کرتی ہے لیکن وہ خاموش رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ وہ اس دنیا کو حقیقتاً جادو نگری سمجھتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اس کے خلوص پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔

وہ وزیر زادے کے سامنے ذرا بھی احتجاج نہیں کرتی اور اگر ملکہ نہ ہوتی تو شاید تن بہ تقدیر اس نے اپنے آپ کو عیار وزیر زادے کے سپرد بھی کر دیا ہوتا۔

اس کی یہ کمزوری ہمیں اس وقت زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ جب وہ کالا دیو کی قید میں ہوتی ہے وہاں بھی کالا دیو اسے دوبارہ زندہ کرتا ہے۔

”انجن آرا اٹھ بیٹھی، دیو نے یوہ تر و خشک رو برد رکھا مگر پریشانی

ہر سو متحرنگراں، شہزادی نے کہا ”خیر ہے۔“

اس نے کہا ”آج غیر انسان کی بو آتی ہے، خوت سے جان جاتی ہے۔“

وہ کہنے لگی۔ ”ہمیں آج تک جانور کی پرچھائیں نہ نظر آئی تو نے

آدمی کی بو پائی، طرفہ خط ہے، یہ جملہ بے ربط ہے۔“

غرضیکہ صبح تک مذکور ہر شہر دیار عجائبات روزگار کا بیان رہا۔

۔ یہاں وہ ہرگز ایسی عورت نظر نہیں آتی جو دیو سے نفرت کرتی ہو۔ ہمیں یہ بھی

۱۲۱ لے نساہ عجائب ۱۲۱ داں اڈیشن نو لکٹور ۱۲۱

۱۸۹ ایضاً ایضاً ایضاً ۱۸۹

خیال ہوتا ہے کہ شاید جان عالم کو بھول گئی۔ وہ دیو سے دنیا بھر کے قصے سنتی ہے۔ شاید سرور کو خود بھی اس کا خیال آتا ہے اور اسی لئے جب وہ جان عالم سے ملتی ہے تو دہاڑیں مار مار کر روتی ہے اور اس "بے نیازی" کا اس طرح کفارہ ادا کرتی ہے۔

دوسری جانب ملکہ مہرنگار ایک بادشاہ کے محل میں ہے۔ بادشاہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے محبوب کی یاد ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کرتی اور بادشاہ سے ملتے لیتی ہے۔ یہاں دیو کے مقابلے میں بادشاہ کو ترجیح بھی دی جاسکتی تھی لیکن وہ عاشق ہے ہر جائی نہیں۔ وہ تو تے کو جس عالم میں ملتی ہے۔ وہ بھی ایک مجبور کا جاندار مجسمہ ہے۔ وہ بیڑ کے نیچے تن تنہا رو رہی ہے۔ مایوسی اور اندھیرے میں گھری ہوئی ہے لیکن طلبِ صادق اسے تو تے کی شکل میں پیغامبر سے ملا دیتا ہے۔

جب یہ قافلہ اپنے شہرِ نشست آباد میں پہنچتا ہے تو اس وقت ہمیں تیسری بار انجن آرا ایک بار پھر بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ وقت وہ ہے جب ماہِ طلعت سامنے آتی ہے اور تو تا انجن آرا کو دکھا کر کہتا ہے :-

"حضرت سلامت! آنا زبانِ مبارک سے فرماؤ کہ آج سچا کون ہے۔ جھوٹے کے منہ میں کیا ہے اور تو کیا کہوں۔ آپ کی کج بختی کے باعث جان عالم کے ہاتھ، یہ لوگ مہر جبین ماہِ سیما آئے، گو آنا چکر ہوا۔ میرے سبب آپ کو ندامت ہوئی۔ جھوٹے کے منہ میں گھٹی شکر ہوا۔"

اس پر انجن آرا تو تے کو ڈانٹتی ہے اور ماہِ طلعت کو تسکین دیتی ہے :-

"دیوانے کیا بیہودہ بکتا ہے، پھر ماہِ طلعت سے کہا "سو میری جان! جانور بے شعور، عقل سے دور، حیوانیت سے مجبور ہے، دنیا کا کارخانہ فسانہ ہے۔"

یہاں وہ ایک خاموش عورت ہو کر سامنے نہیں آتی۔ شاید سرور اس بات کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ انجن آرا کے دل میں ماہِ طلعت کی طرف سے کوئی میل نہ تھا۔

ہمیں جب علی بیگ سرور سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے ماہِ طلعت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہم پہلی بار ماہِ طلعت کو اس وقت دیکھتے ہیں جب اس کی شادی جان عالم سے ہوتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ملکہ ہونے کے شایانِ شان ہے۔ سرور اس کا سراپا سدرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

”ایک شہزادی پری پیکر، خوبصورت، نیک سیرت، عورت نژاد گل اندام،

یسیں برشک شمشاد، ماہ طلعت، دودماں والا سے مقرر ہوئی۔“

ایک شہزادی اور وہ بھی جو پری پیکر، عورت نژاد، اور گل اندام ہو، اگر اس کے اندر اپنے حسن خدا داد کی داد چاہنے کا جذبہ ہو، تو کوئی امر غیر فطری نہیں اور نہ اسے ”ضد، ہٹ اور غرہ“ سے تعبیر کرنا چاہئے۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ عورت بھی ہے اور شہزادی بھی، جب جان عالم بامراد واپس آتے ہیں اور انجن آرا و ملکہ، اس سے ملنے کی خواہش کرتی ہے تو جان عالم کا باپ کہتا ہے :-

”وہ عورت بد بخت، سخت منہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے، اسے شرمندہ

کرنے سے کیا حصول ہے۔“

حالانکہ اس داستان میں تو تاہی زیادہ منہ پھٹ معلوم ہوتا ہے اس لئے جب وہ اپنے حسن کی داد چاہتی ہے تو توتے کے بارے میں کہتی ہے :-

”تو تا بہت عقل مند، ذی شعور، سیاح نزدیک و دور ہے اس سے پوچھنا

ضرور ہے، اور یہی نہیں توتے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہے :- ”اے مرغ

خوش خو، طاہر زرد لباس، سرخرو، بذلہ سنج، بے رنج، پیچ کنا، اس سج دہج

کی صورت کبھی تیرے طاہر وہم و خیال کی نظر سے گزری ہے۔“

ماہ طلعت سے ہماری ملاقات بہت مختصر ہے اور اس میں وہ یقیناً ہمدردی حاصل

ہے اور ہمیں تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

سرور کے ہاتھوں توتے کے ساتھ بھی انصاف نہیں ہوتا۔ جب سب کو اپنی اپنی مراد مل جاتی

ہے تو وہ توتے کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دوسری داستانوں کی طرح تو تا

بھی کسی سحر کا شکار ہوگا اور شاید جان عالم کے ہاتھوں وہ اس سحر سے چھٹکارا پا جائے اور پھر ہم

اسے ایک انسان کی حیثیت سے دیکھ سکیں اور اس کی جانفشانی، محبت اور خلوص کی داد دے سکیں۔

اگر توتے کو انسانی قالب مل جاتا تو شاید قصہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا۔

۱۵ فسانہ عجائب ۱۲ داں نو لکچور اڈیشن ص ۲۱

۱۵ ایضاً ایضاً ص ۲۱

۱۵ ایضاً ایضاً ص ۲۳

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. _____ Book No. _____

Acc. No. _____

This book may be kept for 14 days. An over - due charge will be levied at the rate of 10 Paise for each day the book is kept over - time.

[illegible]



الحَسْبُ الَّذِي خَلَقَ مِنْ لَمَاعٍ بَشَرًا فَجَعَلَهُ لَسَبًا وَصَحْبًا اَوْ كَانَ بَلَقًا قَدِيرًا،

سزاوارِ حمد و ثنا، خالقِ ارض و سما جَلَّ وَ عَلٰی صانعِ بیچون و چرا ہے جس نے رنگ بے ثباتی سے بایں رنگارنگی، تختہ چمن دنیا پر از لالہ و گل، جزدکل بنایا، اور بادِ وجودِ ترسِ باغبان و بیمِ صیاد، و لولہٗ لبخِ گل و بلبل کو دے کر دامِ محبت میں پھنسایا اور عاشقِ بادِ فادِ معشوقِ پردِ فادِ کو ایک آبِ گل سے خمیر کر کے، پردہٗ غیب سے بعرصہٗ شہود لایا۔ ایک خلقت سے دو طرح کا جلوہ دکھایا اور انسانِ ضعیف بنیان کو اثرِ المخلوقات فرمایا۔ جلوہٗ حسنِ بتاں بجزا، شیفتگی کا بہانہ ہے۔ نالہٗ بلبلِ شیدا گوشِ گلِ رعنا کا ترانہ ہے۔ اس کی نیرنگیوں کے مشہور نسلے ہیں۔ ہم اس کی قدرتِ کاملہ کے دیوانے ہیں۔ صفتِ اس کی محال ہے۔ زبانِ اس تقریر سے لالِ ہے جس کی شان میں مخبرِ صادق یہ فرمائے۔ دوسرا اس عہدے سے کب بر آئے مَا عَرَفْنَاكَ حَقًّا مَعْرِفَتِكَ

نعت سرور کائنات محبوبِ خدا

بَرَكَاتُكَ اَنْبِيَاءُ مُحَمَّدٌ مُصْطَفَى صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ

بعدِ حمدِ خالقِ جن و بشر، حاکمِ قضا و قدر، مبداءِ شامِ طالعِ سحر، نعتِ میدِ کائناتِ خلاصہٗ موجودات، بہترینِ عالم، برگزیدہٗ نوعِ بنی آدم، کی ہے جس کے چراغِ ہدایت کی روشنی

سے تیرہ بخت گم گشتہ کوچہ ضلالت بہ راہ راست آئے۔ بہ توفیق رفیق اور مدارج تحقیق کیا کیا مرتبہ بلند پائے اور منحرف کور باطنوں کو ہنم ناہن کی کبھی اور زعم فاسد نے کیسے کیسے روزیہ دکھائے۔ اس کے حق میں یہ حکم حق آیا ہے۔ بچشم غور دیکھو تو کسی اور نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ لَوْلَا لَمْ يَخْلُقْ الْاَفْلَاقُ سِرْ حَلَقَةٍ اُولٰٓئِن، خاتم المرسلین، صفت کریم، احمد بے میم، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ الطاہرین اور اصحابہ المکرمین وسلم۔ کوئی شاعر اس کی شان میں کہتا ہے لا اعلم رباعی ۵

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدہ ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدہ
اے ختم رسل قرب تو معلوم شد دیر آمدہ ز راہ دور آمدہ
اس مشت خاک کا کیا فہم و ادراک، جو شمع صفات ذات بابرکات، زبان پر لائے، جو عجز میں نہ در آئے۔ کام و زبان ناکامی سے فوراً جل جائے۔ اور منقبت امیر المومنین، امام المتقین، یکہ تازی میدان لافتنی، خلاصہ مضمون سورہ ہل اتی، یہی کافی ہے۔ جسے پیر نے کہا لِحَمٰکَ لِحٰی وَدَ مَلٰکَ دَقٰی عَلٰی مٰنٰی وَ اِنَا صُنُّ اور مدح اہل بیت رسالت کہ دلائل ان کے ایمان کی دلیل ہے اور محبت ان کی، ہر فرد بشر کو واجب بایں حدیث جلیل ہے۔ مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مِّنْ رَّكْبِهَاجِيْ وَ مَن تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَ هُوَی۔

مذکور شاہ غیور قباد شکوت شیرواں مست

غازی الدین حیدر بادشاہ غازی ارث دودمان سعادت

پس از حمد خدا و لغت سرور انبیا، لازم و ضرور ہے کہ مدح والی ملک بیان کئے۔ قَوْلُهُ تَعَالٰی اَطِيعُوا لِلّٰهِ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاطِيعُوا اَمْرًا مِّنْكُمْ اگرچہ صفت شاہ زبان گدا کا بیان کرنا، پھوٹا منہ بڑی بات ہے، مگر نام نامی و توصیف ذات گرامی اُس کی وسیلہ توقیر، اس تحریر کا اور مفتاح باب اس پریشان تقریر کا، جان کر، شمع از شمائل و ذرہ از خورشید خصائل، رقم کرتا ہوں، شاہ کیوان بارگاہ، بلند مرتبہ عالیجاہ، سِرْ حَلَقَةٍ شاہان والا تبار، جم شکوت فریدیوں، سیمان اقتدار، کشور گیر، ملک ستان، خدیو گیہان، ابوالمظفر مغل الدین

شاہِ زمیں غازی الدین حیدر بادشاہ غازی محمد اللہ ملکہ و سلطنتہ و اَیَّدہُ اللہ بالنصر والظفر
جلّ جلالہ! اگر معرکہ رزم یا صُحبتِ بزم اُس کی انشا کروں، صفحہ دنیا پر نہ لکھ سکوں۔
دمِ رزم، رستم و سام و زیمیان، مثلِ پیرِ نال لرزاں، اور وقتِ سخا اور عطائے زوال
حاتم کے ہاتھ میں کاسہ سوال، بزمِ طرب میں زہرہ و مشتری سرگرمِ نعمہ پردازی و
عربہ سازی، ہنگامِ غتاب و خشم، مرتجحِ مستعدِ جلادی و بیدادی، یہ ادنیٰ عنایت
ہے۔ بیت

چناں بموسمِ سرا دوشا لہا بخشید کہ گرم شد ہمہ بنگالہ سرد شد کشمیر
بسکہ سحابِ بخشش، اُس بحرِ عطا کا روز و شب، مزرعہ کہ و مہ پر بارش کھتا
ہے۔ شہر میں سالہا کانِ مشتاق سائل کی صدا کا، اور دیدہ ندیدہ، صورتِ گدا کا۔
عدل یہ کہ ہاتھی چیونٹی سے ڈرتا ہے، شیر بکری کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ چشم
اس کے عہدِ دولت میں ہزاروں نے دیکھا، بکری شیر کے بچے کو دودھ پلاتی تھی،
کنار میں شفقت سے سلاتی تھی۔ باز تیز پرواز بچہ کنجشک کا دساز اور نگہبان،
بلی کی عادتِ جلی یہ کہ کبوتر سے ہراساں۔ دودِ دلِ اندوہناک، روزِ ہر خانہ
سے مسدود۔ شحہ دادِ رختہ بندی فساد کو موجود، اللہ تعالیٰ اس امید گاہِ عالمِ عالمین
کو، اپنے حفظ و امان میں سلامت رکھے۔ دولتِ خواہ اُس والا جاہ کے بعیش و
شادی مدام اور دشمن رو سیاہ برنجِ نامرادی گرفتارِ آلام رہیں۔ بحق رب ذوالمنن
بہ تصدقِ نچیتن۔

بیانِ مولف دربارہ لکھنؤ

ذکر صنعتِ مردمانِ نجستہ رو و تذکرہ ہر صاحبِ علم و
کمالِ علی قدر حالِ نمونہ مکاناتِ این شہر

یہ پنیہ دہان ہچیدان، محرر داستان مقلد گذشتگان سراپا تصور جب علی بیگ
تخلص سرور، متوطن خطہ بے نظیر دلپذیر، رشک گلشنِ جاناں، مسکنِ حور و غلمان، جائے
مردم خیز، باشندے یہاں کے ذکی ہنیم، عقل کے تیز۔ اگر دیدہ انصاف و نظر غور
سے اس شہر کو دیکھے تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے۔ ہر بار یہ کہے بشعر
سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمین ہے
سبحان اللہ و بحمدہ عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار
ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطع دار ہے۔ دو روئے بازار، کس انداز کا ہے
ہر دوکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ گو ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان ہیا
ہے، پر اکبری دروازے سے جلو خانے، اور پکے پل تک، کہ صراطِ مستقیم ہے۔ کیا
جلسہ ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ، شیرمال، کباب نان نہاری بلکہ جہان کی نعمت
اس آبداری کی، جس کی بوباس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے۔

فرشتہ گذرے تو سونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سرلی چھنکار، شیرمال تنگرت کے رنگ کی، خستہ بھر بھری، ایک بار کھائے، نانِ نعمت کا مزا پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب اس آبِ دتاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سنج آہ پڑھتے۔ محرومی سے کباب، ادک کا لچھا، میاں خیراندہ کی دوکان کا کترا، ہاضم باریک نایاب۔

حُسن کے حلوا سوہن پر عجیب جوین، اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند، جہاں کو پسند، پٹری دبیز، بسی بسائی، ہونٹ سے کھائے، دانت کا اس پر تمام عمر دانت رہے۔ لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوی خوب حبشی اہل ہند کو مرغوب دودھیا شیرخوارہ نوش کر جائے۔

ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون، آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعبِ حسن سے بات نہ کر سکے۔ سکرین پر یزاد، سرو قامت، رتک شمشاد، دوکانوں میں انواعِ ہتام کے میوے، قرینے سے چنے، روزمرے محاورے اُن کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی "میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے۔" کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی "مزہ انگور کا ہے، رنگتروں میں۔" کسی طرف یہ صدا آتی ہے "گنڈیریاں ہیں پونڈے کی۔" ایک طرف تبنولی سُرخدئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے، بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے، "گھٹے کا منہ کالا، ہو بہ گرد کر ڈالا، عبیر ہے نہ گلال ہے، کتھے چنے سے اڈھی میں مکھڑا لال ہے۔"

گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی "شیرمال ہے، گھی اور دودھ کی مفلس کا دل اچاٹ ہے، ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں۔ نمش کی قفلیاں، کھیر کے پیالے ہیں۔ کیا خوب بھٹنے بھر بھرے ہیں، چنے، پرمل اور مُرے ہیں۔ جیٹھ بیاکھ کی وہ گرمی، جس میں چیل انڈا پھوڑتی، دو پیسے کو برٹ کی قفلی جبی، دو کھائے بدن تھرائے۔ زیادہ ہو کا کرے۔ تھوے فالج میں مرے۔

سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ پھلا، نسیم دصبا کو سیدھا رستہ نہ ملا، شیخ کوئی کی مٹھائی جس نے کھائی، جہاں کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا،

مستفرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا، برنی کی نفاست، بو باس، دردراپن، تقری ورق کا چوہا کسی اور شہر کا رکابدار اگر دیکھ پائے، یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو، ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو پیچ و تاب دیتا، یا قوتی مفرح کا مزا، جب منہ میں رکھا، اصل تو یہ ہے، غسل مصطفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اُترا، پراچون کی گلی کی کھجور، لذت ٹپکتی ذائقے میں چور، بہتر از انگور، نہایت آب و تاب ہم خرما ہم ثواب، بالائی نورا کی دکان پر جب نظر آئی، بے قند و شکر، شکر کر، نور علی نور کہہ کر پھری سے کاٹ کر کھائی۔ مدارے حلقے وہ ایجاد ہوئے، کسگر ایسے استاد ہوئے کہ جب تڑا قان کاٹا پیچون کا دم بند ہوا سب کو پسند ہوا، پٹھانا کا تباکو، مشک و عنبر کی خوشبو جس نے ایک گھونٹ کھینچا، اسی کا دم بھرنے لگا۔ علی الخصوص مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خمد ہے، یہاں ہر فن کا استاد ہے، سیکڑوں گھاڑ، بدگل کسند ناتراش، اطراف و جوانب سے آ، ہفتہ عشرے میں پھل پھلا، وضع دار ہو گئے۔

جب ابو تراب خاں کے کڑے میں جا، میاں خیراتی سے کسی کی خیرات میں خط بنوایا، بارہ برس کے سن کا گالوں سے مزا آیا۔ چار پہر کھونٹی ٹوٹی پتہ نہ پایا۔ کاتب قدرت کا لکھا مٹاتا ہے، ایسا خط بناتا ہے۔ یہی حسن خاں کے کڑے کے دروازے پر عید عطر فروش کی دوکان، جائے نشست، ہر وضع دار جوان ہے، دوپیسے میں سیلے چنبیلی کا تیل، ریل پیل، فتنہ بپا کرنے والا، ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر، گرد ہوا، جو پور سے دل سرد ہوا۔ عطر کی روٹی رکھی کان میں، پھر جا بیٹھا کسی ایفونی کی دکان میں سفید سفید چینی کی پیالیاں، خوبصورت رنگتیں زائیاں، ایفون فیض آبادی لالے کی، وہ رنگین جس نے تریاکِ مصر کے نشے کر کرے کئے۔ زیادہ پی جانے والوں کو جان کے لالے ہوئے، ایسے متوالے ہوئے بھمکڑا بادہ ارغوانی و زعفرانی کا پیدا، تبدیل ذائقہ کو فرنی کے خواہنے، تقری ورق جے، پستے کی ہوئی پھر کی ہوئی مہیا، چسکی پی۔ ایک دم کے بعد دم حقہ کا کھینچا، آنکھوں میں سرور موجود ہوا، وہاں سے بڑھا، کان میں آواز آئی "بیلے کے ہار ہیں، شوقین البیلے کو، پہن لے، چلا جا فرنگی محل کے میلے کو۔ جب یہ سچ بنی، بگڑا، پنچوں کے بل چلا۔ یہ پھولا، وطن کی چال ڈھال راہ و رسم بھولا۔ اکثر باہر سے آ، یہ دھج

بنا، جو پور کے قاضی ہونے کو مفتی میں راضی ہو گئے۔

برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ہے۔ ادھر سینہ برسا، پانی جا بجا بہہ گیا، گلی کو چا صاف رہ گیا۔ سادون بھادوں میں زر دوزی جوتا پہن کر پھرے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ پھرے۔ باغ بہار کی، صنعت پروردگار کی۔ رضواں جن کا شائق، دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشہ کا میلا، ہر وقت چین کا جلسہ موتی بھیل کا پانی، چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ سڑک کے درختوں کی فضا جدھا کھجوا موجیں مارتا۔ ہار سنگھار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا، رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک۔ تختہ لالہ و نافرمان جن پر قربان اور بندہ ہائے خاص کی سبک روی، خرام ناز، ہر قدم پر کبک ددی چال بھول کر جین نیاز رگڑتی۔ شاخ سروان کے روپو نہ اکر دیتی۔ شائق ہزار در ہزار، شمع پروانوں کا عالم۔ غول کے غول باہم۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا۔ خاص جھولا دہیں پڑا، جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا۔ محبت کے پینگ بڑھتے، دیکھنے والے درود پڑھتے، باغ میں کوئل، پیسے مور کا شور، جھولے پر گھٹا رہی، ادبھی گھنگھور — سادون بھادوں کے بھالے، وہ رنگین جھولنے والے۔

دشتِ غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے۔ دل پاش پاش ہو جاتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کاپور کی برسات، ہیہات ہیہات، دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے، اور کھپسل نہ پڑے۔ گلی میں پاؤں رکھا اور کیچڑ کا چھپکا، سر پر ہینچا، دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے، مگر چلے کے پھنسنے اور جنہیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں ان کے حق میں برسات حوالات گھر جیل خانہ، نہ کہیں جانا نہ آنا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ کھپسل گئے اور جو بازاری کاروباری ہیں۔ ان کا یہ نقشہ دیکھا، ہاتھ میں جوتیاں، پانچا پڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے، وہاں گرے۔ خدا خدا کر جیتے گھر پھرے اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو شعرے

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر برسرِ مطلب آیا، خاص بازار کہ شہر وسیع و خوش قطع ہے اس کے نقشے

سے بانی و ہزار نے خار کھایا، شبیہ کشتی تو کیا خاکہ خاک نہ کھینچا، ہاتھ تھرا آیا
 کوٹھیاں فرح بخش و دلکشا، بروج ہر ایک جہاں نما، سلطان منزل اور استری
 منجن، نشاط افزا، توبہ شکن، انسان کو دیکھ کر سکتے ہو جائے، کام ان کا دم
 و قیاس میں نہ آئے۔ سر راہ کی بارہ دری، جواہر سے جڑی پری کی صورت کی
 قریب نہر جاری، تکلف کی تیاری، پائیں بلغ اس کا، جس نے دیکھا، بلغ ام
 سمجھا، سون صہت ہزار زبانیں بہم پہنچیں، تقریب نہ کر سکا، گونگے کا سپنا ہو، روی
 دروازہ اس رفعت و شان کا ہے، گد رگاہ ایک جہاں کا ہے، اگر اس پر چڑھ جائے
 بام فلک پست معلوم ہو، فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ پہر اڈیں اس کی
 زمین ہے۔ شش ہبت میں دوسرا نہیں ہے، مسجد انتخاب ہے۔ امام بارگاہ لاجپا
 ہے۔ مقبرے عالیشان، وہ نادر مکان کہ فلک بدیدہ انجم نگراں ہے۔ ان کی
 نظیر کی جستجو میں مشعل مر و خورشید، روز و شب روشن کئے، کو بکو سرگرداں ہے،
 اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ ان میں ہاتھ آئے، سر دست مرجانے کو جی چاہے۔ گوئی
 کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے، طبیعت لہرائی ہے، دو رویہ آبادی عمارت
 کہیں رہنے، کسی جا باغ بنے، صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور
 بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔

[علی الخصوص اس جدید سڑک کی کیفیت اور بہار ہزاروں برس
 زمانے میں یادگار ہے کہ خلقت سبحان اللہ و بحمدہ کہے کہ شرق ہے
 تا غرب اس کا مذکور رہا تا آبادی مامورہ جہاں مشہور رہا۔ واہ کیا شستہ
 و رفعت ہے اگر صفائی عارض خواں سے مثال دیجئے تو روا ہے یا شیشہ
 حلب سے نسبت کیجئے تو بجا ہے۔ اس قدر شفافیت اور صفا اس سڑک
 نے پائی کہ خط استوا کی شکل صفحہ دنیا پر نظر آئی۔ دل گرفتہ اور خاطر قسردہ
 کو تفریح اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اس کی سیر حزن و ملال اہل جہاں کھوتی ہے
 کیسا ہی خفقان دور ہو جاتا ہے، جگر کو طاقت دماغ کو فرحت، دل
 میں سرور، آنکھوں میں نور آتا ہے۔ مریضوں کی دوا ہی بیت الشفا
 ہے۔ سہ پہر کو گرمی میں آبپاشی ہو جاتی ہے آئندہ روندے کے گرد گرد پھٹکنے نہیں
 لہ یہ عبارت ایک قلمی نسخے سے ماخوذ ہے جو آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔

پاتی ہے ہوا فرحت انگیز ہوتی ہے۔ طبیعت موزوں اور تیز ہوتی ہے۔ راہ راست جو سنتے تھے بدولت شاہنشاہ جہاں خاقانِ زمانہ تنگنائی و سمت کی سرگشتوں نے پائی۔ بابِ امید و کامیابی کی یہی راہ ہاتھ آئی۔ لوے لنگڑے بے تکلف دوڑے جاتے ہیں۔ اندھے بھی خانہ مراد تک پہنچ جاتے ہیں۔ رستہ بازارِ سڑک پر تیار ہے۔ رومِ شام کی چیز کا ہر جا انبار ہے۔ دکانوں کا ساز و سامان دیکھ کر عقلِ فلاطوں دنگ ہے۔ اندازِ دنیا جہاں سے نیا سو میل مگر طرزِ جدا منقش و رنگا رنگ عجب ڈھنگ ہے۔ سڑک خوب، دکانیں مرغوب، ہوا سرد و سیر ہے جو وہاں نہ پہنچا اس کی قسمت کا پھیر ہے۔ بابِ امید کا جو پتہ ہے، امیدھر درِ دولتِ دا ہے، اودھر امامِ باڑہ حسین آباد کی بنا ہے، سڑک سے نمایاں ہے، جلّ جلالہ کیا شکوہ و صولت ہے، کیا عزم و شان ہے۔ رفعتِ امامِ باڑہ و شکوہِ برجِ طلائی پر مرغِ زریں جناح ہر صباح تیار ہوتا ہے۔ صدقے گنبدِ دواں ہوتا ہے۔ شوکت و بلندی پہرِ بریں، ساکنانِ زمین کی نظروں سے گر گئے۔ خورشیدِ درخشاں کے منہ پر زردی پھر گئی۔ دمِ نظارہ و طوافِ امامِ باڑہ دیدہ و دلِ دولتِ کونینِ حصول کرتا ہے۔ ایسی ہی بنا بانیِ ارض و سما قبول کرتا ہے۔ درِ اجابت بروئے حاجت منداں دا ہے۔ ماتمِ خانہ شاہِ شہدا ہے۔ جس دمِ ضریحِ پاک نظر آئی، چھاتی بھر آئی۔ دلِ خوں دیدہ جیہوں ہو جاتا ہے خود بخود رونا چلا آتا ہے۔ قریب اس کے حوضِ مصفا ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کس شے کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں۔ عیشِ باغ میں موتی جھیل ہے۔ اس عزا خانے میں نہرِ رشک کوثرِ نمونہ سلسیل ہے۔ ہر لہر موجِ زنِ غمِ خامسِ آلِ عبا ہے چشمہ فیضِ چھلک رہا ہے۔ سنگریزہ اس کا فخرِ ڈیرہ لیتا ہے۔ پانی پانی نخلت سے دریا ہے۔ اُس کے جلو خانے نادر کا وہ ترو پو لہ ہے حواسِ خمبہ کھوتا ہے۔ ہر دردِ دیکھ بشرِ ششدر ہوتا ہے۔

کیسی ہی طبیعت مکر ہو اس کے اندر آئے فرحت ہو جائے۔ رومی
 دروازہ چشم حیرت کی طرح دا حیرت سے اُسے تکتا ہے اگر استحکام
 پر نگاہ کیجئے، سد سکند کا نام نہ لیجئے۔ روبرو اس کے وہ تالاب
 ہے جس کے پانی کا قطرہ بہ از گوہر نایاب ہے۔ عقل باریک میں
 اس کے کام میں حیران ہے۔ صنعت صانع نادر نگار نمایاں ہے۔
 ہشت پہل اور کوئی تالاب نہیں، شش جہت میں اس کا جواب
 نہیں۔ سندس فکر اس کے بروج دیکھ کر گم ہو اس کرتا ہے بہ دقت
 منطقہ البروج قیاس کرتا ہے۔ مختصر سا اس میں پائیں باغ ہے
 جس کے رشک سے لالے کے جگر میں داغ ہے۔ نافرمانی
 سے اس کے سوسن کیود ہے۔ نشان سیلی، باغبان سے نیلا ہٹ
 چہرے پر نمود ہے۔ روشیں شفاف ہیں کیاریاں خس و خاشاک
 سے صاف ہیں سرسبز و شاداب ہے۔ نہایت آب و تاب ہے۔
 درخت گل و ثمر سے بھرے لہلہ ڈھپے ہرے۔ گلشنِ جنت
 کا نمونہ ہے۔ باغِ ارم سے کیفیت میں دونا ہے۔ ہر شاخ
 پر مرغانِ خوش الحان ترانہ سنجی میں مشغول ہیں عجیب درخت غریب
 پھل، نئے روش کے پھول ہیں۔ نو نہالانِ مہر چمن قامت
 کشیدہ شاخہائے بار پر مثل کریماں سخا شعار خمیدہ دیدہ
 روزگار، مثلش نہ دیدہ، ہر بوئے پتے پر اپنے اپنے طور کا
 جوین ہے۔ قابلِ نظارہ وہ گلشن ہے۔ اگر صد برگ کی طرح
 زبان بہم پہنچائے تعریف نہ کر سکے، گونگے کا سینا ہو جائے۔ تالاب
 کے گرد تصاویرِ نادر ایستادہ، ہر ایک اپنے کام پر آمادہ، گویا
 بولا چاہتی ہیں۔ لب بہ تکلم کھولا چاہتی ہیں۔ ہر صورتِ نقلی پر
 گمان اصلی ہے۔ آغا کے ہاتھ کا قطعہ میر کی لکھی و صلی۔ مانی
 چین و بہزاد دیکھ کر چین مانے، آذر دیکھ کر بیت ہو جائے۔
 تختہ ارثرنگ ہو جائے۔

قریب اس کے جنگلوں میں سباع ہیں۔ باوجود خلقت حیوانی
 خصلت انسانی رکھتے ہیں، نام کو دو و دمام ہیں لیکن آدمیوں سے رام
 ہیں۔ ہر دم لوگوں کا میلہ ہر وقت سیر ہے ہر نیک آغاز کا انجام بخیر
 ہے۔ سہ پہر کو امام باڑے کے دیر و گذرے، سیر ہر گذرے
 ہے۔ ہر طرح کے طیر، بڑی سیر، سینا بازار کا جلسہ ہر روز ہو جاتا
 ہے۔ ایک جہاں لینے دینے بیچنے خریدنے کو آتا ہے۔ کسی جا کوتر
 گرہ باز، شاہ جہانپور کے بلند پرواز کسی جگہ شیرازی گلے نگار نیلے،
 بھورے سیما بیے، بزنے، بھورے، گنڈے دار۔ ایک طرف
 بیانیم کی پتی ٹکلی کوڑی آسمان سے لاتا ہے۔ ایک سمت مینٹھی
 ہلاتا ہے، کوئی مینا پھر کاٹتا ہے، کوئی نیل کنتھ چھڑاتا ہے،
 کہیں بیڑ بازوں کا غول، کہیں لے تیر کا مول تول ہے۔ کسی جا
 ٹینی مرغیاں، کسی جا مرغ ایل ہے، کہیں انڈے رطے ہیں،
 قال دقل ہے، کوئی کہتا ہے یہ سالار جنگی ہیں ان میں کوٹھے پارچے
 کا میل ہے۔ یہ اچھت دلی دالے ہیں کوئی کہتا ہے یہ مٹی سنگہ والے
 زیر بندی ہیں ان کے گلے کینل کی، لالوں کے عالم نرا لے ہیں کہیں
 گلوری میں ٹکڑی ہیں جیتے ہیں۔ مرغ باز، ان کے خوف سے خون جگر پیٹتے
 ہیں۔ کسی طرف بیڑوں کے تھیلے کا بکیں، مرغ کے کھانچے ہیں، کہیں
 کوتر کے ٹھاٹھ کا بک کے ڈھانچے ہیں۔

ایک طرف سودہ فروش کی للکار ہے کسی سمت سقوں کے کٹوروں
 کی جھنکار ہے۔ فالودے والے جدا غل مچاتے ہیں، برف کی
 تفلیاں لوگ کھاتے کھلاتے ہیں۔ سانپ والے تماشا کرتے
 ہیں۔ قصہ خواں امیر حمزہ صاحبزادوں کا دم بھرتے ہیں۔ کہیں لونگ
 چڑے دالے ہیں، دال موٹ کے خواہیخوں کے عالم نرا لے ہیں۔
 کتاب ہر طرح کے گرما گرم سیخوں پر تیار ہیں۔ مٹھائی کے خواہیخے
 ہزار در ہزار ہیں۔ بزازوں کی دکانیں قطار قطار ہیں۔ صرافوں کے

روبرو اشرفی کے انبار ہیں۔ کسی جا بربری بکریاں ہیں، لوک ہے،
 خریداروں کی نوک چوک ہے، کوئی پھولوں کے بار گنا چکاتا ہے،
 کوئی لکڑی والے کے حقے میں سلفہ اڑاتا ہے جہاں کا ساز و سامان
 طفیل شاہجہاں مہیا ہے، مصر کا بازار سرد ہو گیا ہے۔ ہفت
 ہزاری ہے یا بازاری ہے، ہر شخص کے لب پر دعائے صحت
 و سلامت و ترقی جاہ و حشمت شاہنشاہ جاری ہے۔ شہر میں
 امن و امان ہے۔ ہر ایک کی خوش گزراں ہے۔ راست باز خرم
 ہیں، کج رفتار انٹی مار کم ہیں۔ کارواں سرا نمونہ سرائے مہتی
 ہے، ہموار بہ تزمین بے شمار بلندی ہے نہ پستی ہے لطف کو چ
 آرام مقام اس مقام سے ملتا ہے غنیمت سربستہ دل اس کے
 دید سے کھلتا ہے۔ بھٹیاریوں کی ہر طرف صدا ہے۔ مکان
 نفیس صاف کھانا، گرم سرد پانی بھرا ہے، خدمت کرنا ہمارا کام
 ہے، انعام دینے میں تمہارا نام ہے۔ ٹھنڈی چھاؤں پیو ترہ
 پکا ہے نہ یہاں چور ہے، نہ اچکا ہے۔ دن کو چین رات
 کو آرام ہے۔ نہ چارپائی میں ایک کھٹل نہ گھر میں مچھر پسو
 کا نام ہے۔ شب کو یہ آواز آتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے
 مسافر کو سمجھاتی ہے راہ کے بلے کا نہ اعتبار کرتا، بے جانے
 بوجھ کا ساتھ نہ اختیار کرنا۔ دن رہے منزل پر اترو، صبح ہو
 تو سدا صابو، آواز دینے پر نہ بولے، اُسے مارو۔
 ایک طرف حجام تھکے ماندوں کے پاؤں دباتے ہیں۔ پیادہ چلنے
 والے راحت پاتے ہیں اور وہ جو بنائے مسجد رفیع و صحن وسیع
 ہے، جس کے دیکھنے سے دل مشغول ذکر حق ہوتا ہے یا عبادت
 کا بھولا سبق ہوتا ہے۔ اگر دیدہ بینا ہو تجلی انوار الہی ظہور فیض
 نامتناہی محراب و منبر دیوار و در سے ہویدا ہے۔ جلوہ صانع
 ریاض مصنوع پیدا ہے۔ کوسوں سے یہ مسجد سربلند رشک کوہ الوند

نمایاں ہے ، عقل اس کے کام میں حیراں ہے ۔ اس عمارت کی بنا ڈالی طریقِ حنیف کی راہ نکالی کہ جو دیکھے سجدہ کرے ، خدائے بزرگ کا نام لے ۔ اگر شیدائے پارسی زندہ ہوتا شیدا ہو کر سجدہ کرتا ۔ اور سن مار رومی محرومی سے کاریگری کا دم نہ بھرتا ، شرمندہ ہوتا ، دعائے حاجت مند لب پر آئی اور فرشتوں کے گوش زد ہوئی کار براری بے کوشش و کد ہوئی ۔ یہاں کا موزن ہر سحر فرشتوں کو چونکاتا ہے نعرہ اللہ اکبر شاخِ سدرہ سے اُچک جاتا ہے ۔ زینہار آسیان سید روزگار ہے ۔ معبدِ مردمانِ شب زندہ دار ہے تمام شہرِ صحنِ مسجد کا پائیں باغ ہے ۔ ناظرینانِ صنائعِ الٰہی کو بحرِ نظارہ فراغ ہے ، واہ کیا مسجد جلیل ہے ۔ مصداقِ بنائے خلیل ہے شرہ

بندہ جو صفت کرے بجا ہے کیونکہ کہ یہ خانہ خدا ہے
از روز بنائے فلک مقرنس آج تک ایسی مسجد پر نیکوہ
بارفت ، ساکنانِ زمین نے نہ دیکھی تھی بلکہ گوشِ زد نہ ہوئی تھی ۔ ایسی بنائے
خیر کی کسی کو کد نہ ہوئی تھی ۔ اللہ تعالیٰ اس بنا کے بانی
کو تا ظہورِ قیام مہندی قائم رکھے ۔ سایہ عاطفت اس کا خلق
کے سر پر دائم رکھے ۔ روزِ جلوس سے جو کام کیا وہ خیر کا
مکان جو تعمیر ہوا وہ سیر کا کارِ پرواز بھی سب خیر خواہ
جائفشاں منہم بنائے شر ، فدیہ سلطان علی الخصوص جو جو
مقرر اور منظور نظر ہیں باطن کے خوب بظاہر خوش اسلوب
لسانِ شاخ پر ثمر ہیں ۔ نواب اعظم الدولہ ، عظیم اللہ خاں بہادر
شیدائے شہریار نام پر نثار ، یادگار روزگار ہے ، حسبِ ارشاد
اس سب عمارت کی بنا ڈالی ، وہ ترکیب نکالی کہ غریباں
محتاج آسودہ حال ہوئے ، تاحشر نام رہے گا ، جہاں
تحسین و آفریں کہے گا ۔ شرف الدولہ کو خیر خواہ و راز داری

سے شرف و افتخار ہوا۔ بدولت عنایت خردی نائب اختر
تاجندہ سرکار ہوا۔ قمر الدولہ کی نشانِ ارادت و مجبہ سائی
صفہ جبین پر ماہ آسا نمودار ہے۔ بندگانِ خاص میں
ہلال عید سا انگشت نما ہے۔ متین مدبر، مطیع و خدمت گزار
ہے اور رفیق الدولہ رفیق بالتحقیق، شب و روز بحرِ ارادت
میں غریق ہے۔ اسی سے بیڑا اس کا پار ہے، آقا پرست
و فادار ہے۔ راجا ہر ایک دیانت دار امانت شعار۔ فن
سیاق میں طاقِ شہرہ آفاق ہے۔

غرض کہ عجب جلسہ ہے ہر شخص بے مثل ایک سے ایک اچھا
ہے۔ اس مجمع کو جامع المتفرقین رب العالمین، اپنے حفظ و امان میں
رکھے۔ شاہنشاہِ زمان کو بہشت و جاہ مع مرشد زادہ عالم پناہ صحیح و سالم
جہاں میں رکھے۔ شرق سے تا غرب تابع فرمان آسمان و زمین ہو۔
بحق رب ذو المنن و بہ لصدق پنج تن، پھر وہ جملہ شروع ہوا، اب یہ شہر
غوب ہوا۔ سب کو مرغوب ہوا خوشنویس یہاں اس قطع کا قطعہ لکھتے ہیں
اگر میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے۔ [

شہر نفیس، مجمع رئیس، ہرفن کا کامل، یہاں حاصل ہے خوشنویس
حافظ ابراہیم صاحب سا، اس قطع کا قطعہ لکھا، جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے،
اپنے لکھے کو روتے، اشکِ حسرت سے وصلیاں دھوتے، مرزائی صاحب کا
یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا ان کی نظر پڑ جاتا، نیریز، بریز، بریز کہتا۔ یا دوتا
رقم ہیرا کھاتا، مرثیہ خوان جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا
ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم البثوث استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال ہم
ہینچایا۔ اس طرح کا دھڑت، خیال، ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نایک کے دم و
خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے، جو اس میں آیا پھولا پھلا، وہ
اُن کا پیرو ہوا، اور جس نے ڈھنگ جدا کیا، وہ ٹکسال باہر، بد رنگ ہوا۔ اگر
تان سین جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا، بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔ ہزاروں

شاگرد، جگت استاد ہوا، مولوی سب میں پر نژاد ہوا۔ امیروں میں حسین علی خان، بلبل ہزار داستان، خوش الحان، مرثیہ گو، بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا، اس کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب، سکندر طالع، بصورت گدا۔ بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا، عرصہ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔

طیب ہر ایک مسحائی کرتا ہے، تم باذنی کا دم بھرتا ہے، جسے دیکھا بقراط، سقراط، جالینوس زمان ہے۔ اس معنی میں یہ خطہ رنخک زمین یونان ہے۔ میرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بگرد بر سر گرم ثنا ہوئے۔ شاعر زبان داں ایسے کہ عربی اور خاقانی کی غلطی بتائی۔ فردوسی و انوری کی یاد بھلائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی، اور روز مرے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا، فصحاے شیراز و اصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے۔ اپنے قبیح پر منفعل ہوئے، اس زبان کا محسن جان گئے، زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا، سیکڑوں کو استاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش بانی، شرافتانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے، مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔

فرنگی محل کا حال کیا لکھوں۔ کہاں زبان و دست کا یارا جو شمع لکھتا۔ مولوی فاضل عدیم المثال، ہر شخص جمیع علوم کا استاد، کتب دسی ابتداء سے انتہا تک یاد منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پر تو فیض جہاں میں روشن۔ مولوی مبین دور بین، سراج انجمن۔ مولوی ظہور اللہ، سبحان اللہ، ایسے فقیہ محقق کہاں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں۔ ادھر رکن دین بلا کہ میر سید محمد مجتہد مستند، مرزا کاظم علی متقی (خوند محمد رضا، رضاے خدا کا جویا، حامل قرآن۔ ہمہ دان، کسی علم میں عاری نہیں۔ روئے زمین پر آقا محمد تبریزی ساقاری نہیں۔

مگر وہ جوشل ہے، نیک اندرید، یہ اصل ہے، لب معشوق مولویوں سے۔ وہ رنڈیاں، پری شمائل، زہرہ پیکر، مشتری خصائل، اس ناز و انداز، سحر کرامات غمزہ عشوہ ادا، گات بانگی کہ ہاروت اور ماروت تو کیا، معاذ اللہ اگر سب فرشتے، عرش سے

فرشِ خاک پر آئیں، اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں۔ گھڑی بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے۔ تو بہ نصوحا ٹوٹے۔ اُن کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لولی چرخ ان پر نثار ہے۔ ہر ایک حورِ کرمار ہے، خوش مزاج، مردم شناس، روزِ مرہ شستہ، دمِ تقریر رمز و کنایہ، اسی کوچہ کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

کلا نوت قوال بے مثال، چھو خاں غلام رسول، سب کو موسیقی میں کمال حصول، شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے۔ پٹے کا موجد ہوا۔ سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبیلہ ایسا بجایا کہ پکھا دج کو شرمایا۔ پتنگ ایسا بنا، ایسا لڑاکہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستر، پھتر تار ڈور کا، پتنگ خیراتی یا پھنگا کے ہاتھ کا، لڑائی کی گھات کا، رستم کی عافیت تنگ کرنے والا، منحنی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمد نے ایسا لڑایا، عمداً اتنا بڑھایا کہ کردہوں سے عبادت پھوٹی، دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی۔ آنکھ بچا کر پٹیا توڑا۔ فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مردان بیگ مانجھا دینے والا دیکھا نہ سنا، غرض کہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں، اور ایجادِ طبیعت سے کاریگروں نے نکالیں۔ سلف سے آج تک نہ ہوئی تھیں۔ زر دوزی ایسی بنی، یہ باریکی چھنی، کہ باہر بند اور گی کی پتی جو پائیں، بجائے جیفہ و سرچ سر پہ لگائیں۔ جوتا خورد نوک کا ببر علی نے اس نوک جھونک کا بنایا کہ جہاں کو پسند آیا، آرام پائی جس کے ہاتھ آئی۔ دل نے چہیں پایا۔

چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر یہ لوگ نظر سے نہ گزریں اور تو اور شہدا پیر بخارا کا لٹا سا سید الشہدا کا شیدا، برس روز میں جو پیدا کیا عشرہ محرم میں محتاجوں کو نذر حسین کھلا دیا، یہ یکرنگی مزاج میں سمائی، تمام سن جوا کھیلا۔ دوائے کے داؤ پر ادھی نہ لگائی۔ ایک روپیہ ہوا خواہ سو کہہ دیا پو سیکڑوں داؤ منبے گئے، منہ سے نہ پنچے گئے۔ دہاں بھی ایک چوک لگا رہتا ہے۔ آدمی کے پھکے چھٹ جاتے ہیں۔ جب وہ لوگ نظر آتے ہیں۔ مشائخِ فقیروں کے مزارِ خوب، خوابِ راحت میں آسودہ۔ سالک و مجذوب، شاہِ مینا، شاہِ پیر محمد شاہ خیر اند، ایک سبحان اللہ، بظاہر مردہ حقیقت میں جیتے ہیں۔ اشیائے

لطیف، کھلتے پیتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمن برگزیدہ یزدان، عالم باعمل، درویشِ کامل، خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عدیل، نہ نظیر۔ خواجہ حسین و حسن سرگردہ انجمنِ طبیعت بس کہ مصروف باختصار ہے۔ ایک ایک فقرہ لکھا ہے۔ وگرنہ ان بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے مگر شعرے

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اس پر عمل کیا، منصف سے انصاف طلب ہیں، ہٹ دھرم سے کیا کہیں، جھوٹے کے روبرو سچا رو دیتا ہے۔ بالفرض معترض کہے، یہ لوگ کہاں کے تھے، تو یہ جواب شافی کافی ہے کہ یہ شہر ایسا تھا، جیتے جی یہاں سے نہ نکلے، مر گئے۔ پر یہیں رہے اور یوں تو، مصرع

کس نہ گوید کہ دوزخ من ترش است

جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکوسے۔ کسی نے کبھی سُنی ہو سنا۔ لکھی دیکھی ہو، دکھائے۔ عہدِ دولتِ بابر شاہ سے تا سلطنتِ اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے، نہ چوٹے آگ، نہ گھڑے میں پانی، دہلی کی آبادی ویرانی تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے روز مرے لہجے، اردو کے معانی کی فصاحت، تصنیفِ شعرا سے معلوم ہوئی۔ یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی، نہ اب تک وہاں ہے۔ قطع نظر اس سے لوگ اس خلقت کے گرہ سے کھوئیں اور جلسہ کریں۔ چنانچہ ایک بندے کے شفیق جگت آشنا جناب مرزا محمد رضا، مجمعِ خوبی از پاتا فرق، تخلصِ برق۔ فی الحقیقت کلامِ بلاغت نظامِ ان کا، صاعقہٴ خرمین ہستی حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار ان کے روبرو کا سد ہے۔ جوان خوشرو، بہادر آشنائے بامزہ، نیک خو، شبِ ماہ صحبتِ مشاعرہ، بدولت خانہ مرزا معین ہے۔ رئیسِ امیرِ صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اس مکانِ وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلت ہوتی ہے کہ شمشک سے بار پاتی ہے، جب پنکھے کی سعی اٹھاتی ہے، سخنِ سنج، بیرنج خوش گو، نازک فہم، باریک بین، نیکو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے وہ لوگوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ تلامذہ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے مدارس، دبیرم گوریاں، ورق لگی، کتھا بسا، چونا سنگ مرمر کا، متواتر قبل از

غزل خوانی، افیون کا چرچا ہو جاتا ہے۔ کوئی پیتا ہے، کوئی کھاتا ہے۔ اگر چاہ کسی کو چائے کی ہوئی، دودھ پیتے بچے تک خیر چائے موجود کر دی۔ ہمیشہ صبح اُس شام کے جلسے کی ہو جاتی ہے، طبیعت نہیں گھبراتی ہے۔ گھر جانے والوں کو صدائے مرغِ سحر ندائے اسد اکبر آتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کے قہر ہیں، مگر یہ بزرگوار زینتِ شہر ہیں اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہفت ہزاری ہیں؟ دلالِ مرقہ حالِ خوش پوشاک چمکے چمکائے اور ملکوں کے سیٹھ کر ڈرتی گاڑ میں لگوتی یا دھوتی۔ جب بڑا تکلف کیا، گاڑھے کا مرزائی پہن لیا۔ کلمہ حق کہنے والے کا مدار دار پر ہوتا ہے۔ منظور نگر اس کا محلہ ہے۔ یہ نکتہ بگوشِ دل و جان سن اسحق مر۔ حاسدوں کے خوف سے یہ مذکور مختصر کیا۔ اگر زیادہ لکھتا، قصہ ہوتا۔

کوٹاہ بین لکھنؤ کے نام سے چڑھ جاتے ہیں، رشک کھلتے ہیں افترا پردازی کرتے ہیں، جل مرتے ہیں۔ اچھے آغاز کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ اسد تعالیٰ مشقت کسی کی بیکار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ بعدِ دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بعصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دامِ ملکہ ہوا۔ اسد اسد یہ عجب شاہِ جمجاہ اریکہ نشین ہوا کہ حاتم کا نام صفحہ سخا سے، مثلِ حرثِ غلط مٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنادیا۔ عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کج خلق ہفت ہزار لوگ اعلیٰ بنائی محمد شاہ کی گور تھرائی شہزادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خواہوں کو صاحبِ نوبت کیا، چنڈول سکھپال میں چڑھایا۔ ہزار بارہ سے جلسے والی حوروشِ برق کردار، کبک زقتار، نغز گفتار، از پاتا فرق، دیائے جواہر میں غرق ہر دم دست بستہ، روبرو کھڑی رہی۔ جہان کی نعمت ان کے سامنے پڑی رہی۔ اسیلوں کو کرڈوں روپے دیئے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کئے۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی معارف و شانِ فلک ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کرڈ روپے اس منظورِ نظر نے صرف کئے، خزانے خالی کر محتاجوں کے گھر بھر دئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اس طرح کے بنوائے کہ فلک گرداں نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اندر آسن گلشنِ ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی چشم و گوشِ عالم نے دیکھی نہ سنی۔ دوازدہ، امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ

گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی۔ اندر آسن میں عطر کا حوض پھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔ مغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اٹھائے۔ خاصے والیوں نے لونگ، الائچی، زعفران کے، اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔ مکا خیاط مال دنیا سے مالا مال ہے، استغنا کا دم بھرتا ہے، سینا تو کیا ٹانگا کم بھرتا ہے۔ بجز غم حسین شہریار کو اندوہ و غم نہیں، کون ہے جو اس زمانے میں شاد و خرم نہیں۔ اربعین تک عزاداری ہوتی ہے۔ خلق خدا ماتم حسین میں روتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اس راہ میں صرف ہوتا ہے۔ چالیس شب کوئی نہیں سوتا ہے۔ تخمِ عمل نیک مزرعہ آخرت میں ہوتا ہے۔ روزِ تولد ہر امام، شبِ وفات جگر بندان خیر الانام لاکھ لاکھ روپیہ کا صرف ہے۔ اس کی ہمت کے آگے فیاضانِ گذشتہ پر حرف ہے۔ حسن صورت، شوکت و حشمت، جاہ و ثروت، جتنی دنیا کی خوبیاں ہیں، اللہ نے سب دی ہیں۔ ہر شب شبِ برات، روزِ عیدین کے ہیں۔ سیرِ دریا کی دفعتاً جو لہر آئی، گنگا سے نہر منگائی۔ اس میں بھی غربا نہال، کارندے مالا مال ہو گئے۔ بسکہ خامہ مولف اختصار رقم ہے، مگر جتنا اس کی صفت میں لکھئے، بہت کم ہے۔ لہذا اس غزل پر مطلب کو اختتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے ناچار تمام کیا۔

غزل

یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ
چونکہ میں اٹھتا ہوں اس پر کہہ کے ہائے لکھنؤ
تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کو چہ ہائے لکھنؤ
جامِ جم پر تفت نہیں کرتے گدائے لکھنؤ
یاد آجائیں جو وہ نعمہ سرائے لکھنؤ
چھوڑتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ
ہے سلیمان ان دنوں فرماں روائے لکھنؤ
دل سے اڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
رشتک کھا کھا گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ
یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب
اُن کے استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
کیوں گمانِ زلفِ بلیل کے ترانے پر نہ ہو
ہر محلے سے بچانا جی ہے عیسیٰ کو محال
جن دانش و وحش و طائر کوں سب محکوم ہو
دشتِ غربت میں کیا بباد و وحشت نے تو کیا

یہ رہے آباد یارب تائبہ دورِ مشتری
بلبل شیراز کو ہے رشکِ ناسخ کا سرور
میں کہیں ہوں، مانگتا ہوں پردے لکھنؤ
اصفہاں اس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ
الہی تجرمت سید ابرار احمد مختار دہ بقصدق امہ اطار، لکھنؤ کو آباد رکھ۔
دالی ملک کو یہاں کے کار فرما رعیت پرور سرور حکومت پر دل شاد رکھ۔ جب
تک گنگا جمن میں پانی ہے، یہ خطہ دلچسپ فرح افزا آباد رہے۔ فرد ۵
الہی لکھنؤ بستا رہے دور قیامت تک
اور مقلد یہاں کے موجد سے بہتر ہوتے
ہیں۔ شاگرد ہو کر استاد کے ہمسر ہوتے
ہیں۔ مطیع اس شہر میں اکثر رنگ کے
ہیں۔ نمونے نیرنگ کے ہیں۔ مگر ہمارے
شفیق و مہربان یک رنگ حافظ و غائب
یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب
مدظلہ، عزیز دل ہا ہمہ صفت موصوف ہیں
دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابق
ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا
الْعَاقِلُ يَكْفِيهِ الْإِنْشَارُ کا در رشک
انباے زمانہ تھا۔ اخبار کا پرچہ پھپتا
تھا ان کا پتہ نہ پھپتا تھا۔ خوشنویس
ایسے جمع ہوتے تھے، اور محرر اپنے
لکھے کو روتے تھے۔ اپنے اپنے انداز پر
بے نظیر یادگار آغا ہم پہلوئے پیرکلیں
ولایتی دل کو بیکل کرتیں۔ یہ تکلف کہ
لے پاؤں اشارے پر چلتیں۔ کا پنی
کو دیکھ کے جی کا نیتا۔ کیسا ہی زبردست
جوان ہو، بیفرمے ایک فرما نکالنے میں لانتا۔

اور مقلدی میں یہاں کے لوگ صاحب کمال ہیں۔
باریک ہیں۔ دقیقہ رس، نود فہم، نازک خیال ہیں۔ یہ
عجب ان صاحبوں کا لیکھا ہے۔ مقلدی میں موجود
ہو جاتے انھیں کو دیکھا ہے۔ اس شہر میں کسی مطبع سنگی
ہیں۔ گواہ نیرنگی ہیں۔ لیکن ایک ہمارے
عنایت فرما ہیں جناب میر حسن صاحب
صاحب حسن و جمال، جوان خوشرو و صاف
باطن، حمیدہ خصال، حسن خلق انکا خلق
میں مشہور ہے۔ عجب و نخوت ان کے
نزدیک سے دور ہے۔ موسم شباب ہے،
چہرے پر جوانی کی آب و تاب ہے۔
بیت ابرو، کاکل مشک بو، صفحہ رخسار
گل بے خاڑ از سرتا پا، ہر نشہ دیوان
و جاہت میں انتخاب ہے۔ محمود نگر
میں ان کا چھاپہ خانہ جدید ہے۔ عیاذاً
م باللہ پھولا گلشن بے خزاں ہے کہ دید
و نہ شنید ہے۔ عقل دنگ ہے۔ کارخانہ
کیا ہے، تختہ ارژنگ ہے۔ ایک سمت
خوش نویس ثانی آغا و میر ہفت قلم،

پتھروں پر ایسی جلا کہ دم نظارہ پیک نگاہ کا
 پاؤں پھسلتا۔ یہ صفا اگر بغور دیکھو تو قلم مو سے
 یہ لکھا ہے کہ ہر پتھر پر طور کا جلوہ ہے۔ کتب پارہ
 کے واسطے اچلے اموات کا نقشہ تھا۔ معجزہ عیسیٰ
 کے اثبات کا نقشہ تھا۔ شائقوں
 سے ارنی کی جب صدا آتی بیلن سے بے
 لن ترانی اور نہ ندا آتی۔ گو تحریر کا مقدمہ
 رمانے میں ہے۔ سیاہی میں روشنائی کا
 جلوہ اسی کا رغلنے میں ہے۔ جو کتاب
 چھپی وہ مرقع مانی کی تصویر تھی۔ حرت
 مٹنے کا کیا، حرف مثل نوشتہ تقدیر تھے۔
 شہروں میں اس چھاپے کی دھوم تھی۔
 گردشِ تقدیر کے معلوم تھی۔ دفعۃً فلک
 نے یہ چکر کھایا، حرف غلط کی طرح رگڑ
 کے شہر کو مٹایا۔ پروں سے بنات لنعش
 کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر نہ
 کسی کی خبر پائی۔

فقیر حسب اطلب ہماراج اسی
 پرشاد ناراین سنگ بہادر راج بنارس
 دام حشمتہم، بنارس میں آیا۔ تمکد صد شکر
 کہ ربیں والا جاہ رعیت پناہ غریب نواز
 غریبا پرور، باریک بین، قدر شناس، سخی،
 شجاع، سخن فہم، عدل گستر پایا۔ درنوا
 دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغل
 پارینہ منظور ہوا۔ پہلے غزم فساد سرور ہوا۔

ایک طرف فاضل صاحب درس و
 تدریس ہر ایک بنیظیر، شیر و شکر کی
 طرح باہم ایک جا ولایتی گل، جسے
 دیکھ کر جی بے گل ہو گیا ہے۔ کیسا ہی
 جوان قوی ہیکل ہو اگر چاہے پہاڑ
 اٹھائے، مگر ایک کاپنی میں ہاتھ
 کانپے۔ کیا دخل ہے جو بے دریاقت
 دس فرمے نکالے۔ اس کی ہر کمائی
 کو اگر کارمانی کہوں بدگمانی ہے۔
 بہزاد کی عقل کو حیرانی ہے۔ پرزے
 پرزے پر جلا ہے، صفا ہے، بد
 سحر کا ڈھلا ہے۔ کہیں پتھر صاف
 صاف، شفاف جن کے سنگ کا
 فرنگوں نظر نہ آئے۔ مردم دیدہ اگر
 اس کی صفا کو نظر بند کریں، آنکھ
 پھسل جائے۔ ہر پتھر ہنسنگ کوہ
 طور ہے۔ کسی پر جلی لکھا کوئی قلم
 ٹو سے مسطور ہے۔ کاری گر ہر ایک
 سرگرم فرماں روا ہے۔ کتب کہن
 از سر نو زندہ ہوتی ہیں، ثبوت اعجاز
 مسجائی ہے۔ سبک دست چست و
 چالاک استاد ہیں۔ طبع بلند ان کا
 مطبوع دل پسند اپنے کام میں
 ذی استعداد ہیں۔ بے لن ترانی
 کہتا ہوں، نئی تشبیہ ہاتھ آئی ہے۔

اس کی صحت کی خاطر بندہ کو لکھا۔
بجز اقرار چارہ نہ ہوا۔ انکار گوارا نہ ہوا۔
ہر چند یہ فسانہ بطور زمانہ ہر ایک
چھاپہ خانہ میں نیا نیا رنگ لایا جس
نے چاہا جس فقرہ پر پانی پھیرا۔ صفحہ
کتاب سے ہسایا۔ بقول فقیر جو مضمون
سمجھ میں نہ آیا یا نہ پڑھا گیا۔ وہ کذبوں
سے گرہا گیا۔ جو دت قلم شاہوں کی
ہوئی۔ اصلاح خط یاروں کی ہوئی شعر
اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیوں کا دل
تور کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں
یہ نہیں سمجھتے۔ مصرع

بقول فاطمہ و لطف سخن خداداد است
تَعْرِضُ مَنِ تَشَاءُ وَتَنْزِلُ مَنِ تَشَاءُ
فقیر نے اس کے دیکھنے میں عرق ریزی
از حد کی۔ حضرت کے خوف سے انتہا کی
کد کی۔ جس جگہ محل اور موقع پایا ہے کیا
کیا جملہ بڑھاپے میں بڑھایا ہے ایسی متاع
گراں بہا کس گنجینہ میں ہے۔ جس کی جگہ
ذی فہم قدر شناسوں کے سینہ میں ہے۔
الہی جب تک فلک کی حرکت سے چین
دنیا میں نسیم بہاری رہے کار فرما
سر سبز کام جاری رہے۔

بیلن کی سیاہی میں صاف کیفیت
روشنائی ہے۔ فریم ہر ایک رقع کی
تصویر ہے، لکھا مٹا نہیں گویا خط
تقدیر ہے۔ اکہی جب تک فلک کی
کل چلتی رہے اور کارخانہ چرخ رنگاری
رہے۔ یہ کار فرما سلامت رہے،
کارخانہ جاری رہے۔

نوٹ :- فسانہ عجائب کے بیشتر نسخوں
میں جو سرور کے سامنے چھپتے رہے عام طور پر
مطبع میر حسن واقع محمود نگر کا ذکر ہے جس میں
فسانہ عجائب کا پہلا ایڈیشن چھپا تھا لیکن افضل امپٹ
کے نسخے (مطبوعہ ۱۳۷۶ھ) میں جہاں لکھنؤ
کے مطبعوں کا ذکر ہے وہاں منشی محمد یعقوب
انصاری صاحب کے مطبع کا ذکر ہے۔ اس کے
بعد اس مطبع کا ذکر کسی نسخے میں نہیں ہے واضح
ہو کہ موصوف سرور کے خاص دوستوں میں سے
تھے اور اس عبارت میں سرور نے چند اہم باتوں
کی طرف اشارہ کیا ہے اسی لئے میں نے مطبع میر حسن
کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اس کو پیش کر دیا ہے۔
نیز یہ بھی کہ میرے نسخے کی بنیاد
یہ نسخہ بھی ہے۔

الطہر پور دینر

بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین، خرمین سخن، جناب قبلہ و کعبہ، استاد شاگرد
نواد، معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال، نیک سیرت، فرخندہ خصال، خرد آگاہ دانش

آموز، و یادگار جناب میر سوز، عرفی عصر، سعدی زماں، رشک انوری و خاقانی، آغا نواز شحین خاں صاحب عرف مرزا خانی، تخلص نوازش ہے۔ حقیقت حال یہ مقال ہے کہ طرزِ رنجیتہ اور روزمرہ اردو کا، اُن پر ختم ہے۔ شران کے واسطے وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے، اگر طفل مکتب کا شعر زبانِ معجز بیان سے ارشاد کریں۔ فیضِ دہان تاثیر بیان سے پسند طبع سبحان دائل ہو۔ فی زمانہ تو کیا سابقین جو موجدِ کلام کوس لمن الملکی بجاتے تھے۔ ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسبِ لفظی یا صنائعِ بدائع کے ہوں گے۔ وہ اُن پر نازاں تھے اور متاخرین فخریہ سند گردانتے ہیں، لہذا جس شخص کو فہمِ کامل یا اس فن میں مرتبہ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو آپ کا دیوان بحیثیتِ انصاف و نظر غور سے دیکھے۔ کوئی غزل نہ ہوگی جو ان کیفیتوں سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہِ ہزار نعمت ہر شعر شاہدِ معانی، باکیفیتِ مطلع سے مقطع تک ہر غزل پری کی صورت اکثر اشعار آپ کے تبرکاً و تیناً بطریقِ یادگار بندے نے لکھے ہیں۔ جہاں لفظ استاد ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔

باعث تحریر اجزائے پریشیاں

و

سرگزشتِ مجمعِ دوستانِ مکلف ہونا، محبوب کا، بیانِ داستانِ مرغوب کا

حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق و محب موافق باہم بیٹھے تھے۔ مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار و کجروی فلکِ سفلیہ پرور، دونوں شعارسے سب بادلِ حزیں و زار اور ہجومِ اندوہ و یاس سے اور کثرتِ حرمان و افکار سے کہ ہر دم یہ پاس تھے۔ دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے۔ یہ ذکرِ بر زبان آیا کہ شعبدہ بازی پر بخ مکار از آدم تا ایندم یوں ہی چلی آئی ہے اور تفرقہ پردازی اس کی سولے رنج و محن زیادہ مشہور ہے۔ یہ اور بُرائی ہے مگر یہی غنیمت جلینے اور لازم ہے کہ اس کا بھی احسان مانے کہ تم ہم اس دم باہم تو بیٹھے ہیں۔ اُستادے جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں سو یہ دم غنیمت ہے یہ ہنسا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے اور واقعی شدتِ رنج و الم میں دوست صادق، یار موافق، ہمیشیں ہو تو کچھ خیال میں نہیں آتا ہے۔ اور صحبتِ غیر جنس میں تحتِ سلطنتِ تختہ تابوت سے بدتر ہو کے کاٹے کھاتا ہے۔ سعدی ے

پائے در زنجیر پیشِ دوستان یہ کہ بایگانگاں در بوستان
لیکن زلمنے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرتِ غم و شدتِ اندوہ و الم وہ
شخص باہم نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا ے
پھینکے ہے منجینقِ چرخ تاک کے ننگِ تفرقہ بیٹھ کر ایک دم کہیں ہو دیں جو مہکلام دو

جب سلسلہ سخن یہاں تک پہنچا، اس زمرے میں ایک آشنائے باصفا، پُر
مزہ بندے کے تھے۔ انھوں نے فرمایا ”اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی
ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی، طبیعت ہو، اور غنچہ سربستہ دل،
باہترانہ نسیم تکلم کھل جائے۔“

فرمانبردار نے مجھ اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا، چند کلمے گوش گزار کئے،
اگرچہ گریہ کردن را ہم دل خوش می باید۔ مگر اس نظر سے
ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں، کہا ”اگر بدبھی تمام تو اس پرانہ تقریر
کو از آغاز تا انجام قصے کے طور پر زبان اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت
منظور نظر اہل بصر ہو، لیکن تقصیر معاف ہو، لغت سے صاف ہو۔“
بندے نے کہا ”طبیعت ابناے روزگار بیشتر متوجہ عیب جوئی و ہنر لوشی
ہے۔ بقول دلگیر شعرے

تج کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر اور یہاں حسن شناسان سخن تھوڑے ہیں
وہ بولے ”چشم داشت صلہ طلب، اجرت کسی سے متصور نہیں، فقط ہماری
خوشی مد نظر رکھ، جیسا رطب و یابس کہے گا، ہمیں پسند ہے، بشرطیکہ جو روز مرہ اور
گفتگو ہماری تمھاری ہے یہی ہو، ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے،
دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے
پھریں۔“

بندے نے کہا ”یہ تو مقدمہ تحریر ہے۔ اگر سرکار کے کام آئے، جائے تقریر
نہیں، مگر جلدی نہ کرنا، بوقت فرصت لکھوں گا۔“

وہ تو یارِ شاطر نہ بار خاطر تھے، قبول کیا۔ اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا
قدم فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخر الامر بمقتضائے عادت تلاشِ معاش کے چیلے میں
فلک تفرقہ پرداز، گردونِ عربہ ساز نے صورتِ مفارقت کا دکھائی، ہاجرت استقبال
کو آئی۔ مسرت ۵

بوقتِ لقمہ خوردن لے مسرت گفتہ بہا ہم کہ روزی می کند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنِ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وصحابہ وسلم بارہ سے چالیس تھی، آنے کا اتفاق مجبور کوردہ کاپنور میں ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوج و پھر ہے، اشرف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزت گزریں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزلِ سخت گھبرایا کلیجہ منہ کو آیا، قریب تھا جنوں ہو جائے، تیرہ بجتی سے روزِ سیاہ پیش آئے، لیکن بہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقت، ارسطو فطرت، بقراط حکمت، حکیم سید اسد علی صاحب شیرِ بشیہ علم و کمال سخن فہم، خوش خصال، طبع سودا خیز اور سر جنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی، وہ اکثر حالِ فقیر دلیگر پر الطاف و کرم فرماتے تھے۔ تدبیریں نیک و احسن دافع رنج و محن بتاتے تھے۔

ایک روز ان سے بعد اظہار حال مکلفِ فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ "ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں" سن کے فرمایا "بیکار مباش کچھ کیا کر" میرے تیر نہیں پیر تم کا ہلی اللہ رے نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہئے اس وقت یہ کلمہ تو سن طبع کو تازیانہ ہوا، اگرچہ اس چمچ میز کو یہ یارا نہیں، کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانے کو بہ نظرِ شاری کسی کو ملے۔ اگر شاہجہان آباد کہ مسکنِ اہل زبان، بیتِ السلطنت ہندوستان کبھی تھا، وہاں چند بود و باش کرتا، فطیموں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا۔ جیسا میرا من صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیرا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن کے حصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں پر محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پریں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کالموں کو یہودہ گوئی سے انکار، بلکہ ننگ و عار ہے مشکِ آست کہ خود ہوید نہ کہ عطار بگوید۔ وہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی۔ لیکن تحریر اس کی ایفائے تقریر ہے۔ یہ قصہ دھچپ بے نظیر ہے۔ امید ناظرین پرتمکین سے یہ ہے کہ بجشمِ عیب پوشی و بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرما کر جہاں سو یا غلطی پائیں بہ اصلاح مزین فرمائیں۔ کیسی ہی طبیعت عالی ہو ممکن

نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو، اس کے مطالعہ سے خاطر عاقل اگر شاد ہو، عاصی دعا
 خیر سے یاد ہو۔ نیازمند کو اس تحریر سے نمودِ نظم و نثر جو دت طبع کا خیال نہ تھا۔
 شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل، عربی
 فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا
 تھا، رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔ "فسائے حجاب" اس کا نام رکھا۔
 اِنَّهُ الْمُبَيِّنُ الْاَوَّلِيَّةِ الْمَاءَبِ، عنایت ایزدی سے تمام ہوئی کتاب۔

DATE LOANED

Acc. No. _____

[illegible]

آغاز داستان

نادر بیان صاحبِ رسلطانی مالکِ اوزنگ کامرانی
زینتِ تاج و تخت شاہنشاہِ گردوں بارگاہِ فیروز خبیث
پیدا ہونا شاہزادہِ جانِ عالم کا اور شادی ماہِ طلوع سے

مثل ہی سے نہ الفاظِ لازم سے خیالی ہے ہر اک فقرہ کہانی کا گواہ بے مثالی ہے
یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ
گرہ کشایانِ سلسلہ سخن و تازہ کنندگانِ فسانہ کہن، یعنی مورخانِ رنگین تحریر و
مورخانِ جادو و تقریر نے اثنیہ ہندہ قلم کو میدانِ دیسے بیان میں باکرشمہ سحر ساز
و لطیفہ کے حیرت پرداز گرم غنان و جولان یوں کیا ہے کہ سر زمینِ فتن میں ایک
شہر تھا مینو سواد، بہشتِ نژاد، پسندِ خاطر محبوبانِ جہان، قابلِ بود و باش
خوبانِ زمان، شمیمِ صفت، اس کی معطر کن دماغِ جان مسکنِ التبابِ قلبِ دافع
خفقان، زمین اس کی رشکِ چرخ بریں، رفعت و شانِ چشمک زن بلندی فلک
ہفتہیں، گلی کوچہ خجستہ دہ گلشنِ آبادی گلزار، لسانِ تاختِ چین، بازار ہر ایک بے
آزار مصفا ہموار، دکانیں نفیس، مکان نازک پائدار خلقِ خدا با خاطر شاد، اسے

فصحت آباد کہتے تھے۔ سب طرح کی خلقت، رغبت سے اس میں رہتی تھی۔ والی ملک وہاں کا شاہ گردوں دقار پرتکین با افتخار، سکندر سے ہزار خادم، دارا سے لاکھ فرما نبردوار، قباد شکوت، کا دس حشم، مالک تاج و تخت، دالا مرتبت عالی مقام شاہنشاہ فیروز بخت نام۔

سورج بخشش سے اس بحر جود و عطا کے، سائلان لب تشنہ، سیراب اور نازہ غضب کے شعلے سے دشمن بد باطن، جگہ سوختہ بیتاب، دبدبہ داد دہی و غفلت عدالت سے دشمن و دوست جانی۔ چور مسافر کے مال کا نگہبان، ڈکیتوں کو عمدہ پاسبانی، ملک دافر، سپاہ افزوں از قیاس، خزانہ لا انتہا، وزیر و امیر جانفشاں، تاج بخش و باج ستاں، محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں، داد و فریاد آہ و نالہ سے کسی کو کام نہیں، رعیت راضی، سپاہ جاں نثار، دوست شاداں، دشمن خائف، شمع کا چور سر محفل لرزاں۔ اس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چور محل نہ ہوتے پاتا تھا۔ دزدِ حنا کا رنگ نہ جمتا تھا، سردست ہاتھ باندھا جاتا تھا، آنکھ پڑانے سے لوگ چشمک کرتے تھے۔ کارِ خیر سے اگر کوئی جی چراتا تو تہمت اس پر دھرتے تھے۔

لیکن بایں حکومت و ثروت کا شانہ امید کا چراغ گل تھا، اولاد بالکل نہ تھی، خواہش فرزند در دل۔ نہ ہونے کی کاہش متصل۔ حسرت پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ۔ ہر ساعت بر زبان۔ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ كَدُّنِكَ وَلِيًّا۔ وظیفہ دہان۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثل گدا دست دراز۔ ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے بانیاز۔ آغوش جناب باری میں تضرع و زاری اُس کی منظور ہوئی۔ لاولدی کی بدنامی دور ہوئی۔ ساٹھ برس کے سن میں گوہر آبدار دُر شاہوار صدفِ بطنِ بانو سے نجمستہ اطوار سے پیدا ہوا، پھوٹا بڑا اس کی صورت کا شیدا ہوا۔

اس روح افزا کا فیروز بخت نے جان عالم نام رکھا، شب و روز پرورش سے کام رکھا۔ حُسنِ امد نے یہ عطا کیا کہ نیر اعظم چرخ چہلم پر رعبِ جلال سے کھڑا آیا۔ اور نا احمود دارغ غلامی، تابشِ شاہدہ نہ لایا۔ اس نقشِ قدرت پر

تصویر مانی و بہزاد حیران اور صناعی آذر کی لیے بُبتِ حقیقت کے روبرو پشیمان،
کاسے سرسراہٹ شورِ جوانی، زورِ شباب سے معمور۔ آنکھیں جھپکاتے والی دیدہ غزالانِ
خق کی، شرابِ عشق کے نشہ سے چکنا چور، چہرے پر جلالِ خاہی، شوکتِ جاں نپاہی
نمایاں، حسنِ درخشندہ کی تڑپ، بہ از انجم و اختر تاباں۔ مصحفی ۵

اے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

مرزا قتل۔ ع پارہ خواہ شد ازیں دست گریبانے چند

لکھا ہے کہ جب وہ ہر سپہر سلطنت بُرجِ محل سے جلوہ افروز ہو، زینتِ بخش
کنارِ مادر و زریبِ دہِ آغوشِ دایہ ہوا۔ درِ خزانہ و محبس کھلا۔ ہزار ہا قیدی رہا ہو
اپنے گھر آیا اور سیکڑوں لونڈی غلام نے فرمانِ آزادی پایا۔ شہر میں محتاجِ ناپید تھا
مگر اشرفی روپیہ حاجیوں کے واسطے مکہ معظمہ اور زاروں کی خاطر کربلائے کرم میں بھیجا۔
ایک سال کا خراج رعیتِ محتاج کو معاف ہوا۔ شہزادے کے نام کے گنج آباد ہوئے۔
مسجدیں، مدرسے، ہمانسرا، مسافر خانے تعمیر ہوئے، اہل شہر دل شاد ہوئے۔

بخمی، پینڈت، جعفر داں حاضر ہوئے۔ بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی
”ہمارا ج کا بول بالا، جاہ و حشم مرتبہ دو بالا، اعلیٰ رہے۔ ہماری پوہتی کہتی ہے بھگوان
کی دیا سے، شہزادے کا چندر ماں بلی ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے۔ دیگ تیگ کا
مالک رہے، دھرم مورت یہہ بالک رہے۔ جلد راج پر بہا ہے۔ پرہمی میں دھوم مچے۔
ایسی شادی رچے۔ مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی۔ سینچر پاؤں پڑے گا۔ ایک
پنکھیر سوئے کے بن میں ہات آئے گا۔ تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنئے گا کہ
راج پاٹ جھڑا، دیس بدیس لے جائے گا۔ ڈگر میں شہزادہ بٹھکے، کوئی پاس نہ ٹھکے۔
ساتھی چھٹیں اپنے ڈیل سے ڈانوا ڈول رہے پھر ایک منکھہ ٹھا کر کا سیوک کر پا کرے،
راہ لگائے۔ کوئی کلنکن لو بھی ہو، کشت دکھائے۔ وہاں سے جب چھٹے رانی ملے ہاندر،
وہ چرن پر پران دارے۔ پتا اس کا گیانی گن کی تکھتی دے، اس سے کئی بلچہ مارے،
دکھ میں آڑے آئے، بگڑے کلج بنائے۔ جب اس نگر پہنچے، جس کے چت میں گھر چھوٹے
تولا بہت ہو، دُرب گھنے ہاتھ آئیں۔ دوسرے کلیس ہو جائیں پر ایک ہتی من کا
کیٹی، استری پر دوچیت ہو، گھٹائی کرے، جھڑیں، زناری لڑیں، اور کچھ جل میں بھی

ہل چل پڑے۔ پرستی لوگ چھٹ جائیں، نگر نگر کھوج میں پھر آئیں، سب پھڑے مل جائیں، ماما پتا کے ڈھگ آئیں استری تین ہو، دو کا پر، مان رہے۔ ایک کی ہین ہو۔ بڑا راج کرے، دیا دھرم کے کاج کرے۔ گتیاں کی کرپا سے جان کی کھیر ہے، بڑی بڑی دھرتی کی سیر ہے۔“

یہ سن کر بادشاہ گو نہ ملول ہوا۔ پھر مستقل مزاجی سے یہ کلمہ فرمایا **فَعِلِ الْحِكْمَةَ لَا يَخْلُو عَنْكَ اِلَٰهٌ حَكَمْتَ اَنْ سَبَّكَ بِقَدْرِ حَالٍ**، فراخ و کمال مالا مال کیا خلعت و انعام دیا۔ بہ بشارت تمام سرگرم پرورش صبح و شام رہا۔ کوئی برسوں میں بڑھتا ہے وہ نہال نو دمیدہ بتان سلطنت گھڑیوں بلند و بالا ہوتا تھا۔ چند عرصہ میں بچوں و قوت الہی وہ ہاتھ پاؤں نکالے۔ دس برس کے سن میں ہرن کے سینک چیر ڈالے۔ دست و بازو میں یہ طاقت ہوئی کہ درندہ فیل مست ہوا، جوان سنا پھر زیبا بستم شوکت بمرتبہ زبردست ہوا، جو اس کا روئے منور دیکھتا۔ یہ کہتا۔ **لَا اَعْلَمُ**

منہ دیکھو آئینہ کا تری تاب لاسکے خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

نصویر تیری کھینچے مصوّر تو کیا مجال دستِ قضا تو پھر کوئی تجھ سا بنا سکے

تحصیل علم و فضل میں شہرہ آفاق ہوا، جتنے فن پہ گری ہیں ان کا مشاق کا مل، جمیع علوم ہر فن میں طاق ہوا، جل جلالہ، باپ و سیا بیٹا ایسا خوب، محبت میں بسانِ یوسفؑ و یعقوب علیہم السلام جب وہ ہلالِ سپہر شہریاری بدر کا مل ہوا اور چودھواں برس بھر گیا، جوانوں میں شامل ہوا۔ بصلاح و صواب دیدار کان سلطنت و ترقی خواہان دولت شادی کی تجویز ہوئی۔ بتلاش بے شمار و تجسس بسیار ایک شہزادی پری پیکر، خوبصورت، نیک سیرت، حور نژاد، گل اندام، سینیں برشکب شمشاد، ماہ طلعت نام دودمانِ والا سے مقرر ہوئی۔ وہ جو آئین بادشاہی طریقِ فرماں روائی ہے اسی طرح اس کے ساتھ اُس اختر تابندہ کو ہمقران کیا۔

ترانہ سنجی عندلیب خامہ گلشن بیان

سواری شہزادہ جان عالم میں اور خریدنا توتے کا، اور کج بختی ماہ طلعت کی
توتے سے اور مذکور حسن انجمن آرا اور شہزادے کا عاشق ہوتا

بلبل نواسنج، ہزار داستان، طوطی خامہ زمزمہ ریز، خوش بیان لکھتا ہے کہ بعد
رسم شادی، سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حکم، شاہِ ذوی الاقدار سے حاصل
ہوا۔ گاہ گاہ شام و بگاہ جان عالم سوار ہوئے لگا۔ ایک روز گذر اس کا گزری میں
ہوا۔ ابنوہ کثیر جہم غفیر نظر آیا اور غلغلہ تختیں و آفرین از زمین تا چرخ بریں
بلند پایا۔ شہزادہ ادھر متوجہ ہوا۔ دیکھا ایک مرد پیر نحیف، نثر انٹی برس کا سن،
نہایت ضعیف، پنچرا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ اس میں ایک جانور مانند ساکنان
جنان سبز پوش، خانہ بدوش، با منقار گلنار لطیف لطیف، رنگین اور نکستہ قابل
تعریف پرتمکین۔ مثال طوطی پس آئینہ بیان کرتا ہے۔ لا اعلم

در پس آئینہ طوطی صفت داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم
شہزادے کے دیکھتے ہی توتا اپنے مالک سے بولا "اے شخص، کوکبِ بخت
تیرا افلاس کے بوج تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا، طالع بر سر باری و زمانہ آمادہ
مددگاری ہوا، دیکھ ایسا شہزادہ حاتم شعار ابر گربار متوجہ اس مشت پر، ذرہ بے
مقدار پر ہوا ہے، وہ بے کار شے کار گاہ بے ثبات میں ہوں جس کا طالب نہیں
کیں۔ بجدے کہ جانور ہوں اور بلی کا کھا جا۔ نہیں مگر جو یہ نظر عنایت کرے ابھی تیرا

ہاتھ پُر زور ہو۔ دامنِ گہر سے بھرے۔“

جان عالم نے یہ سخن ہو شرابا کلمہ حیرت افزا کو سن، تو تے عقل کے اڑا، پنہرا
اس طائرِ ہمہ داں جانورِ سحرِ بیاں کا ہاتھ میں لے کے، مالک سے قیمت پوچھی، تو تے
نے کہا۔ مولف ۵

کب لگتا ہے کوئی اس دلِ بجاں کا مول سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول
مگر جو حضور کی مرضی۔“

جان عالم نے لاکھ روپے خلعت کے سوا غایت کے اور پنہرا ہاتھ میں لے،
دولت سرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا ماہ طلعت کو توتا دکھا، یہ مصرع انشا کا پڑھا۔
انشاء بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لے

تو تے شہزادے کو سخنانِ دلچسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شہرِ خوب
نمہائے مرغوب سنا، اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگے،
دربار کے سوا، جہان نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پنہرا تاکیدِ حفاظت ماہ طلعت کو نوپ
جاتا اور دربار سے دیوانہ وار، بشوقِ گفتار، بقرارِ جلد پھر آتا۔

ایک دن شہزادہ دربار گیا توتا محل میں رہا۔ اس روز ماہ طلعت نے غسل
کیا اور لباسِ مکلف سے جسمِ آراستہ، زیورِ پُر تکلف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر
بیٹھی، ہوا جو لگی، آئینہ میں صورت دیکھ خود محو تماشا ہوئی۔ بحرِ عجب و نحت میں آشنا
ہوئی۔ خواصوں سے، جلیسوں سے، جو جو دمازِ محرم ماذ تھیں، اپنے حسن و صورت کی
داد چاہی۔ ہر ایک نے موافقِ عقل و شعور تعریف کی۔ کسی نے کہا "ہلالِ عید ہو"
کوئی بولی "خدا جاتا ہے، دید ہو نہ شنید ہو، اللہ تعالیٰ نے بایں کثرتِ مخلوقات
تمھارا ہمسر از قلم جتن و بشر بنایا نہیں، پر ہی نے یہ قدرِ بالا، حور نے یہ حسن کا
جھمکڑا پایا نہیں۔"

جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا "توتا بہت عقلمند، ذی شعور، سیاح
نزدیک و دور ہے، اس سے پوچھنا ضرور ہے، مخاطب ہوئی کہ "لے مرغِ خوشخو و طائرِ
زرد لباس سرخو، بذلہ سنج، بیرنج، سچ کہنا، اس سچ دھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ
دہم و خیال کی نظر سے گزری ہے۔ نیرنگی چرخِ کج رفتار، فتنہ پردازِ گردوں و اژدوں

عیاں ہے۔ آگاہ سب جہاں ہے۔“

اس وقت توتا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر بیٹھا تھا، چپ ہو رہا۔ شہزادی نے پھر پوچھا۔ تو نے بے اعتنائی سے کہا ”ایسا ہی ہو“ — یہ رنڈی معشوق مزاج، طرہ یہ کہ شہزادے کی جورو، شوہر مالک تخت و تاج، برہم ہو کے بولی۔ ”میاں مٹھو جینے سے خفا ہو، جو ہمارے رو برو چیا چیا کے گفتگو کرتے ہو۔“

تو نے کہا ”سوال و جواب اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا اور غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے، کیوں الجھتی ہو، شاید تمہیں سچی ہو۔“

پھر تو شعلہ غضب کا نون سینہ شہزادی میں مشتعل ہوا، کہا۔ ”کیوں جانور بدتمیز، ناجیز، تیری موت آئی ہے، کیا بیہودہ طیس میں مچائی ہے، واہی بک رہا ہے ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا۔“ تو نے کے منہ سے نکلا ”کیوں اتنی خفا ہوتی ہو، اپنا منہ ملاحظہ کرو، صاحب تم بڑی خوبصورت ہو۔“ یہاں تو یہ حیص و بیص بھتی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا، عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پڑ آب و باد لب کباب غیظ میں آ، تھرا تھرا آتے سے بحث رہی ہے۔ شہزادے نے فرمایا۔ ”خیر باشد۔“

توتا بولا ”آج نرا ضر ہے، خیر بخیر، مگر چندے حیات مستعار اس وحشی کی، اور آب و دانہ قفس میں پینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گریہ غضب شہزادی سے مجروح پرداز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے مگر پنہرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا، بحسرت و امنوس یہ فرماتے۔ انشا۔ ع۔“

”توتا ہمارا مرگیا کیا بولتا ہوا۔“

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی شہزادے سے کہا کہ ”اگر میری بات کا توتا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی، جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔“

جان عالم نے کہا ”کچھ حال تو کہو“

تو نے گزارش کی کہ ”حضور! یہ مقدمہ غلام سے سنئے، آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر۔ بقاظر دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں ہے پھر مجھ سے فرمایا ”تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا۔“ خدا

نہ کرے! اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتی، سوختنی و گردن زدنی ہوں بقول
میر تقی میر، شعر

بے جرم تہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو کچھ بات بُری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جان عالم نے کہا ”تم بھی کتنی عقل سے خالی، حق سے بھری ہو، تم تو پری ہو،

اور جانور کی بات پر اتنا آزدہ ہونا۔ گو گویا ہے پھر طائر ہے، نادانی اس کی ظاہر ہے۔“

میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل کے روکھی صورت بنائی

اور میں سے بولا ”خداوندِ نعمت جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے، ہمسر جس کا کوئی نہیں

وہ ذات وحدہ لا شریک، کی ہے، اس کے سوا ایک سے ایک بہتر اور بدتر ہے

وہ خود فرماتا ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ میں نے تو جھوٹ اور سچ

دونوں سے سچ کر ایک کلمہ کہا تھا، اگر راستی پر ہوتا، گردن کج کیے، سیدھا گور

میں سوتا۔ یہ سن کر وہ اور مجھوز ہوئی۔ مثل مشہور ہے، راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔

جان عالم نے مجبور ہو کر کہا ”جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہہ دو۔“

تو نے بہ منت عرض کی ”دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز مجھ

سے سچ نہ بلوایئے، میرا منہ نہ کھلوایئے، نہیں انجامِ راستی حضور کے دشمنوں کو دشت

نوردی، یاد یہ پیمائی، غریب الوطنی، کوچہ گردی نصیب ہوگی۔“

شہزادے نے کہا۔ ”یہ جملہ تم نے اور نیا سنایا، اب جو کچھ کہنا ہے، کہا چاہئے

باتیں بہت نہ بنائیئے۔“

اس نے کہا ”میں نے ہر چند چاہا، آپ رنج سفر، مصائب شہر شہر اندائے

غربت سے باز رہیں، کہ سفر اور سقر کی صورت ایک ہے، اس سے بچنا نیک ہے، مگر

معلوم ہوا کہ حضور کے مقدّر میں یہ امر لکھا ہے میرا قصور اس میں کیا ہے۔“ رفیع سودا ۵

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو سوزن تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنئے قبلہ عالم! یہاں سے برس دن کی راہ، شمال میں ایک ملک ہے عجائب

زرنگار، ایسا خطہ ہے کہ مرقع خیال مائی و بہزاد میں نہ کھینچا ہوگا اور پیر دہقان

فلک نے، مزرعہ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب، آبادی مرغوب۔ رندی، مرد حسین

طرحدار۔ مکان، بقور کے، بلکہ لوز کے۔ جواہر نگار، عقل باریک بین، شاہد سے دنگ ہو

خلقت اس کثرت سے بستی ہے کہ اُس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خوشید ہر
 سحر اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے۔ بدر کا مل دہاں دو دن تہیں رہتا۔ غیرت
 سے کاہیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے۔ دہاں کی شہزادی ہے انجن آرا۔ اس کا تو کیا
 کہنا! کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاق، جو شمع مذکور شکل و
 شمائل اس زہرہ جیں، فخر لعتان لندن و چین کا ساؤں۔ استاد ۵

ایک میں کیا خوب گردیکھے اسے حسن آفریں اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر ہے
 لیکن سات سو خواص، زریں کمر، تاج دہری بر سر، ماہر و عزیز مؤ سر گردہ
 خوابانِ جہاں، جانِ جاں آرام دل مشتاقان، اس کی خدمت میں شب و روز
 سرگرم خدمت گذاری، بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر اُن کی لونڈیوں کو شہزادی
 صاحبِ بچشمِ انصاف دکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں، یقین تو ہے چلو بھراپانی
 میں محبوب ہو کے ڈوب جائیں۔“

ماہ طلعت یہ سُن کے سُن ہوئی، سر جھکا لیا۔ جان عالم نے پنجرہ اٹھالیا، دیوان
 خلتے میں لے جا، مفصل حال دریافت کرنے لگا۔ ہر دم دم سر دل پڑ درد سے
 بھرنے لگا۔ موی جامی ۵

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیس دولت از گفتار خیزد
 در آید جلوہ حسن از در گوش ز جاں آرام بر بایز دل ہوش
 ز دیدن پیچ اثرے دریاں نہ کند عاشق کساں را غایبانہ
 تو نے کو شہزادے کی طرز گفتگو، رنگ رو، آنکھ کی تری، ہونٹ کی خشکی،
 دل کی دھڑک سے کہ یہ نشانِ عشق گمانِ خبط سب ہیں، ثابت ہوا کہ شہزادے
 کا دل پینڈے پڑے اور دماغ عقل سے خالی ہوا، خیالِ محالِ وصالِ انجن کرا
 بھرا۔ سخت نادم و خجل ہو کے دل سے کہا ”کیسخت نیاں نے“ حسن کے بیان نے
 غضب کیا، منتر کارگر ہوا، پڑھا، جن سر پہ چڑھا، حضرت عشق کا گزر ہوا، چاہا کہ بہ
 لطافت اخیل اس عزمِ بیجا سے باز رکھے کہا ”لے نادان، دشمنِ جان! یہ نقد
 لا حاصل ہے، عمداً اس کو چہ میں پاؤں نہ دھر، اپنے خون سے ہاتھ نہ بھر۔
 بقول مولف ۵

خدا کو مان، نہ لے نام عاشقی کا ترود کہ منفعت میں بھی اس کے ہیں سو ضرر پیدا
 بیان اس کا محال ہے، مگر مختصر سا یہ حال ہے، عقل اس کام میں دور
 ہو جاتی ہے، وحشت نزدیک آتی ہے، لب خشک، چشم تر، چہرہ زرد، دل خون ہوتا
 ہے، بھوک پیاس مرجاتی ہے، خواب میں نیند نہیں آتی ہے۔ جان شیریں تلخ ہو،
 کلیجے میں درد۔ آخر کو جنون ہوتا ہے، لخت جگر کھاتا ہے، خون دل پیتا ہے، مرم کے حقیقہ
 ہے۔ رقیبوں کے طعنوں سے سینہ فگار ہوتا ہے، لڑکوں کے پتھر دلوں سے سرگلزار ہوتا ہے،
 دن کو ذلت و خواری، شب کو انتظار میں اختر شماری۔ بیقاری سے قرار، سب کی نظر
 میں ذلیل و خوار۔ جنگل میں جی لگتا ہے، بستی اجاڑ معلوم ہوتی ہے، در بدر پھرنے میں
 دن تو کٹ جاتا ہے، تنہائی کی رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دل جلتا ہے، دیدے سے
 دریا ابلتا ہے، شجر تمنا بے برگ و بار رہتا ہے، پھولتا ہے نہ پھلتا ہے، جوانی کا گھن،
 پیری تک ادھیڑ بن رہتی ہے، گونگا ہیرا بن جاتا ہے، طبیعت سن رہتی ہے۔
 ابھی پہلی بسم اللہ ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو، لب پر آہ ہے۔ دیکھا نہ بھالا
 ہے، سیتے کے پار عشق کا بھالا ہے۔ آئینہ ہاتھ میں لے نہ تو دیکھو، نقشہ کیا ہے۔
 معشوق با وفا، گوگرد سرخ لعلِ سپید سے نایاب سوا ہے۔ کہاں ملتا ہے، خاک میں
 ڈھونڈتے ڈھونڈتے خواہاں ملتا ہے۔ یہ جو زلمے میں مشہور باہر و وفا ہیں، بانی
 صد جور و جفا ہیں، عشق کی سخت بے پیر ہے، ادا! نوجوان یہی ٹیڑھی کھیر ہے، سنا
 نہیں کوہ کن نے جان شیریں کس تلخی سے کھوئی؟ یوسف کی چاہ میں زلیخا نے کیسے
 کنویں بھانکے، کیا کیا روئی؟ مجنوں کو اس دشت میں جنوں ہوا لیلیٰ کا کیا بگڑا۔
 پردیز کا اس کوپے میں خون ہوا۔ شیریں نے کیا کیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اتنا بھی کوئی نہ بچھا!
 جامی ۵ غم چیزے رگ جاں را خراشد کہ گاہے با خدو گاہے نہ باشد
 ذلت اس کام میں عزت ہے، درد کا نام یہاں راحت ہے، دل اس کشمکش
 میں ٹوٹ جاتا ہے، رستم کا اس معرکے میں جی چھوٹ جاتا ہے، اسفندیار سا
 روئیں تن ہو، تو بوم کی طرح یگھل کر بہہ جائے۔ حسرت ہی حسرت رہ جائے۔ لوگوں
 نے ہزاروں سنج و صدمے اس کام میں اٹھائے، جب بعد خرابی بسیار ہی نا تجرب کا
 کملائے۔ لیکن یہ وہ مہما کام ہے کہ اس میں شاق اور مبتدی کی رائے ایک سی ہے۔

اس کا آغاز ہے نہ انجام ہے، ۵
عشق کے غم میں کوئی دوست گرفتار نہ ہو
دوست تو دوست ہے دشمن کو یہ آزار نہ ہو

مسدس

کیا میں اس کافر بدکیش کا احوال کہوں
زار کر دیتا ہے انسان کو یہ اور زبوں
یہی خوشخوار پیاکرتا ہے عاشق کا خون
رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جنوں
یہی خوریز تو خوشخوار ہے انسانوں کا
دین کھوتا یہی کافر ہے مسلمانوں کا
یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رونا ظالم
کوہ دکھلاتا ہے گلے، گہے صحرا ظالم
دردِ ہر خاک بسر چاک گریباں کر کے
جان لیتا ہے دے بے رُساماں کر کے
یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا
یہی فریاد کا حامی تھا تبرداری کا
تلخ کامی ہوئی شیریں کو اسی سے حاصل
کے بے پردہ وہ برباد ہزاروں محل
اس نے مجھوں سے بناء ہیں بہت دیوانے
گو کہ مشہور جاں اس کے ہیں سب افسانے
کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے
کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے عیاں ہوتا ہے
ناؤ یلی مضطر کا شتر بان یہ تھا
چاہ میں ڈال کے یوسف کا نگہبان یہ تھا
نجد میں قلیس سے پہلے ہی حدی خوان یہ تھا
جان ہر شیر کی لینے کو نیستان یہ تھا
حسن ہی جاتا ہے انداز کہیں ناز کہیں
دردِ دل ہے یہ کہیں سوز کہیں ساز کہیں

مثلِ فرہاد بہت مر گئے سر پھوڑ خیز
دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جانِ شیریں
پاسِ عذرا کے گیا اور کوئی دامنِ کے قریں
اس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشین

اس سے ملتا ہے جسے رنج و محن ملتا ہے

گورِ ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے
کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
جان پھوڑی نہیں جیتا جسے پایا اس نے
اور نیرنگ جہاں اپنا دکھایا اس نے

کامِ مُردوں سے یا ز ندوں کو ناکام رکھا

درد کا نام بھی بے درد نے آرام رکھا

اس کے افسانے ہیں دنیا میں بہت طویل
جس کا ہمدم یہ ہوا ہو گیا وہ خوار و ذلیل

اس کا بیمار پڑا رہتا ہے بستر پہ غلیل
دھونس دے دے کے بجا دیتا ہے یہ کوسِ حیل

رنج و ماتم کے سوا اور یہ کیا دیتا ہے

وصل کی شب سحر ہجر دکھا دیتا ہے

یہی اخفا ہے بعدِ زبِ رگِ ہر گل میں
سوز و نالہ یہ اسی کا ہے دلِ بلبل میں

یہی ہے جزو میں گر دیکھو یہی ہے کل میں
گر فرشتہ ہو تو آجاتا ہے اس کے جُل میں

خونِ بے مجرم زمانے کا بہاتے دیکھا

میلِ چتون پہ کبھی اُس کے نہ آتے دیکھا

ایک شتمہ ہے لکھا حال جو میں نے اس کا
جس پہ اس دیو نے الطاف کا سایہ ڈالا

دشتِ غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا
دوست بھی چھوٹتے ہیں شہر بھی چھوٹے اپنا

پاس جس کے یہ گیا خلق سے وہ دور ہوا

کون سا شیشہ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا

ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اس میں صال
لے گئے سینے میں فرقت کا سبھی درد و ملال

اسی کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بدرِ ہلال
کس کی طاقت ہے جو تحریر کرے اس کا حال

زیست کرنا غمِ ہجر اس سے ہے یہ سب کو خاق

جان دے دیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی ہائے فرق

وصل میں گومزا ہے، ہجر کا رنج و لے جانگزا ہے۔ چاہ کنویں جھکواتی ہے۔ یہ

وہ بیماری ہے جو جان کے ساتھ جاتی ہے۔ ہمیشہ سے اس کام والے، آہ و نالہ بر لب خاک بسر، چاک گریاں، سب رہے ہیں۔ اگر عاشق کی عزت و توقیر ہوتی تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی شے نہ ہوتی۔ کچھ کچھ ان لوگوں کے مرتبہ شناس قدردان ہیں، مگر ہر جگہ کہاں ہیں اور یہ قصہ جو میں نے کہا، فقط بات کی بیج کا جھگڑا تھا۔ ورنہ کہاں ملکِ زرنگار، گنجا، شہزادی عالی تیار۔“

جان عالم نے کہا ”استغفر اللہ اگر وہ جھوٹ تھا تو یہ فقرہ کب پچ ہے، یہ تو زی کھڑی بیج ہے توڑے“

خدا ہی کی قسم ناصح نہ مانوں گا کہا اب تو نہ چھوٹے گا دے کہنے سے میرا دل لگا اب تو اسی تقریر میں یہ حال ہوا کہ دل میں درد، پھرہ درد ہونے لگا، لب پر آہ سرد، گرفتار رنج و لقب، عشق کے آثار سب ظاہر ہوئے۔ ضبط کا پردہ درمیان سے اٹھا، شور فغاں سے اٹھا، جنون پیرا مون عقل بیچارہ نو گرفتار سلسلہ محبت میں اسیر، بقول تیر ہو گیا، طالع بیدار دفعتاً سو گیا۔ تیرے

طبع نے اک جنوں کیا پیدا اشک نے نگِ خوں کیا پیدا
ہاتھ جانے لگا گریاں تک چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
بیقراری نے رنجِ ادانی کی تاب و طاقت نے بیوفائی کی

تو تا یہ حال دیکھ کر محبوب ہوا کہ ناحق رنڈی کی کج بخشی سے شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا۔ بیٹھے بٹھائے خونِ بیگناہ اپنی گردن پر لیا۔ اب اس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا، ابھارنا بھڑکانا، بلکہ زرا جلانا ہے۔ گھبرا کر تسکین و تشفی کرنے لگا اور زخمِ شمشیر عشق کو مرہمِ مزدہ دھال سے بھرنے لگا۔ کہا ”آپ ہوش و حواس بجا رکھئے، اگر مجھے ایسا سچا جانا کہ میرا جھوٹ بیج مانا، اس شرط سے آپ کو لے چلوں گا، جو میرا کہا نہ مانو گے، رک اٹھاؤ گے، دھوکا کھاؤ گے، پھر مجھ کو نہ پاؤ گے، پھیناؤ گے۔“

جان عالم نے فرمایا ”اے رہبرِ کامل، رنج کے غلگزارِ راحت کے شامل! تیرے جادہ اطاعت ہرگز قدم باہر نہ دھروں گا، جو تو کہے گا وہی کروں گا، مگر جلدِ حالِ مفصل اور بعدِ منازل و سمتِ شہرِ دوست سے نشانِ کامل دے۔ ورنہ یہ دلِ بیتابِ خجلتِ دہِ بیقراری سیاب کہ قطرہ خون سے فزوں نہیں، تڑپ کر از راہِ چشمِ نا دیدہ روئے دوست نکل جائے گا، پھر بجز حسرت و

افسوس تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔ تیرے

دل تڑپتا ہے متصل میرا مرغ بسل ہے یا کہ دل میرا
توتے نے کہا "اضطراب کا کام خراب ہوتا ہے، ناحق حجاب ہوتا ہے! اتنی جلدی
موقوف کیجئے۔ آج کی رات اس شہر میں کاٹ، صبح اُدھر کی راہ لیجئے۔ اگر کشش
صادق اور طالع بھی موافق ہے۔ انشاء اللہ منزل مقصود کو پہنچیں گے، غم بالجزم
درکار ہے در شہر نپاہ پر خانہ یار ہے۔"

جان عالم یہ خوش خبری سن کر بشاش ہوا پھر کہا۔ اُستاد ے

مژدہ دہل ہے کل رات کی نیت ہو حرام دے اگر طالع برگشتہ نہ تدبیر اُلٹ
اس رات کی بیقراری، گریہ و نزاری، اختر شماری، شہزادے کی کیا کہوں؟ ہر گھڑی
بحال پریشان، سوئے آسمان، مضطرب نگراں تھا کہ رات جلد بسر ہو، نمایاں رخ سحر ہو،
تا عزم سحر ہو، اور یہ کہتا تھا۔ سعدی ے

سعدیا نوبتِ امشب دہلِ صبح نہ کوفت یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را
آخرش تاثیرِ دعائے سحری، اثرِ نالہ نیم شبی سے، ظلمتِ شب بہ نورِ روزِ منور ہوئی۔
وزیرِ زادے کو باوجودِ خود فراموشی یاد فرمایا۔ روکپین سے تا زمانہ عشقِ انجمن آرا اس سے
بھی الفت رکھتا تھا۔ جب وہ حاضر ہوا، حکم کیا، "دو گھوڑے صبا زقار، برق کردار،
جن کی جھپٹ نسیم توند رو کو کھنڈل ڈالے، ان کے قدم سے کیتِ صرصر کی ڈیپٹ،
پاؤں نہ آگے نکلے، جلد لا۔" بجزِ ارشادِ اصطلح خاص میں جا گھوڑے لایا۔ کچھ ارباب
ضروری، وہ بھی بمجبوری لے کے، وہ دونوں خستہ تن، بقولِ میر حسن چل نکلے ے
نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہِ خجگل کی لی

پہلا سفر عازم شہر دلدار کا 'مع وزیر زادہ'

اور رہبر ہونا تو تے کا، ہرن کا ملنا اور تفرقہ باہم کا، ملاقات
مرشدِ کامل کی، پھر حوض میں کودنا شہزادے کا طلسم کی گرفتاری،
جانِ عالم کی بے قراری، پھر بدولت نقشِ سلیمانی رہائی پانی۔

بادیہ پیایانِ مرحلہ محبت و صحرا نوردانِ منازلِ مودت، رہِ روانِ دشتِ اشتیاق
و طے کنندگانِ جادۂ فراق، مسافرانِ بارِ ناکامی بردوش، بجز راہِ کوچہ یار، دین و دنیا
فراوش۔ عشقِ سر پہ سوار، خود پیادہ۔ زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ۔ لکھتے ہیں،
کہ جب بایں ہیئتِ کدائی، وہ پروردہ دامنِ ناز و آغوشِ شاہی، گھر سے نکلا اور
درِ شہرِ پناہ پر پہنچا، پھر کہ عماراتِ سلطانی، بسے ہوئے شہر کو بہ نظرِ پریشانی دیکھ
آہِ سرد کھینچی، غریبِ الوطنی پر کمرِ ہمت چست کی، اور فراقِ یارانِ وطن میں دل
کھول کے خوب رویا۔ پھر فاتحہ خیر ٹپھ کر آگے بڑھتے تو تے کو پنجرے سے کھول دیا
گھوڑوں پر شہزادہ اور وزیر زادہ۔ سمندرِ صبا پر میاں مٹھو پیا دنیا دانا کھلتے نیسا پانی
پیتے، روانہ ہوئے۔

بعد طے منازل و قطعِ مراحل، ان کا گذر ایک دشتِ عجیب، صحرائے غریب میں
ہوا، ہر تختہِ جنگل کا بہ روشِ باغ تھا، جو پھول پھل تھا تازہ کنِ دلِ مُعطر نلے
دماغ تھا۔ جہاں تک پیکِ نگاہ جاتا۔ بجز گلہائے رنگین و یاسمن و نسرن اور کچھ

نظر نہ آتا۔ شہزادہ شگفتہ خاطر سے صنّاعی باغبانِ قضا و قدر کی دیکھتا جاتا تھا۔ ناگہ
ایک سمت سے دو ہرن برق و شصا کردار، ٹبک جست، تیز رفتار، سلسلے آئے، زلفیت
کی جھولیں پڑیں، جڑاؤ شگوٹیاں جڑیں، گلے میں ہیکلیں مثلِ معشوقِ طنّاز، عربہ ساز، سرگرم
خرام ناز، چھم چھم کرتے، چوکڑیاں بھرتے۔

جانِ عالم بے چین ہوا، وزیرِ نادے سے کہا، کسی طرح ان کو جیتا گرفتار
کیجئے۔ اس سعی میں گھوڑے ڈالے۔ یا تو وہ اپنی وضع پر چلے جاتے تھے، جب
گھوڑوں کی آمد دیکھی، سنبھل، کنوتیاں بدل، چوکڑی تیز باجست و خیز، بھرنے لگے،
انھوں نے گھوڑے ڈپٹائے۔ ان کا گھوڑا دوڑانا، وہ طائرِ فرزانہ، چوکڑی بھول
کے پکارا، "ہاں ہاں اے نوجوان! کیا غضب کرتا ہے، یہ دشت پُر سحر ہے، بیہوش
کیوں قدم دھرتا ہے۔" ہر چند پکارا سردے مارا، مگر نلٹے میں کسی نے نہ سنا، توتے
نے سردھنا۔ اور مجبور ایک درخت پر بیٹھ رہا۔ وہ چلے گئے۔ دو چار کوس دھول ہرن
ساتھ بھاگے۔ پھر ایک اور سمت، دوسرا اور طرف چلا۔ ایک کے ساتھ شہزادہ،
دوسرے کے تعاقب میں وزیرِ زادہ۔ یہ بھی جدا ہوئے۔ الفصہ تا غروبِ آفتاب وہ
شمسِ سپہرِ سلطنت، گھوڑا بکٹ پھینکے گیا۔ دفعتاً ہرن نظر سے غائب ہوا۔ اس نے
باگ روکی، گھوڑا عرق عرق، خود پسینے میں غرق۔ سرے پاتک تریجالِ مضطر، حیران
پریشان، تادمِ پیشانی، یکہ و تنہا۔ وزیرِ زادہ نہ توتا، آپ یا دشتِ پُر خطر، گھبرا کر ادھر
ادھر دیکھا۔ بے انسان و حیوان، مشامِ جانِ تک نہ آئی۔ طبیعتِ سخت گھبرائی۔
جب کسی کو نہ دیکھا یہ کہا استادِ شعرے

اڑے یہ ترنگ جوانی کی کیا جس نے مجھ کو جلاوطن ہوا ایسا پیش ازین کا ہیکو میں نکل کے گھر سے خراب تھا
اور کبھی جو یادِ یارانِ ہمراہی جی میں آتی، تو یہ شعرِ دردناک میرِ سوز، بادلِ صد چاکِ داہِ جگر
دور پڑھتا۔ میرِ سوز ۵

کیو اے باد صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہِ ملتی ہی نہیں دشت کے آواروں کو

کچھ آگے بڑھا، چشمہ آبِ نظر پڑا، گھوڑے سے کود، ہاتھ منہ دھویا، اپنی تنہائی
پر خوب رویا۔ اسی حالِ گریہ و زاری میں دستِ دعا بجنابِ باری اٹھا کر پکارا کہ

”اے کس بکیاں والے مددگار رہ گم کردگاں، مجھ خستہ و پریشان دور افتادہ ازیار“
کی رہبری کر، تیرے بھروسے پر سلطنت کو خاک میں ملا، گھر سے ہاتھ اکٹھا، آوارہ
صحرائے غربت، بتلائے رنج و مصیبت، ہوا ہوں۔ لا اعلم ۛ

نہ مونس نہ رفیق نہ ہمدے دارم حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم
تیری ذات ہے یا یہ جنگلِ وحشت (نجیر، دشتِ بلا خیز۔ جہاں بوئے عزرائل
نہیں آتی۔ یہ کہہ کے زار زار، مانند ابرو نو بہار، رونے لگا۔ فریاد و زاری، تڑپ اور
بیقراری، اس کی بدرگاہِ مجیب الدعوات قبول ہوئی۔ تیر دعا، ہدایتِ اجابت سے،
لبِ معشوق ہوا۔ ایک پیر مرد سفید دارھی والے، سبز عمامہ سر پہنے عباسی کندھے
پر ڈالے، ہاتھ میں عصا، خضر صورت، بزرگ سیرت پارسا، وارد ہو پکارے
”السلام علیک اے نو بادہ چین سلطنت، دے گز قارِ محنت و محبت۔“
شہزادے نے آنسو پونچھے، سلام کا حجاب دیا۔ پیر مرد نے فرمایا ”اے عزیز!
کیا حاجت رکھتا ہے، بیان کر۔“

یہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ رنجِ راہ بھولنے کا، بھولا۔ وزیرِ زامے اور توتے
کی جدائی بھی یاد نہ آئی، کہا ”آپ کو قسم اُسی کی، جس نے میری رہبری کو بھیجا ہے، جلد
نشانِ ملکِ زرنگار دکھا دیجئے، درِ دلدار تک پہنچا دیجئے۔“
وہ ستودہ صفات ہنسا اور کہا ”اندری بخودی، ابھی بلائے ناگمانی، آفتِ کسمانی،
جس میں آپ پھنسے ہیں، اسی سے نجات نہیں پائی، معشوقہ یاد آئی۔“
جانِ عالم نے کہا ”کوئی آفت و ستم بلائے ہجر جانان اور مفارقتِ دوست سے
سوا نہیں ہے۔“ میر سونہ ۛ

نہ لگے دردِ جدائی کو قیامت کا رنج روزِ محشر کو نہ میری شبِ ہجر اس سے ملا
اس صاف باطن نے فرمایا ”صاحبزادے یہ صحرائے غضب، دشتِ پُرتعب ہے۔ ہر
تختہ اس کا دامِ ستم، گل اور بوٹا نرا خارِ غم و الم ہے، یہاں کا پھنسا اُلجھا، حشر تک
نہیں چھوڑتا۔ یہ سب کا رخاۂ ظلم ہے۔“
شہزادے نے کہا ”ہم سحرِ محبت میں گرفتار ہیں، ہمیں جینا مرنے سے فزول ہے،
دل کا حال دگرگوں ہے۔ شیفتہ ۛ

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے الہی موت دے، گذرا میں ایسے جینے سے
اس کریم النفس کو اس کے حال پر رحم آیا، فرمایا "بدحواس نہ ہو، نظریہ خدا
رکھ، کہ وہ چارہ ساڑے عالمین جامع المتفرقین ہے۔"

شہزادے نے کہا "فی الحقیقت، مگر بسے خدا ایک نظر ملک زرنکار اور
معتوق طرہدار اگر نظر آئے، جان زار بج جائے، زسیت کا کیا اعتبار ہے، مرگ
ہر دم ہمکنار ہے، حسرت دید تو نکل جائے۔"

اُس خدا پرست نے فرمایا کہ "آنکھ بند کر۔" پلک سے پلک شہزادے کی لگی،
ملک زرنکار میں گذار ہوا اور صورت اُس حور کردار کی نظر پڑی۔ بمجروح نگاہ دل سے
آہ کی، بیہوشی ساری غشی طاری ہوئی۔ مرد بزرگ نے سمجھایا۔ "اس امر لا طائل سے
کیا حاصل، زندگی درکار ہے، ایک روز دوست بھی ہمکنار ہے۔"

سمجھانے سے اتنی تسکین ہوئی کہ آنکھ کھولی، رات ہو گئی تھی۔ پیر مرد نے
کچھ کھلا لب چشمہ سلایا۔ جس وقت افق چرخ سے راہ گم کردہ مسافر مغرب یعنی
آفتاب عالم تاب، جلوہ افروز ہو، حصہ چارم آسمان پر آیا۔ شہزادے کی آنکھ کھلی،
وہاں آپ کو پایا۔ جہاں سے ہرن کے پیچھے گھوڑا اٹھایا تھا سجدہ شکر ادا کر سرگرم
رہ دوست ہوا، راہ کا پتہ اس رہبر خیل سبز پوشاں سے پوچھ لیا تھا، قدم بڑھایا
جاتے جلتے ایک روز آفتاب کی تمازت بدرجہ اتم تھی، پیاس کی شدت ہوئی۔
آب وہاں گوہر نایاب تھا۔ خطر تک اس دشت میں لا علاج پانی کا محتاج تھا۔
زبان میں کانٹے پڑے، ریت کی گرمی سے تلوے جلتے تھے، دو گام قدم نہ چلتے تھے،
لوں کا شعلہ یہ سرگرم آزار جگر سوخکاں تھا کہ پرندے پتوں میں نہ پھپھکتے تھے،
کوسوں دوندے نظر نہ کتے تھے۔ دشت کورہ آہنگراں تھا، ہر طرف شعلہ جوالہ عیاں
تھا، ریگ صحرا کیفیت دریا دکھاتی تھی۔ پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔
صدائے زاغ و زغن سے سناٹا، دھوپ کا تڑا قاقا، دشت کا پتھر تپنے سے انگڑا تھا۔
جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابش شمس جس سے ہرن کالا ہو، مذکور سے زبان
میں پھالا ہو، بادِ سموم سے وحشیوں کے منہ پر یہ تاب تھا۔ لوں سے گاؤ زمین کا جگر
کباب تھا، مچھلیاں پانی میں بھنتی تھیں۔ جل جل کر کنا بے پر سردھنتی تھیں، سرطان

فلک جلتا تھا، یکڑا لبِ دریا اُبلتا تھا، ایسے موسم کے سفر میں زیست کیونکر ہو۔ مسافر خواب میں بڑتے ”چلو بھر پانی دو۔ درخت خشک، سوکھے پتے کھڑکھڑاتے تھے، جانور پر کھولے پھڑپھڑاتے تھے، چار پائے ایک سمت ہانپتے تھے، گرمی کے خوف سے کلپتے تھے۔ یہ حرارت مستولی تھی کہ دستوں کی گرمی سے جی جلتا تھا۔ مسافر دھم پائے گمان سے راہ نہ چلتا تھا، خورشیدِ حشر کی طرح آفتاب تاباں تھا، صحرائے قیامت وہ بیابان تھا، اسی حالِ خراب میں شہزادہ سرگشتہ، دل برشتہ حیران، پریشان، ایک طرف درخت گنجان، سایہ دار دیکھ کر آیا تو وہاں حوضِ مصفا، پانی سے سلبب بھرا پایا۔ پانی دیکھ کر جانِ رفتہ تن میں آئی، آنکھوں نے لہروں سے ٹھنڈک پائی، گھوڑے سے اتر پانی پینے کو جھکا، چرخ نے نیرنگی دکھائی، وہی معشوقہ مرغوبہ، جس کے سیلِ تلاش میں، غریقِ محیطِ الم، گرفتارِ لطمہ غم مثلِ پرکاش بہا بہا پھرتا تھا، حوض میں نظر آئی آنکھ چار ہوتے ہی وہ بولی ”اے شنادِ بحرِ محبت، وائے غواصِ چشمہِ لفت!“ دیر سے تیری منتظر تھی، الحمد تو جلد پہونچا، تامل نہ کر، کود پڑا، انہیں تو وہ آنکھ بند کرنے کا نقشہ ہر پل مد نظر تھا۔ بے تامل نہنگِ آفت کے منہ میں کود پڑا، زیست سے سیراب ہو یہ کہتا شرے

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا
کودتے ہی، سرتلے، ٹانگیں ادھر، غلطاں پیچاں، تحتِ الشریٰ کو چلا، گھڑی بھر
میں تہہ کو پاؤں لگا، آنکھ کھولی، نہ حوض نظر آیا، نہ اُس درہنوار کو پایا، مگر صحرائے
ن و دق، جسے دیکھ کے رستم و اسفندیار کا رنگِ فتن ہو، دیکھا، اس وقت سمجھا
دوسری زک اٹھائی، توتے کی بات آگے آئی
وائے برما و گرفتاری ما

یہ کہہ کے آگے چلا، در سے چار دیواری معلوم ہوئی، جب قریب آیا، باغِ ادب
عمارتِ مفصل دیکھی۔ درِ باغِ بسانِ آغوشِ مشاق داسرِ سرد ہوا۔ یہ تو گرمی کا مارا تھا، بے
تکلف اندر قدم رکھا۔ باغ میں آیا، قطعہ دھپ پھولا پھولا پایا۔ تختہ بندی محقول، پیڑ
خوش قطع، خوبصورت پھول، ردشیں صاف، نہریں شفاف، چشمے ہر سمت جاری نئی تیاری۔
درختوں پر جانور ان لغم سرا، برگِ دبارِ دگل سے بالکل باغ بھرا، باغبانیاں پر پوشِ ہر درش

پر بدشِ دلبری خراماں، شاخوں پر بلبلیں غزل خواں، بیچ میں بارہ دری عالیشان، سب
 تکلف کا سامان، اس کے متصل چوڑے سنگ مرمر کا، بادلے کا سا بان کھنپا، مسدِ مرق
 بجھی، ایک عورت خوبصورت عجب آن بان سے اس پر بیٹھی، خواصیں گردِ پیش - دُغزو
 بحسن و جمالِ خویش، شہزادے کو دیکھ کر، ایک خواص پکاری "لے صاحب! تم کون ہو؟
 جان نہ پہچان، بے دھڑک پر اے مکان میں چلے آئے۔"

یہ تو زیست سے بیزار، مرگ کا طلبگار تھا، اسے جواب نہ دیا، بے تامل مسدِ
 پر برابر جا بیٹھا، یہ شعر پڑھتا تھا۔ استاد ۵

بھڑ بیٹھے ہو، دو زانو وضع مودب اُس سے دُشمنی جو تھا تو ہم کو دابِ ادب نہ آیا
 وہ تو فریفتہ قدیم کھتی، ہنس کے چپ ہو رہی، پوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف
 لائے ہیں؟" شہزادہ متحیر باغ کو دیکھ رہا تھا، جو پڑھتا تھا، پردارِ جانور کی صورت،
 پھول کھلے پھل تیار، آپس میں سرگرم گفتار، جس میوے پر رغبت ہو، اس درخت
 کا جانور سامنے آ، رقص کرے۔ پھل بے ہاتھ لگائے، منہ کے پاس آئے جتنا اسے
 کھاؤ، ثابت پاؤ۔ جب طبیعت سیر ہو، اُسے درخت میں دیکھ لو۔

یہ حرکتیں اس کی خواصیں شہزادے کے دکھانے کو، درپردہ ڈرانے کو کرتی تھیں۔
 اس قرینے سے جانِ عالم کو یقین ہوا کہ یہ سب جادو کا ڈھکوسلا ہے۔ پیر مردِ پچ فرماتا
 تھا، افسوس بُرے پھنے۔ یہ تو ان خیالوں میں تھا۔ اس نے مکر پوچھا، شہزادے نے
 جواب دیا کہ ہمارا آنا جانا، تمہیں خوب جانتی ہو، اجنبی ہیں، لیکن تم پہچانتی ہو،
 وہ سکرائی خواصوں سے کہا "آپ مہمان ہیں، مروت شرط ہے۔" انھوں نے کچھ
 اشارہ کیا، کشتیاں شراب کی، تابیں گزک و کباب کی، مع جام و صراحی خود بخود آئیں
 اور مینائے بے زبان، پنبہ دہان، رقصاں، یہ بولی حافظ ۵

اگر شراب خوری جرعتِ فشاں بر خاک اداں گناہ کہ نفع رسد بہ غیر چہ پاک
 پھر دفعتاً جامِ لبریز، بریز بریز کہتا، خندہ زناں، جانِ عالم کے قریب آ کر بولا
 حافظ ۵

بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند چناں نہ ماند و خپیں نیز ہم نخواہد ماند
 شہزادے نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی، ڈرا کہ اگر عذر کردوں اور اسی طرح یہ

شراب بے قصد خلق میں اُترے تو کیا لطف رہے۔ یہ کہا لا اعلم۔
 یار سے ہے لطف مے کا آہ یہ ہو وہ نہ ہو یہ کوئی صحبت ہے ساقی داہ یہ ہو وہ نہ ہو
 پھر اُس جام کو ناکام، ہاتھ میں لے کر، ہو کے سے گھونٹ، گلا گھونٹ گھونٹ
 پئے، وہ دورہ بے سراجام، پھر آلام گردش میں آیا، جب دو چار ساغر متواتر جادو گرنی
 نے پئے، کاسہ دماغ سے عقل دور، دلولہ مستی سے معمور ہو، پھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ شہزاد
 اُس کا اختلاط، کج بحثی سے بدتر جانتا تھا، مجبور گردش گردونِ دون دیکھ کر سرنگوں ہو،
 کچھ ہاں ہوں کر دیتا۔ پر سچ ہے جسے جی پیار کرتا ہے، اس کی گالی بد رُچی کے بوس دکنار
 سے زیادہ مزہ دیتی ہے۔

اسی صحبت میں آدھی رات گزری، خاصہ طلب کیا، دو چار نوالے جانِ عالم نے بھر
 پانی کے سہارے اگل اگل خلق کے نیچے اتارے۔ اُس مڑبھکی نے قرار واقعی ہتے مارے۔
 کھانا زہر مار کر، شہزادے کا ہاتھ پکڑ، بارہ دری میں لے گئی۔ جواہر نگار بھری پرٹھایا۔
 ایک تو شراب کا نشہ، دوسرے عالم تنہائی، بیٹھتے ہی شرم و حجاب کا پردہ اُٹھا پیٹ
 گئی۔ وہ سرکا، پھر تو خنیف ہو کر بولی "تو نے سنا ہوگا۔ شہپال جادو شہنشاہِ سامرا
 جہاں، فخر سامری و جیپال کا نام۔ میں اس کی بیٹی ہوں۔ تمام باغ ملکہ نواح
 اس کا سب سحر کا بنا ہے۔ برسوں سے تیری فریفتہ اور شیدا ہوں۔ بہ تمنائے وصال
 خراب حال چلتی تھی۔ مجزِ تحتِ جگر اور خونِ دل کچھ نہ کھاتی نہ پیتی تھی۔ آج لات
 منات کی مدد سے تو میرے اختیار میں آیا، دل کا مطلب بھر پایا، جس چیز کا شائق
 و طلبگار ہو، جو شے تجھے درکار ہو، مجزِ ملاقاتِ انجمن آرا، جہاں کا سامان ہیا
 ہے۔ بشرطِ اطاعت و اظہارِ محبت۔"

جانِ عالم پہلے ڈرا، پھر جی مضبوط کر کے بولا "یہ سب سچ ہے، جو تو نے کہا،
 مگر تیری تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ تو راہ و رسمِ محبت سے آشنا ہے، نوشِ وصل
 نیشِ فصل کا مزہ چکھا ہے۔ انصاف کر، جس کے واسطے خانماںِ آدارہ، غربت کا مارا،
 سرگرداں ہوا ہوں تو اسی کے نام کی دشمن ہے، میں تیری دوستی پر کیونکر اعتماد کروں۔
 دنیا میں تین طرح کے دشمن ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صریح اپنا عدد ہو، دوسرا دشمن کا
 دوست، تیسرا دوست کا دشمن۔ یہ سب سے بُرا ہے، اس سے کنارہ اچھا ہے یا یہی شرط

محبت ہے کہ ایک شخص کا نام خراب کر کے، جہاں آسائش ملے، وہاں بیٹھ رہے۔
فکرِ سلطنت، جستجوئے دولت میں سر بھرا نہیں ہوا ہوں، جو تیرے جاہ و ثروت پر اکتفا
کروں۔ تجھے معلوم ہوگا، اللہ کی عنایت سے، گھر کی حکومت چلنے کرنے کو کافی تھی مگر
میرا تو یہ حال ہے۔ میر تقی ۵

اک مدت پائے چلا رہا ہے اک مدت گلشنِ تابلی کی برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی
یہ سن کے وہ کھسیانی کتیا سی بھنجلانی، کہا، "قدرتِ سحر میری سن لے، مغرب و شرق
کا فاصلہ، گردشِ چشم ہے، زرنگار جانا کیا پشتم ہے، ادھر پلک بھپکانی، اتنے عرصے میں
زرنگار گئی، اور آئی۔ خیر اگر میری ہم صحبتی کر یہ جانتا ہے، تیری امید بھی قطع کر دیتی
ہوں۔ ابھی انجن آرا کولا، تیرے دوہر جلا، اپنا دل ٹھنڈا کتی ہوں۔"

جانِ عالم بدعواس ہوا کہ رنڈی کے غصے سے ڈرا چاہیے سخت غضب میں گرفتار
ہوئے، انکار میں قتلِ معشوق مدِ نظر اور اقرار کرنے میں اپنی جان کا ضرر، دونوں طرح
مشکل ہے، حیران ہو، مال کار سوچنے لگا، منہ نوچنے لگا۔ واقعی یہ مقدمہ بہت
پیچدار ہے، جس پر گذرا ہو، وہ جانے۔ دل کا حال یہ ہوتا ہے۔ جدھر آیا، آیا جس
سے پھرا پھرا۔ اور یہ کیا عذابِ عظیم ہے، فراقِ محبوب وصالِ نامرغوب۔
آخر کار شہزادے کو بجز اطاعت، مصلحت نہ بن پڑی۔ دل کو تسکین دے
کر کہا اگر اس سے موافقت کرو گے، انجن آرا کی اور اپنی زندگی ہوگی، خالص
رحمۃ للعالمین، جامع المتفرقین ہے، کوئی صورت نکل آئے گی کہ اس بلا سے رہائی
درِ دلدار تک رسائی ہو جائے گی۔ الّا حیلہ شرط ہے، یہ خیال کر ساحرہ سے کہا "ظالم!
ہم تیرا جی دیکھتے تھے، ہم نے سنا تھا کہ عاشق، معشوق کے ناز بردار ہوتے ہیں،
مگر یہ جھوٹ تھا، دھمکاتے ہیں، ڈراتے ہیں، عاشقی میں حکومت، کسی نے کاؤں
سے نہ سنی ہوگی، ہم نے آنکھوں سے دیکھی، تو یہ نہ سمجھی، ایسا کون احسن ہوگا، جو تجھے
سا معشوقِ عاشقِ خصال، اور یہ سلطنتِ لازوال پھوڑ کے، امرِ نادیدہ کی جستجو کرے،
امیدِ موہوم پر خجل خجل، ڈھونڈتا پھرے، یہ فقط اختلاط تھا۔" یہ کہہ کے گردن میں
ہاتھ ڈال دیا، وہ قحبہ تو ازار۔ کھوئے بیٹھی تھی، لیٹ گئی ناچار باخاطر افکار،
اُس تیرہ بخت کا منہ کالا کر، ہاتھ منہ دھو، اس کے ساتھ سو رہا۔ وہ چڑمرانی بدست

لیٹتے ہی جہنم داخل ہوئی۔ یہاں نیند کہاں؟ جی سینے میں بیقرار، پہلو میں وہ خار
 ہر دم، آہِ سرد دل پر درد سے بلند، چشمہ چشم جاری، فریاد و زاری دو چند، جگر میں
 سوزِ فراق نہاں، لب سے دودِ پنہاں عیاں۔ یہ رباعی بر زبان، لا اعلم ۵
 کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
 ہماری یہ شب کیسی شب ہے الہی نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے
 مگر جب وہ کروٹ لیتی، اس کی جان خوف نے نکلتی، دم بخود ہو جاتا، جھوٹ
 موٹ سو جاتا، اسی حال سے ہزار خرابی، و مشاہدہ بتیابی جانِ عالم، گریبانِ سحر چاک
 ہوا، جادوگرئی اٹھی، شہزادے کو حاتم میں لے گئی، وہاں اور عجائبات سحر دکھائے،
 ہمارے دونوں باہر آئے، خاصہ چٹا گیا، بعد فراغِ صحبتِ طعام، اس نے یہ کلام کیا کہ
 میرا معمول ہے، اس وقت سے پردن رہے تک شہپال کے دربار میں حاضر رہتی
 ہوں، تیری اجازت پاؤں تو جاؤں۔“

جانِ عالم نے دل میں کہا۔ ”نند الحمد بوم تیری صورت پر کدورت نہ دیکھیے“
 غنیمت ہے۔ مگر ظاہر میں زمانہ سازی سے کہا۔ ”فرقت گوارا نہیں، روکنے کا
 یارا نہیں، جس طور بنے جلد آنا۔“

ساحرہ اس کلمہ سے بہت خوش ہو چل نکلی۔ اس کے جانے سے باغِ سنسلا
 ویران، وحشت انگیز، ہو، کا مکان ہوا۔ شہزادہ با خیالِ دلبر پھرتے تکتے ہو جی کھول کر رویا میرے
 غمِ دل کو زبان پر لایا آفتِ تازہ جان پر لایا

کہا ہم سا بھی بدنصیب، دور از حبیب، دوسرا نہ ہوگا، جس کا یار نہ مددگار،
 جس سے دل کا درد کہئے، تا تسکین ہو، صحبت ان کی ملی ہے جنھیں دیکھ چپ
 ہو رہیے کہ عشق نہ اُن کے ذہن نشین ہو، ایک جانور، جو رہبر تھا، یوں اڑا،
 دوسرا وزیر زادہ جو لڑکپن سے جاں نثار اور یاد رکھا، وہ چھٹا۔ ہوس ۵
 سولے اندوہ و یاس و حرماں ہوا نہ حاصل جہاں سے ہم کو

اٹھائیں کاندھے پہ بارِ مہتی سفر ہے بہتر یہاں سے ہم کو
 اسی سوچ میں چھ گھڑی دن باقی رہا، جادوگرئی چکی چمکائی آئی، جانِ عالم کو
 اس کی صورت دیکھ کے رونا آیا، لیکن ڈر کے مارے ہنسنے لگا، نالہ گلے میں بھپٹنے لگا

پھر وہی اکل و خرب کا چرچا مچا، جب نصف شب گدڑی، تو وہ سو رہی، ان کو
بیداری، آخر شماری نصیب ہوئی، فرد ۵

شاہد رہو تو اسے شب ہجر جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

اسی انداز سے دو مہینے گزرے۔ جان عالم کا روز کی کوفت سے یہ عالم ہوا
کہ سوکھ کے کاٹھا ہو گیا، بدن ڈھانچہ ہو گیا۔ استاد ۵

ہوں کاہ سے کاہیدہ بس زار اسے کہتے ہیں عیسیٰ سے نہ ہوا چھا بیمار اسے کہتے ہیں
بن ہاتھ لگے دس کے جا سے نہیں ہلتا میں لاغر اُسے کہتے ہیں تیار اسے کہتے ہیں
تصویر مرتفع ہوں سکتے کا عالم ہے جنبش ہی نہیں نقش دیوار اسے کہتے ہیں
تضار ایک روز وقت رخصت، ساحرہ بولی "جان عالم! تیری تنہائی کا اکثر خیال

بلکہ مجھے ملاں رہتا ہے، تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا، باغ خالی کاٹے کھاتا ہوگا، مجبور
ہوں کوئی تیرے دل کو بہلانے کی گوں نہیں، جسے پھوڑ جاؤں۔ یہ رنڈیاں بد سلیقہ
ہیں، ان کو کہاں تک آدمیت سکھاؤں، ہنوز انھیں نشست برخاست کا قرینہ
نہیں آیا۔ ان سے تو اور برخاستہ خاطر ہوگا۔"

شہزادے نے کہا "ہم کیا گھبرائیں گے، تنہا پیدا ہوئے، تمام عمر اکیلے رہے
ہماری قسمت میں دوسرا لکھا نہیں، ہم صحبت ہمارا خدا نے خلق کیا نہیں، لیکن یہ
اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے۔ کوئی ہمیں مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے
مے سے کون جا کر کہے۔ ہنسی کی جا ہے، رونے والا ناپید ہے۔"

وہ بولی "یہ مکان طلسم ہے۔ بادِ مخالفت کا گدڑ محال ہے، تیرا کدھر خیال ہے؟"
شہزادے نے کہا "اگر کوئی جادوگر یہ قصد کرے اسے کون روکے۔"

وہ تو فریفتہ شدت تھی، بند ہوئی۔ دہم یہ ہوا کہ میرے بعد کوئی جادوگر فی آئے
اور اس پر عاشق ہو جائے، مار ڈالنا کیسا یہاں سے اڑا لے۔ تو تو کہاں پائے۔
سب محنت برباد جائے، فرطِ محبت نشہ الفت میں انجام کار نہ سوچی۔ بے تاثر نقشِ
سلیمانی صندوق سے نکال، اس کے بازو پر باندھا، کہا "اب نہ تاثیرِ سحر، نہ دیو کا گدڑ
نہ پری سے ضرر ہوگا۔ دل کا کھٹکا مٹا، مزے اڑا۔" یہ کہہ کے وہ تو بدستور چلی
گئی، جان عالم کے سر پر خرابی آئی، وہی بلبلا تا، شور مچانا، باغ کو سر پہ اٹھانا، اور گاہ

انجن آرا کے تصور سے یہ کہنا، مؤلف ۵

لکھا ہوا ہی قسمت کا تھا سو جان ملا
کہ میری خاک میں محنت دے آسمان ملا
ہزار صدے پہ دل نے ہمارے اُن بھی نہ کی
جو اک رفیق ملا وہ بھی بے زبان ملا
نہ ہم نے چین بزر فلک کبھی پایا
عنایتِ ازلی سے عجب مکان ملا
تری تلاش میں دردِ بھٹکتے پھرتے ہیں
ملا نہ تو ہی جو جوتی سے گوہان ملا
نہ کہہ تو پیر فلک پر کہے گی ساری خلق
کہ خاک میں ترے جوروں سے کیا جوان ملا
بہت جہان کی کی سیراے سرورِ حزیں
پہ بے خزاں نہ ہمیں کوئی بوستان ملا

ایک دن عالمِ تنہائی میں جانِ عالم کو یہ خیال آیا کہ اس نقش کی تعریف اس
نے بہت کی تھی، کھولوں تو شاید عقدہ کا رستہ کھلے۔ یہ سوچ کے اسے کھولا،
اس کا یہ نقشہ تھا رست در رست کا نقش۔ ہر خانے میں اسمائے الہی مع ترکیب
و تاثیر تحریر تھے، دیکھتے دیکھتے خانہ مطلب میں نظر پڑی، لکھا تھا کہ کوئی شخص کسی
ساحر کی قید میں اگر ہو، یہ اسم پڑھے نجات پائے یا مکانِ طلسم میں پھنسا ہو، اسے
پڑھتا جلدھر چاہے چلا جائے اور جو کوئی سحر کرتا ہو، اس پر دم کر پھونک دے،
اسی دم اس کی برکت ساحر کو پھونک دے،

یہ سانچہ اس میں دیکھ کے قریب تھا کہ شہزادے کو شادی مرگ ہو، جلد جلد وہ
سب اسم یاد کر، نقش بازو پر باندھا۔ اس عرصے میں جادو گرنی موجود ہوئی، جانِ عالم
کے تیور بُرے دیکھے، پوچھا "آج مزاج کیسا ہے۔"

وہ بولا "الحمد للہ بہت اچھا ہے، دیر سے تیرا منتظر تھا، لے تجھے شیطان علیہ لعن
کو سونپا، ہمارا اللہ نگہبان ہے۔" یہ سنتے ہی روح قالب سے نکل گئی، سمجھی پیچ پڑا۔

جانِ عالم چل نکلا، سحر سے روکنے لگی، تاثیر نہ کی۔ سرپیٹ کر کہا۔ سعدی ۵

کس نیا موعظتِ علم تیرا ز من کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

یہ کہہ کے ناریلِ زمین پر مارا، وہ پیٹا، ہزار ہا اژدہا شعلہ فشاں پیدا ہوا،
شہزادے نے کچھ پڑھا، وہ سب پانی ہو گئے، فانی ہو گئے، پھر تو منت کرنے لگی،
پاؤں پر سردھرنے لگی، جادو گرنیاں سمجھانے لگیں کہ "یہ شرطِ مردّت نہیں، جو اپنا
والہ دشیدا ہو، اس سے دغا کیجئے۔"

شہزادے نے کہا ”گریبان میں منہ ڈالو، سوچو تو ہم بھی کسی کے عشق میں غریب
 سے جدا مصیبت کے مبتلا، سر بھرا ہوئے تھے، ہمیں جبر سے قید کیا، ہزار طرح کا
 الم مفارقت دیا۔ یہ احسان کچھ کم ہے، ہم نے طلسم درہم برہم جو نہ کیا“ وہ سمجھیں
 یہ نہ ٹھہر گیا۔ عاشقی کا کام، نصیحت و پند و بند سے نہیں ہوتا اور جبر کا کام اگر
 اختیار کیا، جاب آسانا پائیدار ہے اس کا کیا اعتبار ہے۔ حسن۔ ص
 سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

اور یہ قضیہ اتفاقیہ ہے ص
 ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے

۵ حسن

کبھی یوں بھی ہے گردشِ روزگار کہ معشوق عاشق کے ہوا اختیار
 لیکن سوچو تو لاکھ طرح کا راحت و آرام ہو جو جی نہ لگے تو کیا کرے استاد
 دولت کو نین حاصل ہو تو لٹھے لٹا پھر نہیں لگتا ہے جی جی سے ہو جی کا چاٹ
 الغرض وہ سر پٹتی رہیں، جان عالم نے بہ برکتِ اسمائے اکہی اس طلسم سے رہائی
 پائی، اپنی ماہ لی۔ چند روز میں پھر اس عرصہ پر وارد ہوا۔ اسپہ دفا دار پتھر سے سرا
 مار۔ مر گیا تھا، اس کی لاش دیکھ کے دل پاش پاش ہوا، خوب رویا۔ اب لورینج
 پیادہ پائی کا، قدم بوس ہوا، سبحان اللہ!۔ کہاں وہ شہزادہ، پروردہ ناز و نعم۔
 کہاں یہ پیادہ پائی کا سفر دور و دراز، ہر قدم خاہر گام آوار، مگر تصویرِ باریش نظر،
 ہر قطرہ اشک میں سو سوختِ جگر، آہ و نالہ دردِ دل یہ شعر ہر ساعت بر زبان۔ ناسخ
 تاریخ صحرا بوندی پاؤں کی ایذا نہیں دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا
 کیوں نہ کھٹکوں آسمان کو رات دن میں ناتواں آبلے کی شکل اُس میں مجھ میں عالم خار کا
 رنگِ ردفق، دل میں قلق، سینہ نگار، پا آبلہ دار، چھاتی غم ددی سے شق
 کبھی حکایت شکایت بیزگاہ یہ غزل مولف کی درد آمیز ٹپکتا چلا جاتا تھا، مولف
 توڑ کر خم اور پلک کر آج پیمانے کو ہم سوئے مسجد جاتے ہیں زاہد کے ہکلے کو ہم
 شمعِ روحِ محفل میں کب دیں بارِ پردانے کو ہم ایک کپڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جل جانے کو ہم
 خوب سا کرتے ہیں ہم ایامِ عشرت کو قیاس دھیان میں لاتے ہیں جس دم گزے انسانے کو ہم

کل ملک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم
 انکب گنگوں کے نشان چھٹ کچھ تپہ ملتا نہیں
 جرم کچھ صیاد کا اپنی اسیری میں نہیں
 رشک زلف یارب عقدے ہیں میرے اے سرو
 چھلتے ہیں اب وہاں پر خاک پہلے کو ہم
 جب خواں میں ڈھونڈتے ہیں اپنے کاشانے کو ہم
 روتے ہیں کینج قفس میں آبلہ رطائے کو ہم
 اور ابھ اٹھتے ہیں مٹی میں جب کہ سلھانے کو ہم

چشم ترنگ زرد، آہ سرد، دل میں درد، پاؤں کیوں رکھتا، آبلہ پانی سے کہیں
 اور جا پڑتا۔ دل صفا، منزل میں عزم کہ آج در دلدار تک پہنچے، آبلوں کو اس خار
 سخت بدعاسی غنی۔ کانٹوں کی زبان، تلموں کے خون کی پیاسی تھی۔ نہ کوچ کی طاقت
 نہ یارائے مقام، گھبرا کے وہ ناکام یہ کتا ٹولف ۵

بدل دے اور دل اس دل کے بدلے
 اور اس پر نقد جاں دیکر بدل لیتا سرو
 اہی تو تو رب العالمین ہے
 گردل بیرنج چڑھ جاتا کسی کا دھیان میں
 اور جب جنون عشق کا دلولہ از حد ہوتا تو سر پکڑ کر روتا، اور یہ کتا ٹولف ۵

قرار پاتی نہیں جان زار بن تیرے
 گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا ب وہ بھاگ گیا
 سارہا ہے دل بقرار بن تیرے
 حس وہوش و مکیبے قرار بن تیرے
 سر جو کرتا ہے یل و ہمار بن تیرے

خلاصہ کار یہ کہ اسی حالِ خراب اور دلِ بقیاب سے ہر بعد سرگرم منزل
 تھا، دیدہ دیدار طلب سے رواں خونناہ دل تھا۔

رہائی طلسم سے اس گرفتار محبت کی

اور پہنچنا وادی فرخاک بے خس و خاشاک میں، پھر ملاقات
بانی ہر و وفا یعنی ملکہ مہر نگار، پرتیمکین باوقار سے، پیر مرد کا
لوح دنیا، شہزادے کا رستہ لینا

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال	ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے	کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے
گہ نمک اس کو داغ کا پایا	گہ پتنگا چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب	اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

یہاں سے دشت نور فان وادی سخن، جگر افکار و غربت زندگان پر محن سینہ نشین
باپائے خمدار و دلِ خار خار، بیان کرتے ہیں، کہ وہ مسافر صحرائے اندوہ و حرماں، عام کمت
جاناں بے توشہ و زاد راہ، ہر روز بادلِ پُرسوز کراہ کراہ، بادیہ گردی کرتا، جیتا نہ مرتا۔
ایک روز نواحِ دلکش و صحرائے فرح افزا میں گذرا، دیکھا کہ باغبانِ قدت نے،
صفوہ دشت گلہائے مختلف رنگ سے، بہشتِ ہشتم، رشتکِ صحنِ چین، اور بوٹا پتا، گھاس
کا بہ از گلِ باغِ ارم، نخلتِ دہِ نسری و سنترن بنایا ہے، گردِ جدولِ آبِ رداں، چشمہ
ہر ایک چشمہ حیواں، اور لکھ ہائے ابھرنے پھڑکھڑے عجیب رنگ جمایا تھا، نسیم بہار اور
درختِ گلزار سے میدانِ رشتکِ فتن و تاتار تھا۔ نہ کہیں گردِ تھلنے غبار تھا۔ درختوں پر فیض ہوا اور
ترش سے سرسبز تھی اور چمک چمک جوہر تھا۔ گلِ غنچہ نے بگلشن تھا۔ یہ تو مدتوں کا مسافت دیدہ مسافرت
کشیہ تھا، وہ زمینِ فحشتہ آئین بہت پسند آئی، دل میں آیا کہ آج کی شب اسی جا

سحر کیجئے، قدرت حق مد نظر کیجئے، ایک سمت زمین ہموار، درخت گنجان، چشمہ ہائے
آب رواں دیکھ کے جا بیٹھا۔ جنگل کی کیفیت، جی بیکل کرنے والی، جانوروں کی پھیلیں
اچھل کود کی دیکھا بھائی، خوش فہمی کی سیر، کلیں میں وحش و طیر، بوباس ہر برگ گل
کی دھوم دھام، طاؤں کے غل کی۔ بوٹے پتے کی نشوونما، سرد سوہوا، ابریاہ
کہیں گہرا سرخ و سفید ادھی، ساون بھادوں کی گٹھا، رعد نعد و شور سے مچھلنے
کوٹنا، یہ کہہ رہا ہے میر سوز سے

کی فرشتوں کی راہ ابرسنے بند جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

ندیاں نالے پڑھے، دریا بڑھے، بھیلیں، تالاب لبریز، ڈبے صبح خیز، سپہیہ کا
مستوں سے مخاطب ہونا، پی پی کہہ جان کھوتا، کوئل کی کوکو اور تو تو سے کلیجہ منہ کو
آتا تھا۔ مور کا شور، برق کی چمک، بجلی کی کردک، ہوا کا زور۔ زور کیفیت دکھاتا تھا۔
شام کا وقت، غروب آفتاب کا عالم، جانوروں کا مدختوں پر بیٹھنا باہم، زمین پر
فرش زمریں بچھا، وہاں لہریں لے رہا۔ آسمان میں رنگا رنگ کی شفق پھولی، شام
لودھ کی سیر بھولی۔ ایک سمت قوس قزح جسے دھنک کہتے ہیں، بعد عظم و شان
فلک پر نمایاں، سرخ، سبز، زرد، دھانی لکیریں عیاں، بیل کے چمچے، درخت
سرسبز لہلہے، کوسوں تک سبزہ زار، پھولوں کی بہار، کہیں ہرن چوتے، کہیں پرند
سیر کرتے، کسی جا طاد سانِ طنائز، سرگرم خرام ناز، لب ہر حشریہ، آب مرغِ اکلی و سرفا۔
کبھی نمود ہونا ماہ کا چکور کا دوڑنا، بھرنا آہ کا، دونوں وقت ملتے۔ اس دید
کی خراش سے دل پاش پاش، زخم جگر پھٹے، یہ سیر جو ہجر جاناں میں نظریے گندے
کیوں کر دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، چھاتی نہ بھر آئے۔ استاد

کارِ انحر کرتی ہے ہر بوند تن پر یار بن کیا عجب گرہوں ہرے دارِ جگر پر اس میں
قاعدہ ہے جب آدمی کو سامانِ عیش و نشاط، اس طرح کی سیر فرحتِ انبساط
میسر ہوتی ہے، جسے جی پیار کرتا ہے وہ یاد آتا ہے۔ شہزادے نے مدت کے بعد یہ
فرحت جو پائی، یار کی یاد آئی۔ شرے

میں وہ نہیں جو کر دل سیر بوتاں تنہا بہشت ہو تو نہ منہ کیجئے باخیاں تنہا
اس سوچ میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف سے رنڈیوں کا غل پیدا ہوا۔ یہ دھوکا

پاچکا تھا، سنبھل بیٹھا اور اسمائے رد سحر پڑھنے لگا۔ بموجب مثل دودھ کا جلا پچھا، پھونک پھونک پیتا ہے۔ جب وہ آگے بڑھیں، غور سے دیکھا چار پانچ سے عورت، پری زاد حودش، تدریں کمر، نازک تن یمبر، چست و چالاک، کسن، اٹھڑپنے کے دن، اچھلتی، کودتی، پایہ اور جواہر نگار، ہوادار پر، ایک آفتاب حشر سوار، گد پدیوں کی قطار، تاج مرصع سر پر، لباس شاہانہ پرتکلف دربر نیمچہ سلیمانی ہاتھ میں، سیاب دشی بات بات میں، بندوق چھاتی طائر خیال گرانے والی برابر رکھے، شکار کھلتی، سیر کرتی چلی آتی ہے۔ حسن میں بیشال، کاش بد غیرت ہلال۔ میر حسن ۵

رس پندہ یا کہ سولہ کا سن جواتی کی راتیں مرادوں کے دن

طالع بیدار یا در اقبال دم ساز، غمزہ عشوہ و انداز داما جلو میں، آفت جان عاشق، سراپہ ناز، جان عالم نے باماز بلند کہا، میر تقی ۵

کیا تو نازک ہے چہل کو بھی حسد میں تن پہے کیا بدن کا رنگ ہے اتہ جس کی پیر چن پہے یہ صدا جو اہتمام سحاری، آگے آگے کرتی تھیں، ان کے کان میں چڑی، اور نگاہ جمال جان عالم سے لڑی، سب کی سب لڑکھڑا کر ٹھٹھک گئیں، کچھ سکتے کے عالم میں بہم کر بھجک گئیں، کچھ بولیں "ان درختوں سے چاند نے کھیت کیا ہے" کوئی بولی "نہیں ری سورج پھیتا ہے" کسی نے کہا "غور سے دیکھ، ماہ ہے" ایک بھانک کے بولی "بائند ہے" ایک نے غمزے سے کہا "چاند نہیں تو تارا ہے" دوسری ٹپکی لے کے بولی "اچھا پھکا تو بڑی خام پارا ہے" ایک بولی "سرو ہے یا چمن حسن کا شمشاد ہے" دوسری نے کہا "تیری جان کی قسم، پرستان کا پری زاد ہے" — کوئی بولی "غضب کا دلہا رہے" کسی نے کہا "دیوانو! چپ رہو، خدا جلنے کیا اسرار ہے" ایک نے کہا "چلو نزدیک سے دیکھ، آنکھ سینک کر، دل ٹھنڈا کریں" — کوئی کھلڈن کہہ اٹھی "دور ہو، ایسا نہ ہو، اسی حسرت میں تمام عمر جل جل میں" — ایک نے خوب بھانک تاک کے کہا "خدا جانے تم سب کے دیدوں میں چربی کہاں کی پھاگئی ہے، کیا ہوا ہے، یہ تو بھلا چکا، ہشاکٹا مردوا ہے" — سواری جھڑکی، ملکہ نے پوچھا "خیر ہے۔"

سب نے دست بستہ عرض کی "قرآن جائیں، جان کی اماں پائیں تو

نہان پر لائیں، ہمیشہ سواری حضور کی، اسی راہ سے جاتی ہے، مگر آج خلافت مہول
ان مذہبوں میں سے ایک شکل دھچپ ایسی نظر آتی ہے کہ فرد سے
سنا یوسف کو حسینان جہاں بھی دیکھے ایسا بے مثل طرہ دار نہ دیکھا نہ سنا
ملکہ مستجب ہو کے پوچھنے لگی "کہاں؟"

ایک نے عرض کی "وہ حضور کے سامنے"

جیسے ہی ملکہ کی نگاہ چہرہ بے نظیر، صورتِ دل پذیر، جان عالم پر پڑی، دیکھا
ایک جوان رشکِ مہر پیر کشفان، رعنا سرو قامت ہی بالا، بحرِ حسن و خوبی کا دُرِ یکتا،
کاسہ سر سے قر شاہی نمایاں، بادۂ حسنِ دل فریب سے معمور ہے، دماغِ کشورستانی
ہے، اٹھتی جوانی ہے، نشہ، شباب سے چکنا چور ہے، خمِ ابرو محرابِ حسینان
سمجھ گاہ پندہ نشینان، چشمِ غزالی، سرمہ آگیاں ہے، آہوئے رم دیدہ کشور چین ہے،
چتون سے ریدگی پیدا ہے، مست مے محبت ہے، اس پر چوکتا ہے، دیدے کی
سفیدی اور سیاہی، لیل و نہار کو آنکھ دکھاتی ہے۔ سوادِ چشم پر حورِ سیدائے دل
صدقہ کیا چاہتی ہے، حلقہٴ چشم میں ہموار مردم دیدہ دھرے ہیں
صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کوٹ بھرے ہیں، رتہ نکیلی اس کمانِ ابرو کی، دل
میں دو سار ہونے کو لیس ہے، رشکِ لیلیٰ یہ غیرتِ قیس ہے، ناوکِ نگاہ سے
پیرِ چرخ تک پناہ نہیں، دلدوزی بے گناہوں کی، اس کی ملت میں گناہ نہیں،
روحِ پیشانی تخیلِ سیس یا مطلع نور ہے، یا طبا شیر صبح یا شمع طور ہے، کاکلِ مشکیں
سے زلفِ سنبل کو پریشانی ہے، بوِ باس سے ختن والوں کو حیرانی ہے، عنبریں
بولیوں کو زندگی دباں ہے، بالِ بال پر پیچ و خمدار ہے، روئے تاباں بسانِ
چشمہٴ حیوان ظلمت سے نمودار ہے، ہما اپنے پردِ بال سے، اس صاحبِ اقبال
کا گمں راں ہے، رہنخ تابندہ کی چمک سے نیرِ اعظم لرزاں ہے، لبِ گلِ برگِ تر پہ
سبزے کی نمود ہے، یادِ صواں دھارِ مشتاقوں کے دل کا ٹھہر ہے، نظر کام نہیں
کرتی۔ قدرتِ ربّ و دود ہے، ہر حلقہٴ گیسوئے معنر کا کندِ گرہ گیر ہے، مگر بالوں
کے الجھنے سے کھلتا ہے کہ کسی کی زلفِ پیچاں کا اسیر ہے، خندہٴ دندانِ نلے ہونٹ
لعلِ بدخشاں کا رنگ مٹاتا ہے، دانتوں کی تاب سے گوہرِ غلطاں بے آب ہو جاتا
ہے، مشوئی کا اُن پر دانت ہے، دل و جان مارتے ہیں، جو نظر سے پنہاں ہوں

ڈاڑھیں مارتے ہیں، دم تقریر درج دہان جو کھوتا ہے، سامع موتی بدلتا ہے، ہرگز اعجاز
 نہا ہے، بیمار محبت کا سیما ہے، ہاتھ ہر ایک نہالِ الفت کی شاخ بار بار ہے، دل کی
 دست بردی کو اور خزانہ قادیان بانٹ دینے کو سر دست تیار ہے۔ کعب دست کی
 لکیر میں دستاویز محبت یہ قدرت سے تحریر ہے، سر نوشت سے یہ کھتا ہے کہ سلسلہ الفت
 میں کسی کے رگ و پے بستہ زنجیر ہے۔ ہر ات سینہ میں عکس افکن کوئی صاحبِ جلال
 ہے، بد نظر کسی کا خیال ہے، کمر نازک جبت پر چست باندھے ہے، بیٹھا سست ہے
 چلنے کو مثل صبا آندھی ہے، پاؤں وادی تلاش میں سرگرم رفتار ہیں، زیر قدم دشت و
 کہسار ہیں۔ قسمت اپنی برسر ماری ہے کہ ہمارے دام میں یہ ہملے ادب شرمایہ ہے۔
 یہ تصور دل میں تھا کہ کار پردازانِ محکمہ ناکامی حاضر ہوئے اور مشاطہ حسن و عشق نے
 پیش قدمی کر، متابع صبر و خرد، نقدِ دل و جان اساسِ ہوش و حواس، تابِ تباں
 ملکہ جگر افکار، ارمغانِ رونمائی میں نذر شاہزادہ دالا تبار کیا، عقل و دانش گم،
 صم بکم کا نقشہ ہوا۔ حضرت عشق کی مدد ہوئی، سب بلا رد ہوئی، شوقِ دل پیدا
 ہوا، جی شیدا ہوا، دفعتاً کیا تھا کیا ہوا۔ میر تقی ۵

تھی نظریا کہ جی کی آفت تھی وہ نظر ہی و دایر طاقت تھی
 ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبرِ رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
 دل پہ کرنے لگا طمید ناز رنگِ پھرے سے کر گیا پرواد
 ملکہ تھر تھرا کر ہوا دار پر غش ہوئی، خواصوں نے جلد جلد گلاب اور کیڑہ
 بید مشک چھڑکا۔ کوئی ناد علی پڑھنے لگی، کوئی سورہ یوسف دم کرنے کو آگے بڑھنے
 لگی، کسی نے بازو پر رومال کھینچ کر باندھا، تلوے سہلانے لگی، کوئی مٹی پر عطر
 چھڑک کر سونگھانے لگی، کوئی ہاتھ منہ کیوڑے سے دھوتی تھی، کوئی صدقے ہو ہو
 روتی تھی، کوئی بولی "چل کبھی کا کٹورہ لانا" کسی نے کہا "یشب کی تھنی دھو کے
 پلانا" کسی نے کہا "لاریب آسب ہے" کوئی بولی "عجب مہ پارہ ہے جس
 کے دیکھنے سے دل ناشکیب ہے" کوئی سمجھی "یہ شخص ہم جنس نہیں، قسم جن سے
 ہے" کوئی بولی "یہ غشی تقاضائے سن سے ہے۔"

غرض کہ دیر میں ملکہ کو افاقہ ہوا مگر دل مضطرب طیاں خواہش اسی طرف

کشاں، جذبِ عشق سے مقناطیس د آہن کا عالم، کششِ محبت سے کاہ و کمر با اُسی دم ہو گئی۔ رنگِ رو طائرِ پریدہ، صبر و ضبط دامن کشیدہ، مشورہ ہوا سواری ادھر سے پھیرو، ملکہ کو پنج میں گھیرو، لیکن تابِ تحمل و یارائے صبرِ ملکہ کو بالکل نہ تھا، فرمایا دیوانیاں ہو، یہ کوئی مسافر بیچارہ، خانماناں آدارہ، غربت کا مارا، تھک کر بیٹھ رہا ہے، اس سے ڈرتا کیا ہے۔ چلو نزدیک سے دکھیں۔ ناچار وہ سب فرمانبردار چلیں، مگر جھجکتی ایک دوسرے کو تنکتی، جوں جوں سواری قریب جاتی تھی، ملکہ کی چھاتی دھڑکتی تھی، دل میں تڑپ زیادہ پاتی تھی۔

اگرچہ جمالِ ملکہ مہرنگار بھی، سحر سامی کا نمونہ، مہر سے دُعا، عابد کش زاہد فریب تھا۔ جانِ عالم بھی بے چین ہوا، مگر دامنِ ضبط دست استقلال سے نہ چھوڑا، جس طرح بیٹھا تھا، جنبش نہ کی، یقیناً پر میل نہ آیا۔

ایک خواصِ خاص بہ اشاہِ ملکہ آگے بڑھی، پوچھا "کیوں جی میاں مسافر، تمہارا کدھرے آنا ہوا اور کیا مصیبت پڑی ہے، جو اکیلے سولے اللہ کی ذاتِ مہبت نہ کوئی سنگ نہ ساتھ، اس جنگل میں وارد ہو۔"

شہزادے نے مسکرا کر کہا "مصیبت خیرا تجھ پر پڑی ہوگی، معلوم ہوا یہاں آفت زدے آتے ہیں، کہو تو تم سب کی کیا کسمپختی، آیاؤں کی گردش نصیبوں کی سختی ہے، جو چڑیلوں کی طرح ناکام سرشام پھرتی ہو۔"

ملکہ یہ کلمہ سُن کے پھر دک گئی، خود فرمانے لگی "واہ صاحبِ تم بہت گرم، تند مزاج ہو، حال پوچھنے سے اتنا برہم ہو کر کڑا فقرہ سنایا کہ اس مردار کے ساتھ کتو کتو مجھ چھٹ، سب کو پھیل پائیاں بنایا۔"

جانِ عام نے کہا "اپنا دستور نہیں کہ ہر کس و ناکس سے ہم کلام ہوں دوسرے مردار سے بات کرنا مکروہ ہے، مگر خیر دھوکے میں جیسا اس نے سوال کیا، دیا ہم نے جواب دیا، اب تمہارے منہ سے مردار نکلا، ہم سمجھ گئے چپ ہو رہے۔"

ملکہ نے ہنس کر کہا "خوب، یک نہ شد دو شد، صاحبِ چونچ سنھاؤ ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو، کیا میرے دشمن درگزرِ مردار خور ہیں، بھلا وہ تو کلمہ کے سُن چکی، میں آپ سے پوچھتی ہوں، حضور کس سمت سے رونق افزا ہوئے اور قدم

مہمنت لازم ہے، اس دشتِ پُر خار کو کیوں رشک لالہ زار کیا۔“

جان عام نے کہا ”چہ خوش، آپ در پردہ بناتی ہیں، بگڑ بگڑ یہ سناتی ہیں ہم حضور کا ہے کو ہیں، تم جو جیتے جی چار کے کندھے بٹھسی کھڑی ہو، تم البتہ حضور ہو۔“
 جو جو جلیسیں تھیں بولیں ”ملکہ عالم! آپ کس سے گفتگو دو بدو کرتی ہیں! یہ مردھا تو لٹھ ہے، سخت نہ پھٹ ہے۔“

ملکہ بولی ”چپ رہو، ان باتوں میں دخل نہ دو، ایسا نہ ہو یہ بد مزہ ہو جائے تو صلو آئیں سنائے۔“

وہ سب ٹھیں، آپس میں کہا ”خدا خیر کرے آج جنگل میں گل پھولا چاہتا ہے یہ پردیسی پنچھی راہ بھولا چاہتا ہے۔“

پھر ملکہ نے کہا ”اے صاحب! کچھ منہ سے بولو، سر سے کھیلو۔“
 جان عالم نے کہا ”امرائیت کو کام نہ فرماؤ، نیچے آؤ، معلوم ہوا تم بڑی آدمی ہو، سواری مانجھ کی نہیں، خواصیں بھی تمھاری ہیں، خاک نشینوں کی ہم بستی اختیار کرو، تکلف تہہ کر رکھو، طبیعت حاضر ہوگی تو تمھارے بیٹھنے سے کہہ کہہ اٹھیں گے، آپ ہوادار کیا، ہوا کے گھوڑے پر سوار، ہم فقیر بستر خاک پر سایہ دار، حافظہ میں تفادیت رہ از کجاست تا بہ کہا۔“

ملکہ نے کہا ”اس مہمہ العمر میں ایسا مسافر جریدہ، دہن دیدہ تمھارے سوا بھڑانہ دیکھا نہ سنا، استاد سے

زباں سنبھالو یہ منہ زودیاں غریبوں پر خدا کی سہل کوئی تم سا بھی بد گام نہیں تم کوئی زور چیز ہوا، یکہ و تنہا، ٹٹو نہ گھوڑا، گھڑی نہ بچہ، ننگا لپکا، وہی شل ہے، رہے بھونپڑے میں، خواب دیکھے محلوں کا، ہر بات میں ٹھنڈی گرمیاں کرتے ہو، جو یہی خوشی ہے تو لو۔ یہ کہہ کے ہوادار سے اُتر، شہزادے کے برابر بیٹھ گئی، خواصوں نے بہت بھیانک ہو کے کہا ”لو بی بی یہ مڑ، کیا سحر بیان، جادو کا انسان ہے، ملکہ سی پری کو، گالیاں دے دے کر، کیسا فیضے میں اتار لیا، بیٹھے بٹھائے میدان مار لیا۔“

ایک بولی ”بھتے اپنے دیدوں کی قسم، سچ بولیو، ایسا جوان، زگیلا، سجدہ نکلا،“

ٹھٹھول، طرار، آفت کا پرکار، دنیا سے نرالا، تو نے یا کبھی تیری ملکہ نے دیکھا بھالا تھا،
اری دیوانی، نادان، خوبصورتی عجب چیز ہے، اس کا دوست طالب دشمن کا مطلوب
ہے، حسنِ خوب سب کو مرغوب ہے، جہاں کو عزیز ہے۔

غرض کہ جب ملکہ بیٹھی، جان عالم دم سرد پھر کے بول اٹھا لا اعلم
چہ گویم از سرد سامانِ خود غمِ لیت چوں کا کل یہ بخت پریشاں روزگارم خانہ بر دشمن
بولت سر اسر دل دکھاتا ہے کوئی ذکر اور ہی چھڑو پتہ خانہ بد دشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا
گرفتار رنجِ دالم، خوشی سے دوز مبتلا ہے غم، بے یار و مددگار، دوست نہ غمخوار،
آفت کا مارا، خانمانِ آوارہ ہمہ تن یاس، باخۂ حواس، توشہ راہ بجز غم جانکاہ نہیں،
در رہبر سوائے دل مضطر ہمراہ نہیں، گو پاؤں میں طاقتِ رفتار نہیں، لیکن ایڑیاں رگڑنا
بھی اس راہ میں ننگ و عار نہیں، یہ حال ہے وہ سب نام ہیں، کوہ و دشت اپنے
مقام ہیں اور یہ چند شعر، میر سوز صاحب کے مطابق حال ہیں۔ میر سوز

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے دریاں ہوں
لے ساکنانِ دنیا آرام دو گے اک شب
ہاں اہلِ بزمِ آفل میں بھی پر ایک سن لو
سوراخ چاک لاکھوں داغوں کی کون گنتی
نام و نشان نے یارب رسوا کیا ہے مجھ کو
قاتل پکارتا ہے اں کون کشتنی ہے
یہ پڑھ کے چپ ہو رہا، ملکہ سمجھی یہ مقرر شاہزادہ عالی تبار ہے، مگر کسی کا عشق
زار ہے، بات میں یہ تاثر ہے، کہ ہر کلمہ نادر کا تیر ہے۔ دل میں آیا، کسی طرح گھر
لے چلے، پھر مفصل حال معلوم ہو جائے گا، کہاں تک پھیلے گا۔ بہ منت و سماجت
کہا "اے عزیز! یہ سرزمین ہمارے علاقے میں ہے، تم یہاں مسافرانہ، اتفاقاتِ زمانہ سے
دارد ہو، مہمانی ہم پر واجب ہوئی، چند گام اور قدم رنجہ کیجئے، غریب خانہ قریب ہے،
آج کی شب اسراحت فرمائیے، نانِ خشک کھائیے، صبح اختیار باقی ہے۔"

جانِ عالم نے تبسم کر کے کہا "پھر در پردہ امارت کی لی، یعنی ہم تو یہاں کے
مالک ہیں، آپ بھوکے پیاسے سالک ہیں، چلو یہ فقرہ کسی فقیر کو سناؤ، محتاج کو کوڈر

جاہ و حشم دکھاؤ، جاہ اعتدال سے زبان کو کام فرسانہ فرماؤ، یہاں طبیعت اپنی اپنے اختیار میں نہیں اور رعاداری سے فرصت قلیل ہے، مکان پر جانا دعوت کھانا جبر ہے، اس کی کیا سبیل ہے؟

ملکہ نے افسردہ خاطری سے کہا "دعوت کا رد کرنا منع ہے، آئندہ آپ مختار ہیں، ہم مجبور و ناچار ہیں۔"

جان عالم نے دل میں خیال کیا، برسوں کے بعد ہم حبسوں کی صحبت میسر آئی ہے اور یہ بھی شاہزادی ہے۔ اس کا آئندہ کرنا زری بے حیائی ہے، آدمیت کا لحاظ، انسانیت کا پاس، اپنی بے اعتنائی کا حجاب کر کے کہا "کھلنے پینے سونے بیٹھنے کی ہوس دل سے اٹھ گئی ہے، مگر دل شکنی کسی کی اپنے مذہب میں گناہِ عظیم ہے، خدا علیم ہے میرے سونے عوض ہے دل شکنی کا بہت محال اے یار جو شیشہ ٹوٹے تو کیجئے جواب شیشے کا لیکن اتنی رکھائی اور کج ادائی، جو ظہور میں آئی، اس نظر سے ہفتی شرف در محفلِ خود راہ مدہ ہچو منے را افسردہ دل افسردہ کند ابغنے را

دلفکاروں کی صحبت سے ملال حصول ہوتا ہے، غمگین کا ہم نشین ہول ہوتا ہے۔ میر درد نہ کہیں عیش تمھارا بھی منفق ہووے دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو اور جو یونہی مرضی ہے تو بسم اللہ، یہ کہہ کر اٹھا، ساتھ ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ، پیادہ پا باتیں کرتا چلا، بسکہ شہزادہ لطیف و ظریف تھا، کوئی فقرہ نوک چوک، رمز و کنائے سے خالی، زبان پر نہ لاتا تھا، ملکہ کا ہر بات پر دل پگھلا جاتا تھا، مگر دل سے کہتی تھی کہ "اے ناکام و بخت نافرہام! ایسا نہ کرنا، کہ ہاتھ ننگ و ناہوس سے دھونا پڑے، بیٹھے بٹھائے الہم مفارقت میں رونا، جان کھونا پڑے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کا عاشق زار ہے، نشہ محبت میں سرشار ہے۔ دوسرے غریب الوطن بقول حیرن ۵

سافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت مگر تپشِ دل متصل ترقی میں تھی، خواہش، جی کی کاہش میں، بقراری کو اُس پر قرار تھا کہ خدا کے کارخانے میں کسی کو دخل نہیں ہوا۔ اے نادان! جو دم وصل ہے اُسے غنیمت جان۔ آغازِ عشق میں انجام سوچنا خلاف ہے، اس میں شرع کی تکلیف معاف ہے۔ مولف ۵

غنت جان لے یہ تیں آپس کی لے ناداں دگرگوں حال ہو جاتا ہے اک دم میں زمانے کا
 القصہ، تادرباغ پہنچے، دروازہ کھلا اندر آئے۔ جہاں کی فضائے صحرانہ تھی
 وہاں کے باغ کا کیا کہنا! اگر ایک تختہ کی صفت تحریر کروں، ہزار تختہ کاغذ پر بخط
 رجاں نہ لکھ سکوں، دم تسطیر قلم میں برگ نکلتے، لکھنا بار ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں
 بالکل پھولتے ہیں، صفحہ قرطاس پر گل پھولتے ہیں، حاسد کو خار ہوتا ہے، بہت
 آراستہ و پیراستہ، عرض مربع میں، چاروں کونوں پر نیگلے، گرد سبزہ نوخاستہ، دروازہ
 عالی شان، نفیس مکان۔ زیر دیوار، خندق پر کے لئے، اکیلے نہیں قطار در قطار
 تختہ بندی کی بہار، روش کی پٹریاں، قرینے کی، مہندی کی ٹیٹوں میں رنگت مینے کی۔
 گل مہندی، سرخ زرد پرافشاں، عباسی کے پھولوں سے قدرت حق نمایاں۔ زگس
 دیدہ منتظر کی شکل کھوکھائی تھی، گل شبو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی، سیوہ دار
 درخت، یک لخت جدا، بار کے بار سے ٹھنیاں جھکیں، درخت سرکشیدہ، پھل
 لطیف و خوشگوار، پھول نازک و قطعدار، روش بلور کی، نہریں نور کی، حوض و نہریں
 قمار سے جاری، چمنوں میں باد بہاری، موسم تاک میں تاک کا مستوں کی روش جھوننا، غنچہ سرتہ
 کا منہ تاک تاک کر نسیم کا چومنا، انگور کے خوشوں میں دل آبلہ دار کا پتا، زلفیت کی تھیلیا
 پڑھیں، نگہبانی کو گوشوں میں باغبانیاں، است کھڑیں، ہر تختہ ہر ابھرا، روش کی پٹریوں
 پر چینی کے ناندوں میں درخت گلزار، معبر معطر بیلا چنبیلی، موتیا موگرا، ملک بان، جوہی،
 کیچی، کیوڑا، سرسبز سنن کی زالی آن بان، ایک سمت تختوں میں لالہ خوف خزاں
 سے بادل داغدار، گرد اس کے نافرمان کی بہار، سرو شمشاد لب ہر جو، فاختہ اور قمری کی
 اس پر کوکو، حق سترہ شاخ گل پر بلبل شوریدہ کا شور، چمن میں رقصاں مور کیں خندہ
 کبک دی، کہیں تند و بر جلوہ گری نہریں میں قاز، بلند آواز، تیز پرواز ایک طرت قرقرے، سر سے
 پاتک درخت، گل و بار سے لدے، سیب و نہی و ناشپاتی سے، زرخ گلزاروں
 کی کیفیت نظر آتی، سنبھل مسلسل میں بیج و تاب زلف مہوشاں کا ڈھنگ، سوسن کی
 کی اودا ہٹ، مستی لب خوب رویوں کا جو بن دکھائی، داؤدی میں صنعت پروڈگار عیاں،
 صد برگ میں ہزار جلوے نہاں، آم کے درختوں میں کیریاں زمزم نگار، موسری کے درخت
 سایہ دار، باغبانیاں خوبصورت سرگرم کار، خواجہ سرا مرد اُن کے مددگار، حور و غلمان

کا عالم، سیلچے کھڑپایاں جواہر نگار، ہاتھوں میں باہم۔ درخت اور روشوں کو دیکھتی بھاتی
گل و بارہن سے چلتی، گلابی گڑا بار۔ جھڑا پڑا خار۔ صحن سے نکالتی پھرتی تھیں۔
بیچ میں بارہ دی پر شوکت، بارفت و شان پر شاں کا سامکان، ہر کرہ سما سجایا،
صنارِ نادر دست کا بنایا، غلام گردش کے آگے چوترا سنگ مرمر کا، حوضِ مصفا
پانی سے پھلکتا، فرش سب افشاں، پتھر کا۔ شامیانہ تمامی کا، سفید بادے کی بھال،
کلابتوں کی ڈوریاں، سراسر مغرق بنا، چودھویں رات ابر کھلا، آسمان صاف شبِ ماہ
سامان اس تکلف کا، برسات کی چاندنی، سبحان اللہ۔ فواروں کے خزانے میں، بادل
کٹ پڑا، ہزارے کا فوارہ چڑھا، پانی کے ساتھ بادے کی چمک، ہوا میں پھولوں کی مہک،
فوارے نے زمین کو ہمسر آسمان بنایا تھا، ستاروں کے بدلے بادے کے تاروں کو بچایا
تھا، بڑی چمک دمک سے، ملک کے مکان پر چاندنی دیکھنے کا سامان تھا۔ شہزادے کے
آنے کا کسے گمان تھا۔ غرضکہ جانا عالم کو لے جا، شامیانے تے سند مغرق پر بٹھایا، خراج
ارغوانی و زعفرانی کی گلابیاں، کشتیوں میں لے کر وہ وہ زن پری پیکر، زیب دہ انجن
ہوئی کہ بطرے رشک و خجالت سے بحرِ مذمت میں غوطہ زن ہوئی۔ ایک طرف جاؤ
سیو ایک سمت نغمہ سرا یانِ خورو و خوش گلو، سفید سفید صوفیائی پوشاک، سرے
پاؤں تک الماس کا زیور، دو رویہ صفت باندھ کر کھڑی ہوئیں، ان کے بیٹھتے ہی گانا
ناچ شروع ہوا، سازگی کے سر کی زوں ٹوں کی صدا، چرخ پر زہرہ کے گوش زد ہوئی
تھی، طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک، خفتگانِ خاک کا صبر و قرار کھوتی تھی، ہر تان
اوج، تانِ سبب پر طعن کرتی، باربد اور نیکیا کے ہوش پراں تھے چھوٹاں کو فحش تھا۔
غلام رسول حیران تھے، زمزمے اور تحریرِ گفکری پر شوری زور و شور سے ہاتھ ملتا تھا۔
ہر بسی فقرے اور سر کے پلٹے پر، الہی بخش پورے کا جی نکلتا تھا۔ ناچنے کو ایسے ایسے
برق و ش آئے اور اس تال و سم سے گھونگر و بجائے، کہ للو جی شرماے، کتھک جوڑے
استاد اتھک تھے، انھوں نے سم کھائے۔ ٹھوکر مردہ دلوں کی میجائی کرتی تھی۔ گت کے
ہاتھ پر یہ گت تھی کہ مجلس کعبِ افسوس ملتی تھی اور دم سرد بھرتی تھی۔

جب ہنگامہ صحت، بایں نوبت پہونچا کہ راجا اندر کی محفل کا جلسہ نظر سے گر گیا،
بہشت کا سامان پیش چشم پھر گیا۔ اُس وقت ملک ہزنگا نے گلاس، شراب سے بھر کر شہزادہ

کو دیا کہا " اے اولش کر دیجئے تاریخ سفر خاطر انور سے دور ہو، مجھے استفسار حال ضرور ہے۔ " جان عالم نے بابا پناہ ظاہر انکار کیا۔
 مہنگار نے کہا " آپ دل شکنی روا نہیں رکھتے، اس پہلو ہتی کرنے میں ملال خاطر کے سوا کیا مقصود ہے؟ "

شہزادے نے مسکرا کر ساغر ہاتھ میں لیا۔ یہ کہہ کر باطبع شکفتہ پایا۔ انشاہ
 گریارے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے ناہنیں میں شیخ نہیں کچھ دلی نہیں
 پھر جان عالم نے جام لبالب اپنے ہاتھ سے بھر کے ملکہ کو دیا، دور جام بے غلہ
 نیرنگی ایام چل نکلا، دوچار ساغر آب آتش رنگ جوانی کی رنگ میں پیہم و متواتر جو
 پئے، دونوں کو گونہ سرد ہوا، رنج سفر ادھر سے، تمیز و خیال خیر و شر ادھر سے
 دور ہوا، اس وقت جان عالم نے کہا۔ میر درد سے

ساتیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب ملک بس چل سکے، ساغر چلے
 یہ سن کر دہی خواص گرما گرم، جس نے شاہزادے سے پہلے گفتگو کی تھی، ملکہ کے
 بہت منہ لگی تھی یہ بولی۔ بقاے

لطف شبِ مہ اے دل اس دم تجھے چل ہو اک چاند نعل میں ہواک چاند مقابل ہو
 ملکہ نے بحسرت فرمایا کہ " سردار، ہم تیری پھیڑ چھاڑ سب سمجھتے ہیں، کیا کریں اسوں
 کی جگہ، حال اپنا موافق قول سودا ہے۔ رفیع سودا ہے

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی پرزار ہے مرزہ باداے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے
 جان عالم نے یہ سن کر اسی خواص کو سا کر متنبہ کیا۔ استاد سے
 میں مسافر ہوں مجھ سے دل لگا کیا بھروسہ مرا رہا نہ رہا
 ملکہ ٹال کے حال پوچھنے لگی کہ " تمہیں بخدا اے عزوجل، سچ کہو تم کون ہو؟ "

کہاں سے آئے ہو، کس کی تلاش میں خود رفتہ گھبراے ہو؟
 اُس وقت جان عالم کو بجز راستی مفر نظر نہ آیا، کہا " ملکہ میں شاہ فیروز تخت
 کا بیٹا ہوں، جان عالم نام ہے، مرزین حق وطن ہے۔ مسحت آباد، بیت السلطنت
 کا مقام ہے، میں نے ایک کوتاہ مول یا تھا، بہت طرار، سحر گفتار، اس کی زبان
 سے شہرہ حسن انجن آرا سن کے نادیدہ، دیوانہ دار، بیقرار بیابان مرگ آوارہ

وطن، مورد رنج و محن ہوا ہوں۔“ پھر کوسے کا راہ میں اڑ جاتا، وزیر زادے کا پتہ نہ پاتا، شمع بیان گرفتاری طلسم، اور اپنی خواری، جادو گرنی کا نقش سلیمانی کا دنیا اور اپنا رستہ لینا، کہہ کر کہا، ”بے ملک زرنکار پہنچے نہ جان کو چین، نہ دل کو قرار ہے، زیت بیکار ہے۔“ اور یہ غزل پڑھی۔ مولف سے

بسوز شمع رویاں اس طرح کا سینہ سوزاں ہوں
لنیم صبح ہوں یا بوسے گل یا شمع سوزاں ہوں
نہ پھل پایا، لگانے کو بجز افسوس و حسرت سے
عبث تدبیر ہے گند کھن کی اس کے کوچ میں
نہ مرتے مرتے نہ پھیرا محبت سے کبھی میں نے
تنی رہتی ہے اکثر چادرِ مہتاب تربت پر
سرد غم رسیدہ ہوں مجھے طوفانِ محشر میں
کہ رفته رفته آخر جلوہ سرو چراغاں ہوں
میں ہوں جس رنگ میں پیارے غرض دم بکھر مہاں ہوں
میں نخل بے ثمر کس مرتبہ مردود و ہتھکان ہوں
میں ننگ دو جہاں ننگے ہی رکھ دینے کا شایان ہوں
جھانک میں کس قدر پھیلیں و فاپر اپنی نازاں ہوں
کہ تا معلوم ہو سب کو قتل مہ جیناں ہوں
ترانا تو ہی خاندانِ غریب بحر عسیاں ہوں

ملکہ نے جب سنا کہ یہ فریقہ جمال پری تمثالِ انجمن آ رہی ہے۔ آہ دلوز، لغو جانسوز، کھینچ کر روئے لگی، امید قطع ہوئی۔ جان عالم نے بیقرار ہو کے کہا ”اے ملکہ ہرنکار خیر باشد۔“ ملکہ نے اسی حال میں کہا۔ استاد سے

ماکل اس فتنہ عالم پہ کیا جو مجھ کو
چاکِ دل تک تو کچھ اے دستِ جنوں ڈرہ تھا
سوئے بیداد مگر مرضی دواں آئی
یہ کھلا اب تو کہ نوبت بہ گریباں آئی
اے شاہزادہ دالالتبار غارت گر کشورِ دلِ عاشق زار میرا حال سن

”عجیب واقعہ و طرفہ ماجرا اے ہست“

”باپ میرا بھی شہنشاہ تھا، بہت سے تاجدار خراج گزار تھے، مگر ابتداء سے طبیعت متوجہ فقر اور عبادت کی حالت تھی۔ آخر کار کارخانہ دیکھے دوں چھ و پوچ جان کے یہ ضرور زبان۔ سوز سے

جب چچ ہی ہم بوجھ چکے وضع جہاں کو
غرضیکہ حکومت کا بکھڑا چھوڑا، معاملہ سلطنت بیکار جان، اور بے ثباتی، جہاں گند
نظر کر، دنیا سے ہاتھ اکھٹایا، بادشاہت مٹا آبادی سے منہ موڑا، اس صحرائے پُر خار
میں مکان بنا کے بیٹھ رہا، ہر چند مجھے شادی کو ارشاد کیا، میں نے بسببِ مفارقت

انکار کیا، اب دفعتاً آفت آسمانی و بلا سے ناگمانی، مجھ پر ٹوٹ پڑی کہ بیک نگاہ عاشق
کیا، دیوانی ہو گئی، ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔ میرے

رسوا ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا کیا جلیے کہ دیکھتے ہی مجھ کو کیا ہوا
اور تو اس کا عاشق و طلیکار ہے، جس کا نظیر اس زمانے میں ہاتھ آنا بہت
دشوار ہے۔ میرے

محل نشین ہیں کتنے خدام یا دیں یاں لیلے کا ایک ناقد سوکس قطار میں یاں
اب بجز مرگ کیا چارہ، میں ننگ خانماں خراب کنندہ خاندان فقط ذلت
خواری ماں باپ کی اور گریہ و زاری اپنی چاہتی تھی، صبح تو کہاں، میں کہاں، یہ
صحبت شب خواب ہو جائے گی، نمود صبح مفارقت، شام غربت کا رنگ دکھائے
گی، دامن سحر کی طرح گریبان صبر چاک ہوگا، ہمارے سر پر آفت و خرابی آئے گی،
انصاف کیجئے، کس سے کہوں گی، بیقراری ستاتی ہے، جان عالم کی جلدی سے روح بدن جدا ہوتی ہے،
جان جساتی ہے، ہم صحبتیں طعنے دیں گی، انیسویں چھٹی چھٹی کر جان لیں گی، جب لونڈیوں
پر خفا ہوں گی، بڑبڑائیں گی، زبان پر یہ کلمہ لائیں گی، "ملکہ عاشقی کا رخ دلاں یوں
در پردہ ٹالتی ہیں، شہزادہ چلا گیا، نہ رک سکا، اس سے بس نہ چلا، غصے کی جھانچھ
ہم پر نکالتی ہیں" باپ پر حال کھلا، تو خجالت ہوگی۔ ماں نے گرنا تو ندامت سے
کیا حالت ہوگی۔ رسوائی کے خوف سے دل کھول کر نہ رو سکوں گی۔ بدنامی کے ڈر سے
جی نہ کھوسکوں گی۔ جب دل بیتاب ہوئے گھبرائے گا، فرمایئے کون تسکین فرمائے گا
کیا کہہ کے سمجھائے گا۔ آپ ادھر تشریف لے جائیں گے ہم ادھر غم فرقت سے گھٹ
گھٹ کر مر جائیں گے۔ ہماری سرنوشہ پر ردنا روا ہے۔ ماجرا ہمارا عبرت و حیرت افزا
ہے۔ ہر چند نطلِ سبانی، عارِ بے بدل ساحر بے مثل ہیں، علوی و سفلی سب کچھ
پڑھا لکھا، ہماری پریشانی اور لوح جبین کی تحریر نہ دیکھی کہ کیا پیش آتی ہے اور خط
شکستہ سے ایسے نستعلیق نے کیا برا لکھا ہے، افسوس صد افسوس۔ مؤلف سے

وہ بھی ہوگا کوئی امید برآئی جس کی اپنے مطلب تو نہ اس چرخ کہن سے نکلے
یہ باتیں کر دل پر ہاتھ دھونے لگی، دامن و گریباں آنسوؤں سے بھگوٹے
لگی۔ شہزادے کو ثابت کیا، یقین ہوا کہ ملکہ بہ شدت فریفتہ و شیدا ہے، بات سے خزن

ملاں پیدا ہے، دل دکھنے کے مزے سے زبان لذت پا چکی تھی، جان ہجر کے صدمے اٹھا چکی تھی، بے چین ہو کر بولا "زبان کو تسکین کی باتوں میں کھولا۔ کہا" آپ کا کدھر خیال ہے، بندہ فرما بنردار بہر حال ہے، جو کہو گی بجالاؤں گا، بار اطاعت سے سر نہ اٹھاؤں گا، مگر برائے چندے صبر دل پر جبر ضرور ہے، اگر اس کی جستجو میں نہ جاؤں گا، تمہیں میری کیا امید ہو گی، ہم چشموں کو کیا متہ دکھاؤں گا۔" سبحان اللہ وہ وقت دیکھا چاہئے کہ معشوق عاشق کی تسکین کرے، اپنی اطاعت اس کے ذہن نشین کرے، خوش قسمتوں کو ایسے بھی مل جاتے ہیں کہ عاشق کے رنج و غم کھاتے ہیں، دلداری کر کے سمجھاتے ہیں۔ اس کا لوگ رشک کرتے ہیں، آتشِ حسد سے جل مرتے ہیں۔ ملکہ یہ سن کر دل میں خاد بندہ فکرِ غم سے آزاد ہوئی۔ یہ بات امتحان کی ہے، جسے جی پیار کرتا ہو، اگر وہ جھوٹ بھی بولے تو عاشق کو بیچ کیا بمنزلہ آیت و حدیث ہو جاتا ہے مگر یہ کہا۔ مصحفی ۵

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبرِ تحمل وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو
لیکن خیر ہم تو اسے بھی تبیل لیں، یہ کھیل بھی کھیل لیں، اگر ہماری یاد تمہیں فراموش نہ ہو، وحشت کا جوش نہ ہو۔

جان عالم نے قسمیں شدید کھائیں، اختلاط کی باتیں درمیان میں آئیں، کہ اس میں سروِ فرق نہ ہوگا اور مرثدہ وصل سے سرور کیا، خیالِ مفارقت ملکہ کے دل سے دور کیا، کہا "اب مہنسی خوشی کی باتیں کرو، یہ بکھیرا جانے دو، مفارقت سر پر کھڑی ہے، رات تھوڑی، کہانی بڑی ہے، فلک سفلہ پور جفا کیش ہے، عاشق و معشوق کا بداندیش ہے۔ استاد ۵

بہ شب وصل شکوہ ہا مکنید شبِ کوتاہ قصہ بسیار ست
مگر شب وصل ہمیشہ سے کوتاہ ہے، خدا گواہ ہے۔ دو کلمے مہنسی کے ہنوز پورے نہ ہونے پائے، گردوں کو رشک آئے، یکایک مرغِ سحر بیدار باش پکارا، زاہد نے لغزۃ اللہ اکبر مارا، گجر کی آواز بھی دونوں کے کانوں میں آئی، بسا دلائلِ سلطانِ خاد نے صبح کی دھوم مچائی، ملکہ پریشان ہو کے بولی۔ مولف ۵
وصل کی شب چونک اٹھے ہم سب کی زاہد کی صدا یاں دم تکیری اللہ اکبر ہو گیا

زاہد بھی تیسرا ہے شب وصل میں حریف مشہور گو جہان میں صبح و غروب ہے
جان عالم نے نماز صبح پڑھ کر کر بزم سفر چست کی، ملکہ سہم کر آبدیدہ ہوئی
شعر پڑھنے لگی۔ جرات ۵

نہ آیا اور کچھ اس چرخ کو آیا تو یہ آیا گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روزِ ہجران کا
جب شہزادے نے چلنے کا قصد کیا، ملکہ نے کہا "اگر ہرج متصور نہ ہو میرے
والد سے ملاقات کر لو، یہ امر فائدے سے خالی، لا ابالی نہ ہوگا۔"

جان عالم نے کہا "بہتر ہے" پھر وہی خواص ہمراہ ہوئی، جب وہاں پہنچا دیکھا
بوریاے بے ریا بچھا ہے، مصلے پر ایک مردِ مہذب، بذکرِ حق مشغول، بادلِ ملول بیٹھا ہے
یہ رسم سلام بجا لایا، اس نے دعائے خیر دے کر، ہاتھ بڑھایا، چھاتی سے لگایا، قریب
بٹھاکے فرمایا "ماجرائے شب تیرہ ملکہ فقیر پر روشن ہے، ایسی بد قسمت دوسری خلق
میں خلق نہیں ہوئی، ہمارے کہنے سے انکار کیا، بڑے بول کا سر نیچا ہوا تو تم سے کیا
کیا دار و مدار کیا، جو تم اتنی تسکین نہ کرتے، تو اس کا زندہ رہنا محال تھا، اس
طرح کا دل پر صدمہ اور ملال تھا، اگر ایفائے وعدہ کر دو گے اللہ بھلا کرے گا، ورنہ
یہ رنج بُرا ہے، دیکھئے اس کا کیا حال کرے گا، دلداری جگر نگاروں کی عیادت
مرضِ محبت کے بیماروں کی جو انردوں پر فرض ہے۔ یہ سمجھنا۔ ساحلِ رازِ خس و خاشاک
گذازد گلِ رازِ غارِ ننگ و غارِ منی پاشد۔"

شہزادے نے سر جھکا عرض کی "آپ کیوں محبوب فرماتے ہیں، مجبور ہوں، اس
غم میں گھر چھوڑا، عزیزوں، یگانوں سے ترک کر، شہر سے منہ موڑا، وہ کہیں گے سخت
کم ہمت اور بے جرات تھا، راہ میں آسائش ملی، بیٹھ رہا، خوف سے جانہ سکا، جھوٹا
تھا ناحق عشق کا دم بھرا۔"

پیر مرد نے فرمایا "مرحبا، جزاک اللہ، یہی شرط جو انردی و ثابت قدمی ہے ہمیں
بھی تمھارے اس عزم سے ایفائے وعدہ کی امید ہوئی۔" پھر ایک لوحِ عنایت کی، اور
کہا "جب کوئی ہم سخت رو بکار ہو بطرِ زوال اُس حال میں اسے دیکھنا جو اُس پر عمل
کرنا۔ اللہ تعالیٰ وہ مشکل سخت ایک آن میں آسان کرے گا۔ یوحفظ حافظ حقیقی پروردگار"

اللہ تعالیٰ کنتم۔ فرد

بہ سفر رفتنت مبارک باد بہ سلامت روی دیار آئی
شہزادہ خجست ہوا لوح لے کر ملکہ کے پاس آیا، یہ شعر زبان پر لایا۔ مولف
کوچ کی اپنے اب تیاری ہے تیرا حافظ جناب باری ہے
ملکہ ناکام، گردش ایام دیکھ، اور یہ کلمہ جانکاہ سن کر، کلیجہ تھام، سر دھن کر، یہ
اشعار پڑھنے لگی۔ استاد

میں مرگئی سن اس کے سرا انجام سفر کا آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا
کہتے ہیں وہ اب جاتا ہے ایسی ہی دھا کر مسدود ہو رستہ دل ناکام سفر کا
مت جان نکمی مجھے اے جان لے چل کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا
میں کشور ہستی ہی سے اب کوچ کروں گی آگے نہ مرے لیجیو تو نام سفر کا
چلنے کی صلاح اس کے ٹھرتی نہیں اب ساتھ موقوف نوازش ہوا آرام سفر کا
آخر جبراً قہراً رخصت کیا کہا "خدا حافظ امام ضامن ثامن کو سو نپاٹ
ترا موسیٰ رضا ضامن ترا اللہ والی ہے

جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو، اسی صورت اللہ تمہارا منہ دکھائے، غم
دوری ہمارا دور ہو جائے۔ جان عالم یہ سن کر روانہ ہوا، یہاں طیش دل کو بہانہ ہوا،
دریائے شرک چشم خون پالائے موج زن ہوا، غریق لہجہ مفارقت جان دتن ہوا،
جلیسین بولیں "ملکہ جی کھوؤ گی، جو اس طرح بلک بلک کر روو گی، مسافر کے پیچھے
رونا، زبون از حد ہے، بی بی خیر ہے، یہ تنگوں بد ہے، وہ بھی دن اللہ دکھائے گا،
جو وہ پر دیسی صبح و سلامت خیر سے گھر آئے گا، تو ان کو یہ سمجھائی۔ سوز
چشم کا کام اشک باری ہے چشمہ فیض ہے کہ جاری ہے
مولف

بیدرد کوئی اتنا سمجھتا نہیں ہے دل دکھے تو کس طرح سے فریاد نہ ہووے
ولہ

مجھ کو رونے کو نہ تم منع کرو ہم نفسو غم دن کرتی ہوں میں دیدہ تر سے خالی
ادرجب آنسو کھنکرتے تو دل اور جگر سینے میں برہمی کرتے، اس وقت گھبرا کر یہ کہتی

مدد اے سوزِ جگر تاکہ نہ ہو دے خفست
 نوکِ مرگان ہوئی پھر سخت جگر سے خالی
 پھر نہ منہ اس نے کیا میری طرف ہی ظالم
 سخت تم بھی مرے نالو ہوا اثر سے خالی
 نہ لگا اس کو مری بات کو تو مان سرور
 دل کا لگنا نہیں اے یار ضرر سے خالی
 غرض کہ جوں جوں شہزادے کی مفارقت بڑھتی تھی، ملکہ صدمہ ہجر سے دوںوں
 گھٹتی تھی، بدر سا چہرہ ہلاں ہوا، تپِ جدائی سے عجب حال ہوا، کبھی کہتی تھی "وای
 ناکامی اگر دل کا حال کہوں شرم آتی ہے، جو چپ رہوں جان جاتی ہے، یہ سب
 کہتے ہوں گے، ملکہ کو غیرت نہیں آتی، راہ چلتوں سے بیٹھے بٹھکے دل لگاتی ہے،
 آپ روتی ہے، ہمیں مفت رلاتی ہے، اُس سمجھانے والے کو کہاں سے لاؤں،
 جسے دل کا حال سناؤں، زسیت اسی میں ہے، جو مر جاؤں، اب کون آنسو پونچھ دے
 کو منع کرے گا، کون میرے دم گرم پر آہ سرد بھرے گا، پیار سے سر چھپاتی پر دھرے گا۔"
 جب ملکہ کا یہ حال بتر چکے چکے جی سے باتیں کرنا، دیکھ کر لوگ گھیرتے،
 دستِ شفقت سرِ وحشت انگیز پر پھیرتے اور پوچھتے کہ 'اے جی کے دشمن ہمیں تو بتا
 دل کا حال کیا ہے تو وہ کہتی اور تو کچھ جانتی نہیں پر یہ نقشہ ہے ہاتھ پاؤں سنستے
 ہیں خود بخود غش چلے آتے ہیں، دم سینے میں بند ہے، گھبراتا ہے مکان کا ٹلے کھاتا ہے،
 باغ ویران گل بوٹا خار معلوم ہوتا ہے، گھر زندان، بات کرنا بیکار معلوم ہوتا ہے،
 جان بیقرار ہے، بند بند ٹوٹتا ہے، دامنِ صبر دستِ استقلال سے چھوٹتا ہے، جنگل
 پسند ہے، ویرانی کا جی خواہش مند ہے، دشت کا سناٹا بھاتا ہے، بیل کا نالہ دل
 دکھاتا ہے، خدا جانے کس کی جستجو ہے، دل کو مرغوب قمری کی کو کو ہے، تنہائی خوش
 آتی ہے، آدمیوں کی صورت سے طبیعت نفرت کھاتی ہے، سینہ جلتا ہے، دل کو کوئی
 مسوس کرتا ہے، آنکھ ظاہر میں بند ہوئی جاتی ہے، مگر نیند مطلق نہیں آتی ہے،
 ہاتھ چاہتے ہیں، سردست چاکِ گریباں دکھیں، پاؤں چل نکلے ہیں کہ بیاباں دکھیں،
 نل دمن کی مشنوی سے ربط ہے، لیلیٰ و مجنوں کا قصہ پڑھتی ہوں، یہ کیا ضبط ہے، دل
 کی تمنا ہے کہ بے قراری کر، آنکھیں اٹھی ہیں کہ اشکباری کر، جہاں کی بات سے کان
 پریشان ہوتے ہیں، مگر جانِ عالم کا ذکر، دل لگا کر سنتی ہوں، جو کوئی سمجھاتا ہے، رونا

چلا آتا ہے، سردھنتی ہوں۔ ناکامی مجھ خستہ و پریشاں کا کام ہے، آہ مجھ بے سروسامان
 کا تکیہ کلام ہے، منہ کی رونق جاتی رہی، زردی چھا گئی، بہار حسن پر خزاں آگئی۔ ہر دم
 لب پر آہِ سرد ہے، ایک دل ہے اور ہزار طرح کا درد ہے، جان جانے کا
 دسواں نہیں، بزرگوں کا لحاظ و پاس نہیں، زیور طوق و سلاسل ہے، زیبِ زینت
 سے بدمزگی حاصل ہے، دل و جگر میں گھاؤ ہے۔ بگاڑ بناؤ ہے، بسترِ زمِ خار ہے،
 ارے لوگو! یہ کیا آزار ہے، سب سے آنکھ چراتی ہوں، ہم صحبتوں سے شرابی ہوں،
 اب صدمہ اٹھانے کا یارا نہیں، بے موت اس بکھیرے سے پھنکارا نہیں، عجب حال
 ہے، اکثر یہ خیال ہے۔ مولف ۵

انوس یہ حال ایک عالم دیکھے ایسا نہ ہوا کہ جانِ عالم دیکھے

اگر اسی کا عشق عاشقی نام ہے، تو میں درگدری۔ میرا سلام ہے، جو لوگ عشق
 کرتے تھے، کیونکر جیتے تھے بتاؤ تو کیا کھاتے تھے، دو دن سے کچھ نہیں کھایا، مگر پیٹ بھرا
 ہے، کھڑی ہوں جی بیٹھا جاتا ہے، پہلے مجھے نہ منع کیا۔ ہے میرے جان کے دشمنو!
 یہ کیا کیا؟ اللہ کی مرضی کسی کا کیا بگڑا، میری قسمت کا لکھا، جو کیا اچھا کیا۔
 یہ سن کے ایک کھیل کھائی، عشق کے صدمے اٹھائی قریب آئی، کہا "قرآنِ جاوید"
 واری ابھی سلامتی سے نو گرفتاری ہے، جو اتنی آہ و زاری اور بیقراری ہے، سستے سستے
 عادت ہو جائے گی تو تسکین آئے گی۔ ان باتوں کے سنتے سے دل جو بھرا آیا بے اختیار
 خوننا بہ دلِ نحتِ جگر چشمِ تر سے متھل بہانے لگی۔ دیدہ دیدار طلب سے سمندر کی لہر لہرائے
 لگی، نظم میں دل کا حال سنانے لگی۔ مولف ۵

کیا کیا تڑپ سناؤں دلِ بیقرار کی حالت ہے اس کی پلے کی برق و شرار کی
 منت کشی نہ کرنی پڑی نوکِ خار کی پھوٹے طیش سے دل کے یہ سب کبلے مرے
 حاجت رہے گی ہم کو نہ شمعِ مزار کی دل اپنا قبر میں بھی جلے گا اسی طرح
 دیتے ہیں مثلِ لوگ مرے انتظار کی وعدے کی شب کو دیدہ اختر جھپک گئے
 حسرت بھری ہے دل میں کئے کوئے یار کی ے جائیو ادھر سے جنازہ مرا سرور

رخصت ہونا جانے عالم کا ملکہ ہرنگار
 اور پہنچنا ملک میں اُس غزالِ رمیدہ صحرائے بے اعتنائی، پرورد
 ہمدِ ناز و گہوارہ کج ادائی، اور نپانا صیدِ مطلب کا، پھر گریہ زاری
 پھر رطائی جادو کی ملاقات اس ہر و کی

یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں سُنو پھر اسی غمزدے کا بیان

طلسم کشایانِ گنجینہ سخن، فخر سامری و رہ نوردانِ اقلیم حکایاتِ کہن، مشاق
 جادو و شعبہ گری، رستمِ مانِ جفاکش و محنت کشیدہ، سحر سازانِ سخنِ سنج، دریں سرے
 سے سنج، روئے راحت ندیدہ، گو سالہ سخن کو دیر خراب آباد میں یوں گویا کرتے ہیں، کہ
 ملکہ ہرنگار کے باغ سے چالیس منزل، ملکِ زرنگار کشورِ آفتِ روزگار تھا، شہزادہ دل
 زکف دادہ، یکہ دتہا، صعوبتِ سفر کا مبتلا، پاؤں میں پھلے، لب پر آہ و نالے، گرتا
 پڑتا کسی مہینے کے بعد، اُس زمینِ خجستہ آئین میں پہونچا، اور جو جو پتے توڑنے سے قبلے
 تھے، وہ سب اُس جوار میں پائے، واقعی عجب نوارِ شگفتہ و شاداب، ہر سمت
 چشمہ ہائے آب، جنگلِ سب سبزہ زار، گل بوئے خود رو کی انوکھی بہار، ہوا فرحت
 انگیز، بوباس مشک بیز، جنوں خیز۔ جان عالم خوش و خرم، جلد جلد قدم اکھٹا چلا
 جاتا تھا۔

ایک روز چار گھڑی دن رہے کیا دیکھتا ہے کہ ایک شے مثل آفتاب، بصد

آب و تاب، شمال کی سمت یہ درخشاں ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی، عقل حیران ہے،
 دل سے کہا، آثارِ حشر نمود ہوئے، یہ کیا قیامت ہے، ہم مشاہدہ جمالِ جاناں
 سے محروم رہے، مشرق و مغرب کو چھوڑ سورج شمال کی طرف جانکلا، افسوس صد
 افسوس۔ اب تک نہ دل کا مدعا نکلا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا دروازہ ہے،
 عالیشان سر بہ اوج فلک کشیدہ، دیدہ روزگار ندیدہ، بسکہ مطلقاً ہے اور عل و
 یا قوت اس کثرت سے جڑے ہیں کہ جوہری دہم و گمان حیران کھڑے ہیں شعاع
 آفتاب سے یک رنگی خورشید حاصل ہے، شرمندہ اُس کے روبرو بدر کا مل ہے،
 یقین ہوا اب برسرِ مطلب پہنچا، یہ وہی دروازہ ہے، بابِ امید جس کا ذکر
 وہ سرخرو، زمر دلباس کرتا تھا۔ سجدہ شکر بدرگاہِ منزلِ رسانِ راہِ گم کردگان کیا اور خوش
 ہو کر دوڑا فرد سے

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد
 غرض اقبال و خیزان، درِ شہرِ پناہ پر آیا، دروازہ جواہر نگار، رختِ فلک
 دکھاتا، دیوار و درجہ گاتا، بلور کی اینٹیں، یا قوت کی تحریر، ہر خشتِ مصفا و مطلقاً،
 درِ بہشت کی طرح و احسن حصین، لصدِ فخر و تمکین بنا، جا بجا بُرجِ برنجی و آسمانی
 ڈھلے ہوئے توپیں چڑھیں، گولہ انداز، جوان جوان بنفشہ بادے کے دگلے، گلزار
 پہنے، ایک پیچے پیچے چست و چالاک توپوں کے بائیں دہنے ٹہل رہے، زمین و
 آسمان ان کی ہیبت سے دہل رہے، گلی کوپے صاف خس نہ خاشاک دروازے
 پر پلنچ ہزار سوار، لاکھ پیادے کی چھاؤنی، کچھ جنگ کے آمادہ تیار،
 جانِ عالم نے اُن سے پوچھا "اس شہر کا کیا نام ہے اور حاکم یہاں کا کون
 ذی احترام ہے؟" انھوں نے دیکھا، ایک جوان سر و قامت، قرطعتِ خوبِ سفر،
 خاکِ رہگذر میں نہاں ہے، مگر دبدبہ شوکت و صولت نشانِ جرأتِ چہرہ اور سے
 عیاں ہے، وہ خود کہنے لگے "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"
 شہزادے نے کہا "بھائی سوال دیگر جواب دیگر"
 آخر ایک شخص نے کہا "قبلہ اس ملک کو زرنکار کہتے ہیں۔"
 یہ سنتے ہی چہرہ بشاشت سے گزند کی طرح دکنے لگا، جو ریت کا ذرہ تھا،

افشاں کی صورت منہ پر چمکنے لگا۔ دل سے کہا۔ "یہ خواب ہے یا بیداری، طالع گردشِ دہ سے اُمید یاری و مددگاری نہ تھی، ایسی قسمت رہبر ہماری نہ تھی، پھر کچھ نہ پوچھا۔ یہ کہتا چلا۔ مولف ۵

سدا الحمد ٹھکانے لگی محنت میری طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری دروازے سے آگے بڑھا، شہر دیکھا، قطعدار، ہموار قرینے سے بازار، کرسی ہر دکان کی کمر برابر، مکان ایک سے ایک بہتر و برتر، بیچ میں ہنر جا بجا فوارے سب عمارات شہر نپاہ کے میل کے جواہر نگار ساپنچے کے ڈھلے۔ لاکھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی، ایک کا جواب دوسری طرف۔ ادھر بازار تو ادھر بھی صراف کے مقابل صراف، بازار کا صحن، نفیس شفاف۔ جوہری کے روبرو جوہری، زرد جواہر کا ہر سمت ڈھیر، نقد و جنس سے ہر شخص سیر کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار میں نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا۔ جنوب و شمال کا خریدار تھا، حلوائی، نانوائی، کنجڑے قصائی، سقوں کے کٹوروں کی جھنکار، میوہ فروشوں کی پکار، دلالوں کی بول چال، جہاں کا اسباب و مال، ہنر کی کیفیت جدا، قد آدم آب مصفا، فواروں سے کیوڑہ گلاب اچھلتا، بازار ہلک رہا۔ ہر طرف دھوم دھام خلقت کا اثر دہا، چلنے پھرنے والوں کے کپڑے لٹے ہوئے جاتے تھے۔ وہم و گمان کشمکش سے بار پاتے تھے۔

جان عالم قدرت حق دیکھتا جاتا تھا، ہوش برجا نہ آتا تھا، دل سے کہتا تھا۔
 اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کیا ملک، کیا سلطنت، کیا شہر کیا بازار ہے۔
 کیا بیوپاری ہیں کیسا کیسا خریدار ہے۔ ہر شخص کو آرام و راحت ہے، کیا بندوبست با انتظام ہے۔ کیا حکومت ہے! جب چوک میں آیا پوچھا "ایوانِ جہاں پناہ دولت سرائے شاہ کی کدھر ہے؟"

لوگوں نے کہا "دستِ راست سیدھے چلے جائیے۔"

بازار طے کر قریب عمارات بادشاہی جب آیا، ان مکانوں کو نرا طلسم پایا۔ عقل کام نہ کرتی تھی، ہر گنگرہ ایوانِ فلک سے اونچا، برج ہر ایک جہاں نما خورشید

ساچکتا، لیکن جو لوگ درباری یا ملازم سرکاری آتے جاتے دیکھے، سب سیاہ پوش،
خمخانہ الم کے جرعہ نوش، اس کا ماتھا ٹھنکا، پاؤں ہر ایک کئی من کا ہو گیا، ہر
شخص کا منہ تکتا تھا، قدم اٹھ نہ سکتا تھا، کہتا تھا خدا خیر کرے، تنگن بد ہے،
دل کو بیقاری از حد ہے، چند قدم اور بڑھا، سواری کا سامان سامنے آیا۔ ”بھڑھائی“
کا شور بلند پایا، دیکھا ایک خواجہ سرا پانا، زیرک و دانا محبوب علی خاں نام، نواب
ناظر سراپدہ شاہی، باحترام۔ وہ بھی باخاطر حزن، غمگین، سیاہ پوش، حواس باختہ
ہوش فراموش اندوہ یاد، رنج سے ہم آغوش۔

جان عالم نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر شاہزادے کو دیکھنے لگا، حیران و
ششدر، متحیر سا اور روکے کہا ”سبحان اللہ و بحمدہ کیا تیری قدرت کی شان ہے،
جنس بشر میں کس طرح کا پری پیکر خلق کیا ہے کہ چشم کو تاب جمال، زبان کو صفت
کی مجال نہیں“ نہایت متوجہ ہو کر پوچھا کہ ”اے شمشاد نورستہ چمن جہان بانی و سرور و خیز
بوستان سلطنت و حکمرانی، حضور کہاں سے رونق بخش اس شہر نحوست اثر کے ہوئے؟“

شاہزادے نے کہا ”میاں صاحب خیر ہے، ہم فقط اس شہر اور یہاں کے شہریاء
کے شوق دید میں وطن سے بعید ہو، خستہ و خراب، بادل مضطرب و جان بیتاب یہاں
پہنچے ہیں، برائے خدا یہاں کی نحوست، اپنی سیاہ پوشی کی علت بیان کیجئے۔“

خواجہ سرانے یہ سن کر لغز مارا، بے چین ہو کر پکارا کہ ”اے جوان رعنا! تو نے
یہ قصہ سنا ہوگا، زینت تحت سلطنت، رونق شہر موجد آبادی، صاحب جاہ و شہرت،
مالک عفت و عصمت، انجن آرا یہاں کی شاہزادی تھی، شہرہ جمال، بنیال، اس حد
طلعت، پری خصال کا، از شرق تا غرب، اور جنوب سے شمال تک زبان زد خلق خدا
تھا اور ایک جہان حسن کا بیان سن کر، نادیدہ اس کا مبتلا تھا، آج تک چشم و گوش
چرخ کج رفتار نے بایں گردش لیل و نہار، ایسی صورت دیکھی نہ سنی، بہت سے
شاہ اور شہریاء اس کے وادی طلب میں قدم رکھ کر، تھوڑے عرصہ میں آوارہ دشت
ادبار، پتھروں سے سر مار مار رہو اقلیم عدم ہو گئے“

اب چار پانچ روز سے ہمارے طالع بیدار جاگتے جاگتے، دفعۃً سو گئے۔ ایک ساجر
مکار، جفاکار، بزور سحر اسے محل سے اٹھالے گیا۔ ہنوز یہ جملہ غم ناتمام تھا کہ جان عالم

کا کام تمام ہوا، آہ سرد کھینچ کر بجال خستہ و پریشان، مثالِ قالبِ بیجان، زمین پر گر کے عبسرت و یاس پکارا۔ شر

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی
اے گردون جفا پرداز، واسے فلکِ عربہ جو یہ کیا تیری خو ہے، اتنی دور لا کر
نا کام رکھا، مولف ۵

عشرت کدے جہاں میں ہوئے سیکڑوں دے اک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم سرا رہا
تاثر آہ دیکھی نہ گریے میں کچھ اثر ناحق میں اس امید پہ کرتا بکا رہا
کیا دیکھتا ہے سینے کو میرے تو اسے سرور مجز یاد یار اس میں نہیں دوسرا رہا
شر حسن ۵

یہ کہہ کر وہ اس طرح غش کر گیا کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا
خواجہ سراسخت گھبرا یا، سمجھا یہ شخص بھی گرفتار محبت، اسیر دامِ الفت، اسی کا
ہے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، دفعۃً خبر بد سنانی نہ تھی، آفت اس کی جان پر جان کر
لانی نہ تھی، ہر چند گلاب کیوڑہ چھڑکا، ہوش نہ آیا، بدحواس بادشاہ کے حضور میں
حاضر ہوا، رو کر عرض کی، آج ماتم انجمن آرا تازہ ہوا، بادشاہ نے فرمایا "کیا
ماجر ہے؟"

اس نے عرض کی کہ "کسی ملک کا شاہزادہ، اس کی محبت میں سلطنت سے
ہاتھ اٹھا، فقیرانہ سبب دھج بنا، یہاں تک پہنچا ہے، مجھ سے جادوگر کے اٹھانے جانے
کی خبر سن کر آہ کھینچ، زمین پر گر رہا ہے، اب تک ہوش نہیں آیا تھا، عجیب صدمہ
دل پر دھڑکیا ہے، خدا جانے جیتا ہے یا مر گیا ہے، کیا عرض کروں۔ غلام کی نظر سے
اس سبب دھج کا۔ جوان، پری پیکر آج تک از قسم بشر نہیں گزرا، اگر ان دونوں
کی صورت آئینہ چشم میں بہم نظر آتی، قرآن السعدین کی کیفیت کھل جاتی، جو حضور
ملاحظہ فرمائیں گے، شہزادی کو بھول جائیں گے۔"

بیکہ بادشاہ غم مفارقت انجمن آرا سے بقرار رکھا، ارکانِ سلطنت سے کہا
جلد جاد جس طرح ہو، اسے لاؤ۔"

لوگ دوڑے دوڑے کی صورت اٹھائے گئے، اس عرصہ میں شام ہوئی،

بادشاہ نے ہاتھ منہ دھلوا، بید مشک چھڑکا، کیوڑہ منہ میں چھایا، نخلہ نگھایا۔ جان عالم کو ہوش آیا، گھبرا کر اٹھ بیٹھا، دیکھا ایک شخص تاج خسروانہ بر سر، چار قبہ ملوکانہ در سن رسیدہ، یل و نہار دیدہ، بڑے کرد فرسے تخت پر جلوہ گر ہے اور چار ہزار غلام زریں کمر با شمشیر و خنجر اوچی بنا دست بستہ رو برد کھڑا ہے، گرد امیر وزیر، سپہ سالار، پہلوان، گردن کش ہر ایک اپنے اپنے قرینے سے زیب دہ کرسی و ذنگل ہے، تہمتوں کا جنگل ہے۔

جان عالم اٹھا، بطور شاہ و شہر یار و شہزاد ہائے عالی تبار یکم سلام بجالایا۔ بادشاہ نے گلے لگا پاس بٹھایا۔ جب سے بادشاہ کی نظر پڑی تھی، محو حسن و لہریب، مفتون چہرہ مردش و صورت پر زیب ہو گیا تھا اور حضار مجلس بھی سب ڈنگ تھے، سکتے کے ڈنگ تھے، سب کو صدمہ تازہ یہ ہوا کہ ایسا وارث تاج و تخت ہاتھ آئے اور محروم رہ جائے، اس وقت کا رنج و قلق، شہزادے کا کوئی فراق کشیدہ سمجھے، بقول مرزا حسین بیگ صاحب شہرے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رویئے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
مگر باعث شرم و حیا کہ لازمہ شرفا و نجبا ہے، خاموش، سینے میں غم کا جوش و خروش۔ بادشاہ نے استفسار وطن اور تام جد و آبا کیا۔ یہاں فرط الم کثرت غم سے کلا گھٹ رہا تھا، مگر ضبط کو کام کر کے حسب و نسب اور ملک کا پتہ بتایا۔ پھر سر جھکا، شہزادی کا حال پوچھا، بادشاہ نے فرمایا ”اے گرامی اختر، پہر شہر ماری! مدت سے ایک جادوگر اس فکر میں تھا، یہاں بمرتہ نگہبانی ہوتی تھی، لیکن وہ کافر دھوکا دے کرے گیا، آج تک محل میں نہیں گیا ہوں، وہ محل جو عشرت کدہ خاص تھا، ماتم سرے عام ہے، ہر سو، شور رقت ہر سمت نالہ پر آفت بلند ہے، کھانا پانی حرام، پھوٹا بڑا مبتلائے آلام ہے۔“

جان عالم نے کہا ”کچھ یہ بھی ثابت ہوا کہ کدھرے گیا۔“

بادشاہ نے فرمایا ”پانچ کوس تک پتہ ملتا ہے، آگے قلعہ ہے، سرفیلک کیندہ، آگ سب بھری ہے، شعلہ سرگرم تا چرخ چنبری ہے اور انکاروں کا انبار، تاکرہ نا ہے، دہاں کا حال نہیں کھلتا، عقل بیکار ہے، مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سحر کا کارخانہ ہے۔“

شہزادے نے کہا "خیر اگر حیات مستعار باقی ہے بہ مدد ایزد کہاں جانے پاتا ہے۔" یہ کہہ کر اٹھا کہ "قبلہ خدا حافظ۔"

بادشاہ لیٹ گیا کہا "بابا خدا کے واسطے اس خیالِ محال سے زرِ گذر، طائرِ خیال کے اُس دشت میں پر جلتے ہیں، پیک صبا کے پاؤں میں چھلنے بھٹکتے ہیں دوسرے مجھے مفارقت تیری کب گوارا ہے، ایک کو دھوکے میں کھویا، تجھے دیدہ و دانستہ جلنے دینے کا کہاں یارا ہے، ایسی آفت میں تجھ سے جوان کو جلنے دوں، بڑھاپے میں بدنامی لوں۔ سلطنت حاضر ہے، بسم اللہ حکمرانی کر۔ میں ضعیف ہوں، گوشے میں بیٹھ کر، اللہ اللہ کروں۔"

شہزادے نے عرض کی "یہ تخت و سلطنت حضور کو مبارک رہے، بندہ آوار خانمان، ننگِ خاندان، گھر کی حکومت و ثروت چھوڑ، عزیزوں سے منہ موڑ، خراب و خستہ سرگداں، در در حیران و پریشان ہو، یہاں تک پہنچا، اب یہ کلمہ تنگ اور ذلت کا سننے کو جیتا رہوں، ملک بیگانے میں بادشاہت کر دوں، لوگ کہیں جادوگر تو شہزادی کو لے گیا، یہ شخص بے غیرت تھا، جیتا رہا، سلطنت کرنے لگا، جو امزدی سے بعید ہے، عاشق کو معشوق کی راہ میں جان دینا عید ہے۔ لا اعلم تا سرند ہم پانکشم از سر کولیش نامردی و مردی قدم فاصلہ دارد

پگ آگے پت رہے، اور پگ پاچھے پت جائے قدم عشق پیشتر بہتر۔ جس مددگار نے ہزار بلا سے بچا کر، یہاں تک زندہ و سالم پہنچایا ہے، وہی دل سے بھی، مظفر و منصور آپ سے ملائے گا، نہیں تو یہ صورتِ بخش لوگوں کو دکھانی کیا ضرور ہے، گو بشر مجبور ہے، لیکن اس زسیت سے آدمی مرنا گوارا کرے بے موت مرے، پہلے جب عقل و عشق سے معرکہ اٹکا تھا، میرا دل کھٹکا تھا، عقل کہتی تھی 'ماں باپ کی مفارقت اختیار نہ کرو، سلطنت سی شے نہ چھوڑو، عشق کہتا تھا 'ماں باپ کس کے، بادشاہت کیسی، سرِ شستہ آفت غیر توڑو، کوچہ و بازار کی گدائی، سلطنت ہفت اقلیم ہے، اگر میسر آئے، بے یار خدا کسی کی صورت نہ دکھائے، عقل کہتی تھی 'آبرو کا پاس کرو، ننگِ خاندان نہ ہو، غریب الوطنی سے عار کرو، صحرا نوردی نہ اختیار کرو، عشق کہتا تھا 'یار کے ملنے میں غرت ہے،

بادیہ پیمائی میں بہا رہے، تشنہ خونِ آبلہ پا، مدت سے صحرا کا خار ہے، عقل
 کہتی تھی یہ لباس شامی، قبائے فرما زوائی چاک نہیں کرتے، دانش مند جاؤ رکتی
 سے خلافت قدم نہیں دھرتے، عشق کہتا تھا 'لباس عریانی ہے، عقل دیوانی ہے
 یہ وہ جامہ ہے، جسے احتیاجِ شست و شو نہیں، کیسی ہی ہاتھ پائی ہو، چاک نہ
 ہو، کسی آلائش سے ناپاک نہ ہو، اصلاً کارِ سوزن و رفو نہیں نہ بار برداری اس کو
 چاہئے، نہ چور کا ڈر، نہ لاہزن سے خطر ہے، پانی سے بھیکے، نہ آگ سے جلے، سڑے
 نہ گلے، گلے سے کبھی جدا نہ ہو، نہ کوئی اس کو لے سکے، نہ خود کسی کو دے سکے،
 نہ دشتِ وحشت میں اس کا تار آئے، نہ اس کے دامن تک سر خار آئے، نہ اس کا
 جسم لاغر پر بوجھ نہ بار ہے، مسافر صحرائے محبت کو یہی درکار ہے۔ آتش ہے

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا تہیں سیدھا الٹا
 آخر کار بصدِ تکرار عقل کو شکست فاش ہوئی، کوچہ دلبر کی تلاش ہوئی، نام
 سے نفرت، تنگ سے تنگ ہو، نشان مٹایا سلسلہ دیوانگی ہاتھ آیا، طبیعت عشق
 کی محکوم ہوئی، وحشت کی دھوم ہوئی، دامنِ غیرت گریبانِ حیا چاک ہوا، ننگ و
 ناموس کا قصہ بکھیرا، پاک ہوا، ایک پرندہ کہ توتا تھا، رہبر و مددگار ہوا، دوسرا
 بوندہ وہ وزیر زادہ تھا، تنہائی میں غمگسار ہوا، پھر تو سلطنت اور وطن چھوڑ، عزیز
 یگانوں سے رشتہ محبت توڑ، رہ نورد بادیہ حرمان و گام فرسائے دشتِ ادبار ہوا، لیکن
 ان کا ساتھ بھی نہ سزاوار ہوا، پہلی بسم اللہ یہ غلط ہوئی کہ توتا اڑ گیا، وزیر زادہ
 ہرن کے ملنے سے چھٹ گیا، وہ جو اس ظاہر کی، دل لگی کا تھا لٹ گیا، تنہائی
 ہمراہ ہوئی۔ ممد دم گرم سرد آہ ہوئی، کچھ دنوں کے بعد طلسم میں پھنسا یا، ہمیں لاکر
 دشمنوں کو ہنسایا، تھوڑی سی آفت اٹھا کے رہائی پائی، سمتِ مطلوب کی راہ ہاتھ
 آئی، مگر نہ سببِ نشان دیکھا، نہ میل نظر آیا، نہ گردِ کارواں دیکھی، نہ صدا سے
 زنگ و جرس سنی نہ راہبر ملا۔ نہ کفیل نظر آیا، سولاری چھٹی پیادہ پائی ملی، فکرِ غیر
 سے رہائی ملی، جب اس منزل میں حضرت عشق نے آزمایا، باوجود آبلہ پائی اور
 خلشِ خارِ صحرانیت قدم پایا، دوسرے مرحلے میں امتحانِ مد نظر ہوا، پیوں کے
 اکھاڑے میں گذر ہوا، ایک مہ سیمہ کو اس جانب میلان ہوا، پھر وہی عیش و

نشاط کا سامان ہوا، بہت سے نیرنگ دکھائے، ہر شب عجب دن آگے آئے، شہ لکھنؤ
 شیشہ عصمت سنگ ہوا دہوس سے سالم رہا، وحشت دل کا بدستور عالم رہا، رخصت
 میں مصلحت جانی، جوان و پیر کی بات نہ مانی، اب گھر پہنچ کر دھوکا کھانا جان
 بوجھ کر بھول جانا، کس ملت میں روا ہے، یہ زرا دوسو ہے، مجھ سے وحشی بھودے،
 ایسی ہوشیاری دور ہے، جیتے جی گم منظور ہے۔“

اس گفتگو کی خبر محل میں پہنچی، کہ آج اس طرح کا مہ جبین حسین انجن آرا
 کا عاشق وارد ہوا تھا، وہ بھی حرارتِ محبت سے اُسی آگ میں جلنے جاتا ہے۔
 انجن آرا کی ماں درِ دولت سرا پر چلی آئی، خواجہ سرا دوڑے بادشاہ سے عرض کی،
 ”جلد شہزادے کو لے کر محل میں رونق فرما ہو جائے۔“

بادشاہ جان عالم کو ہمراہ لے، آرام گاہ میں تشریف لایا۔ وہ بھی ہزار جان
 سے نثار ہو، دیر تک پردانہ دار، اس شمع انجن سلطنت کے گرد پھری، رنڈیوں نے
 گھیر لیا، سب کو قلق ہوا۔

غرض کہ بہ ہزار سعی بادشاہ نے بہشت صبح کی رخصت پر، اس شب روکا، پر
 بجے خاصہ طلب ہوا۔ شہزادے نے انکار کیا، وہی نواب ناظر حاضر تھا، پاؤں پر
 گرا، سمجھایا ”پیر و مرشد کئی دن سے محل میں کھانا پانی سب کو حرام ہے، جو آپ
 کچھ بھی نوش فرمائیں گے تو یہ سب کھائیں گے۔“

ناچار باخاطر نگار، دو چار نوالے، پانی کے گھونٹ سے حلق میں اتارے پھر
 ہاتھ منہ دھو، نیند کا بہانہ کر، پنگ پر جا لیٹا، مگر نیند کس کی اور سونا کیسا۔ بولتے
 وا در دیدہ سدا رہتا ہے تیری یاد میں آنکھ جب سے لگ گئی روتے ہیں سو جانے کو ہم
 پھر بیٹھے بیٹھے انجن آرا کا تصور کر، دم گرم آہ سرد سینے سے بھر کر یہ پڑھنے لگا۔ ایسا

تجہ بن ہے خراب زندگانی ہے مجھ کو عذاب زندگانی
 اتنا تو نہ چھپ کے کفن کا گھبرا کے نقاب زندگانی

جب کروٹیں بدلتے پسلیاں دکھ جاتیں اور بیقراریاں ستائیں تو دل بیتاب
 مستعد ضبط، آمادہ جبر و صبر کر یہ کہتا بولتا ہے
 کمال ضبط کو عاشق کرے اگر پیدا کہاں کی آہ کرے بات بھی اثر پیدا

ہزار رنگ زلمے نے بدے پراسوس
 کہیں ہوئی نہ شب ہجر کی سحر پیدا
 کرے گی مہسری نالے کی میرے تو بلبل
 شعور اتنا تو کر جا کے جانور پیدا
 ہمیشہ ہاتھوں سے ان کے رہا ہوں میں جلتا
 یہ دل میں نوق اسیری ہے جو قفس میں مام
 آخرش بعد نالہ و آہ، کراہ کراہ، صبح کی بعد فراغ نماز پر سوز و گداز مرنے
 پر کمر باندھی، شب کو یہ خبر عام ہوئی تھی کہ کل جادوگر کی لڑائی کو شہزادہ آمادہ
 ہو جائے گا، پہررات رہے سے مجمع عام در دیوان خاص پر تھا، یکایک بادشاہ
 تخت پر سوار، برابر شہزادہ والا تبار برآمد ہوا، چشم مشتاقان میں نور طور نزدیک
 و دور، تجلی کر گیا، ہر شخص رو یہ قبلہ ہو، دعلے فتح و ظفر اس ماہ پیکر کی مانگتے
 لگا۔ القہ جہاں تک لوگ آتے جاتے تھے، بادشاہ ساتھ آیا، آگے بڑھنے کی
 تاب نہ لایا۔ جان عام نے متیں دے کر رخصت کیا۔ ناچار بادل داغدار و خاطر
 فگار قلعہ میں داخل ہوا۔ مگر وہاں سے ڈیوڑھی تک صدمہ ہر کارہ، صبادم متین
 کیا، کہ ہر دم کی خبر حضور میں پہنچے، جان عالم پھر اکیلا با حسرت و یاس رہا،
 غم دبیر رفیق قدیم پاس رہا، یہ شعر پڑھتا آگے چلا مصحفی سے

اے غم یار میں بندہ ہوں رفاقت کا تری
 نہ کیا تو نے گوارا مری تنہائی کو
 آگ کا قلعہ سامنے تھا، آسمان سے زمین تک بجڑ شعلہ جوالہ یا انگاروں
 کا ڈھیر، اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہزادہ غور سے دیکھنے لگا۔ ایک ہرن اُس آگ
 سے نکلا، اُچھل کود کر پھر اس میں غائب ہوا، جب مکرر آمد و رفت کی جان عالم
 نے لوح پیر کی دیکھی، اس میں معلوم ہوا کہ اگر یہ اسم پڑھ کر، ہرن کو تیر مارا اور
 خٹانہ کی، طلسم ٹوٹ جائے گا وگر نشانہ چوکا، خود آماجگاہ خدنگ قضا ہوا، کوئی
 راکھ کے سوا پتہ نہ پائے گا۔

شہزادے نے کہا "جو ہرن مارا تو لطفِ زندگی ہے، نہیں جیلہ مرگ خوب
 ہے، بے یار جینا میوب ہے۔" یہ سوچ لبِ سوفار چلے سے جوڑ، شست و
 مشست برابر کر، اسم شروع کیا۔ ادھر ہرن نکلا، ادھر تیر کمان سے سرگوشی کر کے
 چلا بسکہ یہ قدر انداز تھا، اس کی قضا دامن گیر، تیر دوسرا ہوا۔ فردوسی طر

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

ہر زمین پر گرا، آسمان سے دار و گیر کا غل اٹھا، ہاں ہاں لیمبو، گھیر لو،
جانے نہ پائے، قریب تھا خوف سے جی نکل جلے، زمانہ تیرہ وتار، صحرا پر غبار ہوا
گھڑی بھر میں وہ تاریکی دور ہوئی، آفتاب نمودار ہوا، نہ آگ رہی، نہ قلعہ برابر سطح میدان
انسان نہ حیوان، مگر چوتھے پر لاش بھلسی ہوئی پاش پاش دیکھی یعنی وہ جادوگر،
کرہیم منظر، سیندور کا ٹیکہ، ماتھے پر زرد زرد دانت، ہونٹوں کے باہر منہ مہری سے گندہ
شیطان کا بندہ، بالوں کی لٹیں لٹکی، ہڈیاں، کھوپڑیاں، گلے میں پڑیں، کالا بھجنکا، بدن سے
ننگا، تیرے پچھ کر جہنم داخل، وہ حواصل ہو گیا ہے۔ شکر کا سجدہ بجالایا، قدم بہت
آگے بڑھایا، ہر کار سے یہ ماجرا دیکھ، فوراً حضور میں حاضر ہوئے، بعد دعا و ثنا
عرض کی کہ ”اے شہریار ذوی الاقتدار! فتح مبارک، شہزادہ بلا کا پتلا ہے، ایک تیر
میں وہ آگ کا قلعہ ٹھنڈا کر، سرگرم راہ ہوا۔“

بادشاہ مزید فرحت افزا سن کر خوش ہوا، فرمایا ”یقین کا مل ہے کہ جاننا“
حسب درخواست مراجعت کرے گا، فتح و فیروزی شامل ہے، ہونہار بردے کے چکنے چکنے
پات، خبرداروں کو خلعت و انعام، موافق قدر و منزلت، مرحمت کر، پھر روانہ کیا۔
اس عرصے میں شہزادہ وہ دادی پڑ خط، میدان سراسر ضرر کوٹے کر متصل قلعہ
ساحر، جہاں انجن آرا قید تھی، پہونچا۔ وہ عجیب معلق قلعہ تھا۔ زمین سے چار پانچ گز
بلند، ایک تختہ کھار کے چاک کی طرح بائیں سرعت، گردش میں تھا کہ نگاہ کام نہ کرتی
تھی، آنکھ کی پتلی اتنا جلد نہ پھرتی تھی، بلند ایسا کہ دیکھنے میں پگڑی گرتی تھی۔
جان عالم وہاں کھڑا، وہ قلعہ بھی حرکت سے ساکت ہوا۔ اس وقت مفصل نقشہ
معلوم ہوا کہ قلعہ ہے، جواہر نگار، بازیب و زینت بسیار، دروازے چار ہیں، برج
گئے نہیں جاتے، ہزار در ہزار ہیں، کسب فکر اس کی بلندی کے روبرو کوتاہ ہے، ہر طرف
سے مسدود راہ ہے۔ جہاں جہاں عالم کھڑا تھا، زمر کا بنگلہ نظر آیا، اس میں سے آواز
آئی کہ ”اے اجل رسیدہ، کیوں ملک الموت کو پھیرتا ہے، زندگی سے منہ پھیرتا ہے“
مجھے تیرے حسن و صورت پر رحم آتا ہے، جلد یہاں سے جا خطائے اول، عوض خوبی
شکل و شمائل، معاف کی، دگر نہ بایں شدائد و خواری قتل کروں گا کہ آسمان تیرے

حال پریشان پر خون رومے گا، ساکنانِ زمین کو گوشت پوست ہڈیوں کا پتہ نہ ملے گا، بادشاہ تیرے غم میں جاں کھوئے گا، اس دشت کی خاک تیرے لمبے رنگین ہوئے گی، روم بھی تباہِ خواب مرگ میں آرام سے نہ سوئے گی۔“

شہزادے نے ہنس کر کہا کہ ”اے مادرِ بختا، تو کیا ہماری خطا معاف کرے گا کہاں تک لاف و گزاف کا دم بھرے گا، انشاء اللہ تعالیٰ اور تو کیا کہوں، تجھے بھی اس کے پائنتی بھیجتا ہوں۔“

یہ سن کر وہ جھلایا نیگلے سے سر نکال، تھوڑے ماش اس بد معاش نے اور کالا دانا نکالا، اس وقت چرخ چکر میں آیا اور زمین تھرائی، جب سرسوں میں بنوے اور رائی ملائی پھرتی مینا اور لونا چاری کو پکارا۔ ان دانوں کو اس احمق نے آسمان کی طرف پھینک مارا، دفعتاً ابریرہ و تار گھر آیا، شہزادے پر پتھر اور آگ کا سینہ برسایا یہ بھی اسمائے رز سحر پڑھتا تھا، آگے بڑھتا تھا، جب آگ قریب آتی پانی ہو کر بہہ جاتی، اور پتھر بھی ہر ایک خاک تھا، ایسا وہ اسم پاک تھا۔ جادوگر خضعت ہو کر سحر تازہ کی فکر میں تھا، جانِ عالم نے لوح کو دیکھا، اس میں نکلا ”کسی طرح لوح کو قلعہ کی دیوار سے لگا دے، پھر قدرت خالق کا تماشا دیکھ لے۔“ شہزادے نے بجزات تمام تراچک کر لوح دیوار سے لگائی۔ اُس پر آفت آئی، مرتبہ اول سے زیادہ چکر میں آیا۔ پھرتے پھرتے اس طرح کی صدائے ہیئت ناک آئی کہ ہزار توپیں ایک بار چھٹیں، تو ایسی ہنو۔ بدھڑ مہیب تھی، کہ گاؤ زمین کا کلیجہ ہل گیا، خورشید برجِ اسد میں چھپ کر دہل گیا زمانہ کا رنگ دگرگوں ہوا، جنگل گرد برد ہو گیا، وہ ناری سرد ہو گیا، لڑوں کو وہ دہاؤں ہوا، میدان سیاہ، بلند صدائے نالہ و آہ ہوئی۔ چار گھڑی میں وہ تاریکی دور ہوئی، شہزادے کی طبیعت سرور ہوئی نہ قلعہ نظر آیا نہ مکانات کا نشان پایا۔ لیکن ریت کا ٹیلہ سرکندہ گرہے، اور کچا سوت نیلا پیلا، ان پر لپٹا، کچھ پھندے پڑے، اس میں وہ ماہِ شب چارہ، حور کی صورت، نور کا عالم، پریشان بدحواس، سراسیمہ متحیر کوئی آس نہ پاس ہر سمت حیران ہو ہو دیکھ رہی تھی، جانِ عالم نے پہچانا۔ تاب نہ رہی، جی سینے میں رعبِ محبت سے سختایا، اکیلا دیکھ کے کلیجہ منہ کو آیا، ہر چند ضبط کیا، نہ ہو سکا تھراتا، دم چڑھا جاتا، دھڑک دھڑک پھرنے لگا، لڑکھڑاہٹ سے کرنے لگا۔

انجن آرانے شرما کر سر جھکا کر کہا "سبتھلو صاحب، کچھ پاس لحاظ بھی کسی کا نہیں، یوں بیباکانہ پاس چلے آنا، حرکت مجنونا نہ ہے، لوگ کہیں گے دیوانہ ہے۔" مگر اس گفتگو میں آنکھ بھی چار ہو گئی۔ سان الفت ادھر تو گڑی تھی، ادھر بھی دوسرا ہو گئی۔ شہزادہ خنجر عشق کا زخمی قدیم تھا، وہ تازہ شمشیر محبت کی گھائل ہوئی، طبیعت ادھر مائل ہوئی، بدن تھرا آیا۔ جان عالم نے یہ سنایا۔ میر سورا

جس کو نہ ہو شکیب نہ تابِ بغاں رہے تیری گلی میں وہ نہ رہے تو کہاں رہے
آہستہ رو تو منزل مقصود کو گئے زقار گرم تھے سو ہمیں دریاں رہے
بندہ نواز حال پہ میرے کرد نگاہ ہے جائے گریہ کیہ پس کارواں رہے
یہ کہہ کر گر پڑا، غش آگیا، عشق کی نیزنگیاں نہاں نہیں، حاجت اظہار و بیاں
نہیں، کشش اس کی چھوٹے بڑے پر آشکارا ہے، ہزاروں کو اس نے فریب سے مارا ہے۔
انجن آرا کو دل مضطرب نے تڑپ کر سمجھایا، بے قراری میں اس پر قرار آیا کہ
یہ مقرر عاشق صادق ہمارا ہے جو ایسی بلا سے نہ ڈرا، سر کو بیچ کر اس وادی میں
پاؤں دھرا۔ دگر نہ اتنے دن گزرے، بکیسی کے سوا کوئی ہمد شریک زندان غم نہ تھا،
دل قبضہ اختیار سے جاتا رہا، حجاب ہر چند مانع آتا رہا، مگر جان عالم کا سر، سر کا زانو
پر رکھا، چہرے کی گرد جھاڑی، غشی تو کبھی آنکھ سے دیکھی نہ تھی، گھبرا کر رونے لگی، اس
طرح روئے یار دھوئے لگی، اور یہاں جو بوند آنسو کی، منہ پر پڑی اور دماغ میں خوشبوئے
کنار دلدار چڑھی، نخلنے کا کام کر گئی، گلاب کیوڑہ چھڑکنے کی حاجت نہ رہی، آنکھ کھول
دی، بسمان اللہ سر خاک افتادہ، کنارِ یار زانوئے دلدار پر پایا، ناز و نیاز نے دماغ
عرش اعلیٰ پر پہنچایا، اور پاؤں پھیلایا، یہ اترا یا، انجن آرانے جھپٹ کر گھٹنا سرکایا۔
جان عالم نے چشم نیم وا سے شہزادی کا منہ دیکھا اور کہا "ہماری بے ہوشی ہشیاری
سے اچھی تھی۔ مولف

میں جو چوکا تو وہ بھی چونک پڑا ہوئی غفلت جو ہوشیار ہوا
یہ کہہ کے آنکھیں بند کر لیں کہ "پھر میں غش آیا، کیوں تم نے زانو سرکایا۔"
انجن آرانے کہا "کیا خوب، اتنا احتلاط میری چڑ ہے۔ میں نے تیری محنت و
مشقت پر منتظر کر کے، یہ السانیت کی حرکت کی تھی، تم چل نکلے، خدا جانے دل میں

کیا سمجھے، اپنی راہ لیجئے، چلتا دھندا کیجئے، واہ دانیکی برباد، گنہ لازم۔

جان عالم نے جواب دیا۔ استاد سے

خاک ہی اپنی اٹھے تو اس مکان سے اٹھ سکے ہم جہاں جوں نقش پا بیٹھے نہ واں سے اٹھ سکے
الا چور کی داڑھی میں تنکا میں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا، نہ معشوقوں کے
دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا۔“

انجن آرانے کہا ”چہ خوش بختا دل تو ہلا لو، کچھ ہو یا نہ ہو، زبان کا مزہ نکالو،
یہ تو وہی مثل ہوئی۔ مان نہ مان میں تیرا ہمان، تمھارا بعینہ حال یہ ہے۔ فرد سے
چہ خوش گفتست سعدی در زلیخا الایا الیہا الساقی ادرکاساً وناولہا
عشق و عاشقی کی باتیں، میری بلا جاتے، رمز و کنایہ کسی اور سے جا کر کرو، اپنا
چو چلا تہ کر رکھو، اپنی صورت تو غور سے دیکھو، تم نے سنا نہیں شاید۔ مثل۔ حلوہ
خوردن دا روئے باید۔“

جان عالم نے کہا ”میں بیچارہ خستہ تن، غربت زدہ، دور از وطن، ہمت پن کہا
سے لاؤں، کیوں کروسی صورت بناؤں، ایک ہنستا ہے، ایک روتا ہے، کفر و اسلام میں
بڑا فرق ہوتا ہے، تمھیں ابھی تک موہن بھوگ کا ذائقہ نہیں بھولا ہے۔ دم تقریر
زبان پر حلوا ہے، ہم نے آپ کے واسطے جوگ لیا، سلطنت کو بیج دیا، اب مراد
پوری ہوئی، دور ندری ہوئی۔“

انجن آراپتے کی سن کر، کھسیانی ہو گئی، کہا ”چلو صاحب وہ مو اقران کیا تھا،
اپنی پیونج بند کرو، کٹی جلی کی ہنسی، اپنے گھر جا کر کرو، سحر و جادو زور و ظلم، مکرو فریب
سے انسان ناچار ہے، اس میں کسی کا کیا اختیار ہے، مگر خیر اور جو چاہیے کہہ لیجئے،
در پردہ کیا، صاف صاف گالیاں دیجئے، یہ باتیں قسمت کی گردش سنو اتی ہے، دیکھوں
ابھی تقدیر آگے کیا کیا دکھاتی ہے، اگر خدا ہمارا گھر بار چھڑا، موذی کے بس میں نہ پھیناتا،
تو ہر ایک راہ چلتا ہمیں کاہے کو ایسی باتیں سناتا۔“

جان عالم یہ سن کر ڈر گیا، رنگ زرد ہو گیا، خجالت سے مر گیا، ہم کر آبدیدہ ہو کہنے لگا
”میری کیا مجال، جو آپ کو کچھ کہوں، میں تو خانماں آوارہ مسافر ہوں، انصاف تو کرو تم کتنی
ہٹ دھرم، احسان فراموش ہو، ہنسی میں رو دیا، ہمیں دونوں جہان سے کھو دیا۔“

انجن آرا نے دیکھا، اس کے آنسو جاری، ہچکی طاری ہے، مسکرا کر کہا، ایک بات مطلب کی کہی مگر ۵

سچ ہے اوچھے کا بھی احسان ہوتا ہے
خاطر جمع رکھ، اپنے گھر چل کر، تجھے مال و زر سے لادوں گی کہ تو چل نہ سکے گا،
بوجھ سے ہل نہ سکے گا۔

شہزادے نے کہا "آخر سلطنت کا گھمنڈ آیا، ہمیں محتاج جان کے یہ فقرہ سنایا،
ہم بھی کبھی حاجت روائے عالم مشہور تھے، مگر الفت سے مجبور تھے، اگر تم پر عاشق نہ
ہوتے کیوں سلطنت کھوتے، سر پر ہاتھ رکھ کر روتے۔"

یہاں تو یہ نوک چوک، پھیر چھاڑ ہو رہی تھی، وہاں خبر فتح و ظفر، ہر کاروں نے
بادشاہ کو پہونچائی، وہ تو ہمہ تن گوش تھا، اس وقت مع ارکانِ دولت روانہ ہوا ایک
سکھپال ہمراہ لیا، صبا وار سنائے میں آہنچا، جو جو نزدیک تھے، دور کھڑے رہے،
کہا ریاں بادشاہ کا تخت قریب لائیں۔ انجن آرا منہ چھپا کر بیٹھ گئی، جاں عالم پاس سے
سرکا، بادشاہ تخت سے اُترا، جاں عالم کو گلے لگایا۔ جرأت کی تعریف کی، ہمت پر تحسین و
آفریں کہی۔ پھر بیٹی کو چھاتی سے لگا۔ سکھپال میں سوار کیا، شہزادے کو برابر تخت پر بیٹھا
لیا، ترقی خواہانِ دولت، ملازمانِ قدیم نزدیک آئے، زبرِ سرخ و سفید، تخت اور سکھپال
پر نثار کیا، اس قدر اشرافی روپیہ تصدق ہوا کہ آج تک جو محتاج مسافر ادھر جاتے ہیں،
چاندی سونا پاتے ہیں، نصیب جاگ جلتے ہیں۔

پھرتے پھرتے بادشاہ کے جلوس، سواری، نوبت و نشان، فوج سب سامان آہنچا۔
اہل شہر یہ خبر سن کر، ہزاروں دوڑے، شادیانے بجاتے، مبارک سلامت کا غل مچاتے، شہر
میں داخل ہوئے۔ ملک کی رونق گئی ہوئی پھر آئی، خلقت نے جان تازہ پائی، محل میں
انجن آرا رونق افروز ہوئی، سب کو شادی نوروز ہوئی۔ محل والیوں نے کہرام مچایا۔

بادشاہ نے فرمایا "یہ خوشی کا وقت ہے، نہ ہنگامِ غم۔ اسی طرح سب بچھڑے خدا
کی عنایت سے باہم ہوں۔"

انجن آرا کی ماں گرد پھرتی تھی، دہم سجدہ کرنے کو زمین پر گرتی تھی، کہتی تھی ہمارے
دن اللہ نے پھیرے، مگر بدولت جاں عالم۔"

انجمن آرا جب یہ نام سنتی، خوش کیا کھل جاتی، آلا لوگوں کے سنانے کو
تجاہل عارفانہ کر کے یہ سناتی "صاحبو! کیا بار بار کہتے ہو، جو میرا مقدر سیدھا نہ ہوتا
تو وہ کون تھا، جو دن پھیرتا۔"

ہم صحبتیں مزاجدان، اس رکھائی سے تار گئیں کہ آپ کی بھی آنکھ پڑی،
طبیعت لڑی، جب اس کی ماں سر کی، وہ سب پاس آ آ کے کہنے لگیں۔ "ہے! ہے!!
ہم تو تیری مفارقت میں مرتے تھے، زندگی کے دن گھڑیاں گن گن بھرتے تھے، یہ
صورت اللہ نے دکھائی یا جان عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی، جس طرح
ہمارے مطلب دلی ملے، خالق اس کی بھی جی کی مراد دے۔"

انجمن آرا غصے کی شکل بنا، تیوری بھوں چڑھا، کہنے لگی۔ "تم سمجھو کی شامت
آئی ہے، کیا یہودہ بک بک مچائی ہے، چوچلے کی خوبی، بزرگی، خوردی سب ڈوبی،
واہ وا تم نے میری چڑھ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی بنالی، خدا جانے یہ
کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، سمجھوں نے میرا مغز کھایا ہے، اسے تو کیا کوسوں وہ
تو مسافر بیچارہ ہے، جی میں آتا ہے، اس کا منہ نوچوں، جس جس نے یہ نخر ا بگھارا
ہے اور بھی مجھے پھیر دو گی تو رو دوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی۔" یہ کہہ کر مسکرانے
لگی، ہونٹ چبانے لگی۔ آپس میں رمز و کنائے رہے تمام ملازمان بادشاہ، مع
رؤسائے ترقی خواہ نذریں لے کر حاضر ہوئے، شہر میں منادی ہوئی کہ جتنے ساکنان
قلمرو بادشاہ ہیں، فقیر سے ہفت ہزاری، بڑے آدمی سے بازاری تک آج کاروبار
موقوف کر کے ناچ دیکھیں خوشی کریں، اور جسے مقدور نہ ہو، سرکار سے لو۔

تمام شہر میں، عیش و نشاط، راگ رنگ کی مجلس با فرحت و انبساط
ہوئی، بادشاہ نے جشن جمشیدی کیا، تمام شب بادہ گلگوں کا دور رہا، ناچ گانا
صحبت بے تکلفانہ، یہ طور رہا، دم صبح بادشاہ کیواں جاہ دیوان عام میں رونق
افزا ہوا۔ اس قدر زرو جواہر، محتاج فقیروں کو عنایت و امداد ہوا کہ کاسہ گدائی
ان کا جام و صراحی سے بدل ہو گیا۔ محل میں بر محل رت جگے، صحنک جا بجا،
کونڈے، حاضری، دوئے پڑیاں، منتوں کی، جس جس نے مانی تھیں کرنے
بھرنے دینے لگیں اور ڈومٹیاں تڑاق تڑاق، پریش، خوش گلو، بانداز مع

سامان و ساز حاضر ہوئیں۔ 'مبارک سلامت، کہہ کر، شادی مبارک گانے 'پچھے،
 مچلتے، 'نئی مبارک باد سنانے لگیں۔ مولف ۵

شادی و جشن سزاوار مبارک ہووے
 صدوسی سال سلامت ہے یا امین ماں
 وہ بھی دن آئے جو سہرا بندھے سرپاں کے
 بعد شادی کے خدادے کوئی فرزند رشید
 خار کھاتے رہیں کمبخت جو دشمن ہوں سرور
 آج شہزادی کا دیدار مبارک ہووے
 حسن کی گرمی بازار مبارک ہووے
 سب خوشی سے کہیں ہر بار مبارک ہووے
 ہم کہیں آکے یہ دلدار مبارک ہووے
 دوستوں کو گل و گلزار مبارک ہووے

ترانہ بنجی عند لیب در محفل سوہروردی

و عروسی و دامادی اس مصائب کشیدہ فراق اور ہمہ تن اشتیاق یعنی
شہزادہ جان عالم کی پہلے اجازت طلب ہونا اس کا رونا پھر سامان برت کا

کدھر ہے تو اے ساقی گلزار
پلا دے کوئی ساغر لالہ رنگ
مرا غم سے دل ہو گیا خار خار
جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ
بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

سرود سرایانِ بزم شادی و نغمہ پردازانِ محفلِ عروسی و دامادی انجمن بیان میں
یوں زمزمہ سنج ہوئے ہیں کہ جلسہ عیش و طرب سے فرصت سب کو ہوئی۔ ایک روز
بادشاہِ جمہاں مجلسِ اے خاص میں جلوہ بخش تھا، بی بی سے خلوت میں فرمایا کہ "حق
اور احسان جیسے جان عالم کے ہمارے ذمہ ہمت ہیں، تمام عالم جانتا ہے اور یہ بھی
نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشقِ انجمن آرا میں نادیدہ مبتلا ہو، سلطنت کھو یاں آیا
ہے، اور کس مردانگی سے جادوگر کو مار کر اس کے پھندے سے چھڑایا ہے۔ اس کی قطع نظر
صورت، سیرت، خلق، مروت، ہمت و جرأت، یہ جتنی صفتیں ہیں سب خالق نے
عطا کی ہیں، حسبِ عالی نسب والا، حسن میں مہر و ماہ سے ترالا، مناسب کیا ضرورت
ہے کہ جلد سامان شادی درست کر، منعقد کرو۔ خدا جانے آج کیا ہے کل کیا ہو"

کار امروز ابفردا مگزار۔“

اس نے عرض کی کہ ”جورائے اقدس میں گزرا، یہی میرا عین مطلب تھا۔“
بادشاہ نے فرمایا ”آج انجن آرا سے یہ مقدمہ اظہار کر کے جواب باصواب حاصل کر لو۔ کل سے سرگرم سامان شادی ہو۔“ یہ کہہ کے بادشاہ دیوان عام میں رونق افزا ہو، انجن آرا کو ماں نے طلب کیا، اور دو چار مغلائیاں، آتوں سن رسیدہ، محلداریں، جہاں دیدہ قدیم جو تھیں، انھیں بلوایا، شہزادی کی جلیسیں بھی، یہ خبر سن کر بے بلائے آئیں، اس نے، پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا، پیار کیا، پھر کہا ”سنو پیاری دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے، کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان ہر وقت رنج کا نشان، نعت کا سامان ہے اور خدا اور رسول کا حکم بھی یہی ہے کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو، شادی کر دو، درائے ان باتوں کے ایک شخص نے تمھارے واسطے، گھر بار چھوڑا، سلطنت سے ہاتھ اٹھا، کسی آفت سے منہ نہ موڑا، جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں بھیل گیا، سرکھی او اور جان جو کھوں کی، جب تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمھاری صورت دیکھی، شکل میں پری شامل، فرخندہ خو، فرشتہ نھائل، تمام شہر عاشق زار ہے، چھوٹا بڑا اس پر فریفتہ اور شاعر ہے۔ ہر چند تم پارہ جگر، نور نظر ہو، مگر داری جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میراں میں بڑا فرق ہے، تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے، وہ مرد میدان نبرد ہے، رنڈی مرد کا بہت تفادت مشہور ہے آگاہ نادان و ذی شعور ہے۔ الا جانی! ہمارا کہنا آرسی مصحف میں نظر پڑے گا۔ دیکھئے گا جو دکھائی دے گا۔

انجن آرا نے یہ سن کر سر جھکا لیا، رونے لگی، کہا ”حضرت! صورت شکل کا مذکور یہاں کیا ضرور تھا، یہ اللہ کی قدرت ہے، کسی کو بنایا، کسی کو بگاڑا، بہت سے بوئے، نگرے، کانے کھدرے گونگے برے ہیں، وہ چاہے نہ جیئیں، کہیں نور ہے، کہیں نار ہے، گل کے پہلو میں خار ہے۔ یہ سب صنعت پروردگار ہے، دنیا میں کون سی شے بیکار ہے، بُردوں سے اچھوں کی تمیز ہے۔ یوں تو بادشاہ مصر غلام عزیز ہے، اور جو بار احسان سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کر دو تو دنیا عالم اسباب ہے، ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے، یہ شخص نہ آتا اور میرے مقدر میں رہائی ہوتی، کچھ ایسا

سامان نکل آتا اور کوئی اللہ کا دلی پیدا ہو جاتا، میری بند چھوڑ آتا المولفہ سے
 نیک و بد زمانہ نہیں اختیار میں ہوتا وہی سرور ہے جو سر نوشت ہو
 میری قسمت کجنت بُری ہے، ایک مصیبت سے چھڑا، دوسری آفت میں پھنسا،
 ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا، خدا جانے وہ
 کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ اپنے تئیں شہزادہ بنایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں، بہر صورت
 فرمانبردار، اگر کنویں میں جھونک دو، چاہے گر پڑوں، ات نہ کروں، مگر جو آپ اس کی شکل پر
 رکھیں، محنت و مشقت کو سمجھ بوجھ، یہ مقدمہ کیا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں، اگر مزدوری کی
 اجرت خدمت کا انعام منظور ہے کہ بادشاہوں کے نزدیک، احسان کسی کا اٹھانا بہت ہے،
 تو روپیہ، اشرفی، جاگیر عنایت کر دو کہ اس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔“
 یہ فقرہ سن کے وہ بہت ہنسی کہا "شاہنشاہ پچی اس کی جالفتشانی کی خوب قدر دانی
 کی، واقعی وہ بیچارہ، تمھارے ملک کا یا روپیہ پیسہ کا محتاج ہے، اری نادان وہ تو خود
 صاحبِ تخت و تاج ہے۔“

اس بات پر ہمسوں نے قہقہہ مارا، کہا "حضور! بس ان کا یہ شعور ہے، ان کے
 نزدیک وہ شہزادہ نہیں مزدور ہے۔“

انجن آرانے بھینچلا کر کہا کہ "روپیہ وہ شے ہے اور ملک وہ چیز ہے کہ اس کے واسطے
 اسفند یا رسا روئیں تن مارا گیا، فریدون و افراسیاب کا سرتارا گیا۔“
 وہ جو دانی دوا آ تو مغلانیاں پرانی پرانیاں حاضر تھیں، بولیں "قربان جائیں، واری، ما
 باپ کی عدول حکمی میں، خدا و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے، تمھیں انکار مناسب نہیں، اور خدا نخواستہ یہ کیا
 تمھاری دشمن ہیں، جو ماہ چلتے کے حوالے کسی کے کہنے سے بے دیکھے بھلے کر دیں گے۔ آدمی روز بروز
 عقل و شعور کھیتا ہے، نشیب و فراز، بات کا محل و موقع سوچتا سمجھتا ہے، تم سلامتی سے ابھی تک ہی بچنے
 کی باتیں کرتی ہو، کھیلنے کو دینے کے سوا قدم نہیں دھرتی ہو۔“

انجن آرانے جواب دیا، سرزبان پر رکھ لیا، لیکن وہ جو ایرزادیاں، اس کی ہم نشین، جلیبیں تھیں، جن سے
 اس بات کے رد و مشوے بہتے تھے، بولیں "ہے! لوگو، تمھیں کیا ہوا ہے آ تو جی صاحب، بے ادبی تھا اپنے
 دھوپ میں چوڑا سفید کیا ہے، خیر ہے صابو، دھن سے صاف صاف کھلویا چاہتی ہو، دنیا کی شرم و حیا گوری
 کیا اڑ گئی، آتا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے، جو یہ نہ مانیں گی، انھا خوشی نیم رضا، بوڑھے

بڑے کے روبرو اور کنا کیا۔

یہ سن کر اُتو قدیم جس نے انجن آرا کو پالا، پڑھایا، لکھایا تھا، اُس نے مبارکباد کہہ کے انجن آرا کی ماں کو نذر دی، محل میں تہتے پچھے، شہزادی رونے لگی، نواب ناظر، بیگم کی نذر لے کر، بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، نذر دی، خلعت مرحمت ہوا، یہاں تو ارکانِ سلطنت اسی دن کے روز منتظر رہتے تھے، یہ مرثوہ فرحت افزا، دریافت کر کے اٹھے، ہر ارب نذریں گزریں۔ تو پچانو میں شلک کا حکم پہنچا، نوبت خانوں میں شادیا نے بجنے لگے، مبارک سلامت کی صدا زمین و آسمان سے پیدا ہوئی۔ شہر سے

فلک پر یہ مبارک باد ہے اب کس کے ملنے کی یہ ایسا کون بختا ور ہے جس کا بخت جاگا ہے بادشاہ نے وزیر اعظم سے ارشاد کیا ”جان عالم یہاں مسافر نہ دارد ہے“ تم اموراتِ محل میں مستعد ہو۔ ہم اس کا سامان سرانجام کریں۔“

وزیر آداب بجا لایا، خلعت فاخرہ ملا، ہاتھی پالکی سے سرفراز ہوا۔

جان عالم کا یہ نقشہ تھا، چہرہ پر بشارت سے سُرخ، باجھیں تابنا گوش کھلیں، فرحت کے باعث بندِ قبا ٹوٹے جاتے تھے۔ مگر شرم کے باعث آپ سر نہ اٹھاتے تھے۔ بادشاہ نے رمال، نجومی، پنڈت، جفر داں، جو جو علم ہیت اور ہند سے اور نجوم میں طاق، شہرہ آفاق تھے، طلب کئے اور ساعتِ سعید کا سوال کیا، کسی نے قرعہ پھینکا، زائچہ کھینچا، لکھیں کسی نے پوچھی کھولی، کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا، کوئی تولا، پرچھک، دھن، ٹکڑ، کنبہ، من، سیکہ، برکہ، مٹھن، رک، سنگہ، کنیان، گن کر بچار کرنے لگا۔ کوئی مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، قمر، زحل کا حال مع گردش برج کہہ کے حل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، قوس، عقرب، جدی، دلو، حوت، میزان کی میزان دے کر شمار کرنے لگا۔ کہا ”بعد مدت قمر اور مشتری کا بطرز خلافت حل میں قرآن ہے، اس ہفتہ کا دن رات سعدِ اکبر ہے، اور بالاتفاق ایک روز مقرر کیا، حضور سے بقدر علم و کمال خلعت اور انعام عنایت ہوا، اور بعد جلسہ شادی بامید دیگر داماد وافر امیدوار کیا۔

القصہ بموجب احکامِ اختر شناسانِ بلند بینِ فلک سیر، ماضی مستقبل کے حال داں، باریک خیال و منجھان صدر نشینِ مندِ دیر حکم روایانِ خوش فال، مانجھے کا جوڑا، دلہن کے گھر سے چلا، مزدور سے تا فیل نشین زن و مرد با لباسِ رنگین، پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے، سنہرے خوانوں میں پنڈیاں، مقوی مفرح ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا، اور

دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے، طلائی چوکی، جواہر جڑا، زمرد نگار کٹورا، بٹنا ملنے کا کنگنا، بہ از عقد ثریا، ڈبریکتا بڑا بڑا لنگی ملتان کی مٹی، بیل بوٹے میں گلستان کی مٹی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پہ خندہ زن ہو، معطر دماغ انجن ہو۔ کنٹروں میں عطر سماگ، مہک پری، ایجاد نصیر الدین حیدری۔ ارگہ محمد شاہی، فتنے کی بو، چار سو۔ زعفران کا ساتھ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان ملا، نوبت نشان گھوڑوں پر شہناواز، نقارچی جوان، جوان، سکھیاں اور چند لوں میں زنانی سواریاں، ان کے بناؤ کی تیاریاں، کہاریاں پری چم، برقی درخشاں کا عالم۔ باہم قدم قدم، اس سامان سے وہ سب مانجھا لے کے، درِ دولت نوشاہ پر جو بس گئے، شہر کے کوچہ بازار بس گئے، وہاں دولہا، یہاں ددھن نے، مانجھے کے جوڑے پہنے، منادی نے ندا کی، ”جو سفید پوش نظر آئیگا، اپنے خون سے سرخ ہوگا، یعنی گردن مارا جائیگا“ بادشاہ نے خود ملبوس خاص رنگیں زیب جسم کیا۔ رنگ کھیلنے لگا، تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی، شہر میں شہاب اور زعفران کے سرخ و زرد نامے بے۔ گلیوں میں عبیر دگلاں کے ٹیلے ”یکرے“ رہے، کوچہ ہر بازار کا زعفران زار کشمیر تھا، ایک رنگ میں ڈوبا، امیر و فقیر تھا۔ پھر بتا کید تمام خاص و عام کو حکم ہوا، کہ آج سے چوتھی تک، سوائے اہل حرفہ، اپنے امور ضروری موقوف کر، گھروں میں ناچ دیکھو، جشن کر دو، جو کچھ احتیاج ہو، سرکار سے لو، اور ہر رئیس محلہ اور سردار قوم سے فرمایا ”جو تم سے متعلق ہوں، ان کی فرد درت کر حضور میں گزاراؤ۔ ان کے کھانے پینے کا سامان، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، حضور سے ملے گا اور ارباب نشاط کے داروغہ کو احکام ملا کہ جس کی جیسی لیاقت ہو یا جس کا جو شائق ہو، بشرطیکہ اس کے لائق ہو، برضا مندی طرفین دیبا طائفہ وہاں بھیج دو“

دوکانداروں کو ارشاد ہوا ”دن رات دوکانیں کھلی رہیں۔ قریب قریب ناچ ہو، ان کے کھانے کا صرف تھرنی باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندوؤں کو پوری کچوری، مٹھائی، اچار، مسلمانوں کو پلاؤ، قلیہ، زردہ، تورمہ۔ ایک آبی، دوسری شیرمال، فرنی کا خوانچہ، طشتری، کباب کی بہت آب و تاب کی، شہر میں گلی گلی، عیش و طرب، خوشی میں جھوٹے بڑے سب۔ نہ کسی کو کسی سے غرض، نہ مطلب۔ پکا پکایا کھانا کھانا، دوکانوں پر بیٹھے، ہر وقت ناچ دیکھنا، سرکار کا کام بنانا، بغلیں بجانا، بیت سے

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد کسے را یا کسے کارے نہ باشد

اور اس سے پہلے یہ تعین تاریخ روز شادی کے نامے بادشاہوں کو فرمان راجہ بابو کو صوبہ داروں کو شقے، عالموں کو پردائے جاچکے تھے۔ دو چار منزل گرد و پیش، سر راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی کھانا مٹھائی تیار کئے بیٹھے رہتے تھے کہ اس عرصے میں جو مسافر گزرے، یا طلبیدہ بادشاہ آئے، بھوکا نہ جائے، اور مزدہ شادی راہ چلتوں کو سنا شہر میں بھیج دیتے تھے کہ یہ جلسہ قابل دید ہے۔

غرض کہ دو منزل چار منزل، بلکہ دس بیس دن کی راہ سے، تماش بین بے فکرے لکھنؤ والوں سے سیر دیکھنے کو آئے اور ساچق کا دن آیا، اگر سب سامان بیان کردوں، کہانی نا تمام رہ جائے۔ مگر وہی مشے نمونہ از خردارے۔ پچاس ہزار چو گھڑے، روپے، سہرے، جواہر نگار، نقل اور میوے سے لبالب، لاکھ خوان بجن و خوبی بسیار، پر تکلف سب۔ پچاس ہزار میں مصری کے کوزے، باقی میں میوہ اور قند کی جھڑیاں، مرصع کاری کی بڑی تیاری کی۔ نقرئی، دہی کی مٹکی، گلے میں پھلیاں، ناڑے سے بندھیں، آرائش کے تحت بے حساب اس روش کے جن کے دیکھنے سے صنایعی صانع حقیقی کی یاد آئے، گل بوٹا اس سج دہج کا، جو نقل کو اصل کر دکھائے۔ آتش بازی کے ٹوکرے قطار در قطار، بے پایاں سرد، جھاڑ، درخت میوہ دار، ہزار در ہزار لابیان، بہت تزک بڑا سامان، آرائش کے گلدستوں سے چن رداں ساتھ تھا۔ سردست یہ باغ ہاتھوں ہاتھ تھا۔

اس انداز سے ساچق گئی، مہندی کی شب ہوئی۔ وزیر درست تدبیر نے خوب تیاری کی، ہزار ہا من نارنول کی مہندی، وہ رنگین، جس کی دید سے دستِ نظارہ مثل پنجہ مرجان، رشک عقیق بین اور لعل بدخشاں ہو جائے۔ ایک بار لگائے لال ہو، تمام عمر کھنڈ افسوس ملے۔ ایسا ملالی ہو، جڑاؤ سینوں میں جنا، شمع مومی و کافوری، اس پر روشن، ملیدے کے خوانوں پر جو بن، آرائش و آتش بازی ہمراہ، سب کے لب پر واہ واہ، بہت چمک دمک سے مہندی لایا، اور یہ رنگ ڈھنگ حسن تدبیر سے دکھایا کہ تمام، ہچمشوں میں سرخرو ہوا۔

برات کی رات کا حال سنو، دیوان خاص سے دُلہن کا مکان، پانچ کوس تھا۔ دونوں طرف بلوڑ کے جھاڑ، آدمی کے قد سے دو چند، سو سو جتی کے سر بلند، پانچ چھ

گز کے فاصلے سے روشن اور دس گز جُدا، 'نقری طلائ'، پنجشاہ جلتا۔ ان سے کچھ دور، ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر روشنی کرتے، جھاڑ رشک سر و چراغاں چمکتے، جا بجا ترپولے اور نوبت خانے بنے، کتھک اتھک ان پر ناچتے، نوبت بجتی، مغرق شایانے تھے، اس کے قریب آتش بازی گڑی، روشنی یہ روشن تھی کہ چیونٹی سوار کو بہ ہیئت مجموعی مفصل معلوم ہوتی تھی۔

غرض کہ دولہا سوار ہوا، شور و غل یکبار ہوا، کسی نے کہا، "سواری جلد لانا،" کوئی چٹکے شملہ سنبھال کر پکارا، "خدمت گار کو بلانا،" پلیٹیں آگے بڑھیں، باجے بجنے لگے، کوس دوکر گرجنے لگے، نوبت و نشان، ماہی مراتب، جلوس کا سامان، سواروں کے رسالے دو رویہ باگیں سنبھالے، خود ایسے ایکے بیش قرار درما ہے دار۔ پھر ہزار بارہ سے تختِ رواں تمام تہائی سے منڈھا۔ ان پر رنڈیاں جوان جوان، شادی مبارک گاتیں، سج دبیج دکھائیں، طبلے بھڑ بھڑاتیں، بہت سے سانڈنی سوار، تیز رفتار خاص بردار خاصیان، کندھوں پر دولہا کے برابر، اُن کے قریب برچھے والے، باندار چوہدار روشن چوکی والے، شہنائیں، پرتکلف، سُر زانے ہزاروں غلام زردیں کمر، سنہری، رد پہلی انگلیٹھیاں ہاتھوں میں، جھولی میں عنبر سارا عودِ غرقی بھرا، دشت مہکتا، گرد ہزار پنجشاہ پھنکتا، سونے چاندی کی دستیاں روشن، قورمین چالیں بادشاہ پُر شوکت و جاہ پیچھے، بارہ ہزار ہاتھیوں پر امیر وزیر، ارکانِ سلطنت ترقی خواہ۔ خواہی میں انجمن آرا کا بھائی، جان عالم کا سالا، بجائے شہبالا، آہستہ آہستہ، قدم قدم۔ خوش دخرم چلے۔ کوچہ و بازار بوباس سے مسطر تھا، ہرج و مرج گردان اس تماشے کو بحیثیت انجمن نگراں تھا۔ دشت کا دشت و طیر حیران تھا۔ پہر رات رہے دولہن کے دردازے پر پہونچے، ماما، اھیلیں دوڑیں، پانی کا طشت، ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا، کسی نے کچھ اور ٹوٹکا کیا، دولہا اتر کر مجلس میں داخل ہوا، بارہ سو طائفہ رنڈیوں کا سوائے بھانڈ، بھگتے، سہجڑے، زنانے کشمیری، قوال، مین کار، رُبابیے، سرودیے کے حاضر تھا۔ ناچ ہونے لگا، قریب صبح قاضی طلب ہوا۔ بساعتِ معین کئی سلطنت کے خراج پر مہر بندھا، طالب و مطلوب کو سلکِ ازدواج میں منسلک کیا، مبارک سلامت کا غلُ مچا۔ میر سوز سے

فلک شب کتھائی دیکھ اسکو سوز یوں بولا تجھے یہ بات اے رشکِ مہ اور مبارک ہو
سب طائفے ساتھ کھڑے ہو، ایک سُر میں مبارکباد گانے لگے، کئی لاکھ روپے بادشاہ نے عنایت کئے، دولہا زنانے میں طلب ہوا، وہاں رسمیں ہونے لگیں، وہ بھی عجب وقت تھا،

آر سی مصحف روبرو محبوب دلخواہ دو بدو۔ سورہ اخلاص کھلا، آئینہ رونمائی، میں مزے لوٹتا،
 سلسلہ محبت مستحکم ہو رہا، ڈومنیوں کا سٹھنیاں گانا، دولہا دولہن کا شرمانا، کبھی ٹوٹنے کا گاہ اچھے
 بنے سلونے۔ ہجویوں کا پوچھنا، "ٹونا لگا؟" دولہا کا ہنس کے کہنا۔ "عرصہ ہوا" کوئی دولہن
 کی جوتی، دولہا کے شانے میں چھو گئی، کوئی اسی کا جمل پارا ہوا لگا گئی۔ ہمنوں کی چھپر چھاڑ،
 ان کے جوہن کی بہار، نقطہ لعل اور شبہم کے دوپٹوں کی آڑ، جس دم یہ رسمیں ہو چکیں،
 جب نوبات کی نوبت آئی۔ عجب سیر نظر آئی۔ اس طرح چنی کہ دیکھی نہ سنی۔ میر حسن سے
 وہ جب پاؤں پر کی اٹھاتے اڑا نہیں اور ہاں کا عجب غل پڑا

جب یہ رسمیں ہو چکیں۔ پھر ڈومنیوں نے پاہونی گائی۔ سب کی چھاتی بھر آئی۔ کرام
 مچا، جب دولہن سب سے رخصت ہونے لگی، رو رو جی کھونے لگی، سواری تیار ہو، دروازے
 پر آئی، دولہا نے سہرا سر سے لپیٹ، دلہن کو گود میں اٹھایا، سب کا دل امنڈ آیا، شور و
 غل مچا یا۔

دنیا کے کارخانے قابل دید ہیں۔ بلکہ دیدہ بنی شادی میں غم سلف سے توام ہے مگر
 ثبات بجز ذات باری کسی کو نہیں۔ مقدمات جہان گزران، خواب پریشاں، میں اس میں سب
 حیران ہیں۔ ان کا حال کیا کہیں مولف سے

اک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طور آہ معلوم ہو گیا مجھے لیل و نہار سے

غرضکہ دولہن کو سکھپال میں سوار کیا، بادشاہ نے ملک و سلطنت، خزانہ جہیز میں لکھ دیا،
 رات رخصت ہوئی۔ وہ اہتمام تخت سواری کا سامان، ہر شخص خرم و خندان، جہیز کا بڑھنا، لوگوں
 کا دولہا پر دعائیں پڑھنا، نیم سحر کا چلنا، شمع کا جھللا جھللا کے جلنا، شہنا میں بھیروں، بہاس،
 ایلا، لالت، رام کلی کا پیونکنا، نقیب اور چو بدادوں کا کوئل کی طرح کوکنا، نوبت کی ٹکڑ، جھانجھ
 کا جھانجھ سے شور، جھٹ پٹا دقت، نور کا ترہکا، کرکیتوں کا سومیل کرڈکا، کچھ کچھ تاروں کی
 چمک، نقاروں کی صدا، دھونسے کی گمک، چاند کے منہ پر سفیدی، دلہن والوں کی یاس و ناامید،
 عطر کی ہر سو لپٹ، پھولوں کی مہک، سب کو نیند کا خمار، کوئی پیادہ کوئی سوار، فرشی باسی ہار،
 پھولوں سے رشک صحن چمن، کہیں جھول کہیں شکن۔ کسی جا پکھروٹے اور بیڑوں کے پتے کھلے
 پڑے، کہیں لوگ حیران و ششدر کھڑے، مجلس کے فراق میں، اہل محفل کے اشتیاق میں۔
 شمع کی زاری، اشک باری، لگن میں پردانوں کی بیقراری، خاکساری، دولہا کے لوگوں کی

خوش بشارت تیاری، دلہن کے گھر میں نالہ و زاری۔ کہیں کوئی نیند کے جھونک میں پڑا، کوئی یہ سامان بہ چشم عبرت دیکھ، تاسف میں کھڑا، شمع فانوس میں گلِ گلگیر میں، زیر انداز پر پردوں کے پر، فراش فرش اٹھانے کی تدبیر میں۔ بیٹھے ہوئے ہر ایک کی آواز، کہیں سوز، کہیں ساز، یہ وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، راہ چلتا دیکھ کر روتا ہے۔ اس کی لذت وہ جانے، جس کی نظر سے یہ ہنگامہ گذرا ہو، کسی کی برات تو دیکھی ہو، گو بیاہ نہ کیا ہو۔

قصہ مختصر، دولہا شگفتہ خاطر، خداں چہرے پر شباب کی چمک، عارضِ تاباں سے حسن کی بہار عیاں، ہاتھی پر سوار، گرد شاہ دشمنیار، زورِ سرخ و سفید تیار ہوتا، ہر چوک ہو کے دیوان خاص میں داخل ہوا، جو زمین یہاں کی تھیں، ہونے لگیں۔ بکرا ذبح کیا، انگوٹھے میں لو لگا دیا، پھر کھیر کھلا کے رسومات سے فرست پائی۔ اب یہ منتظر ہوئے کہ شام ہو وصل کا سرانجام ہو۔ اس دن جانعام کا گھبراہٹ، گھڑی گھڑی گھڑی پائی سے دن کی خبر منگوانا، دیکھنے کی گوں تھا۔ بدحواس پھرتا تھا کہ کہیں جلد رات ہو، بے تکلفی کی ملاقات ہو، کبھی کہتا تھا واہ قسمت کی خوبی، پھر بھر کا عرصہ ہوا، گھڑی نہیں ڈوبی، ہوش کہاں بجا تھا، مکرر پوچھتا تھا، ابھی کیا بجا تھا۔ ادھر انجن آرا بھی جمائیاں لیتی تھی۔ تکتے پر سر دھرتی تھی، جب اور کچھ تدبیر بن نہ آتی تھی، لوگوں کے چونکانے کو اذگہ جاتی تھی۔ غرض کہ خدا خدا کر، وہ دن تمام ہوا، نمود وقت شام ہوا، عروسِ شب نے مقنعہ مہتاب سے روپوشی کی، مشتاقوں کو فرصت ملی، گرمجوشی کی، لوگ آنکھ بچا کر جا بجا کنارے ہوئے، دولہا دولہن چھپر کھٹ میں ہمنار، بیتابی کے مارے ہوئے، شادی کا زور شباب کا عالم، مشتاقوں کا بیٹھنا، باہم آنکھوں میں خمار نیند کا، دل میں اشتیاق دید کا، عطرِ سہاگ اور فتنے کی خوشبو، بیٹنے اور تیل کی عجب میل کی مہک، ہر سو پھولوں سے پلنگ بسا، ادچہ کسا، خود نشہ عشق سے باختر، حواسِ تناسلے دل پاس نہ کچھ دغدغہ، نہ دوسرا، ہنگامہ صحبتِ طرفین سے گرم، ادھر شوق، ادھر شرم، ایک طرف دلولہ گرمجوشی، ایک سمت کثرت حیا سے منہ پر خموشی۔ بیان کرنا، گزشتہ حال کا، خیال لوگوں کی دیکھ بھال کا۔ یہ معمول ہے اس روز ہم سنیں برابر دایاں تاکتی بھانکتی ہیں، لیکن ان ڈردوں پر چپ نہ رہے، آہستہ آہستہ دونوں نے دکھڑے کھے۔ جانعام نے توتے سے ذکرِ سن کر، در بدر خراب و خستہ ہو کر آنا، توتے کا بیٹھ رہنا، وزیر زادے کا صدمہ فراق سہنا، پھر طلسم کا پھنس جانا، جادوگرنی کا ستانا، بعد اس کے نقشِ سلیمانی لینا، وہاں سے چل دینا، بہ کشادہ پیشانی و خوش بیانی بیان کیا، مگر ملکہ مہرنگار

کی ملاقات، جگت رنگی کے حرف و حکایات، اس کی طبیعت کا آجانا، اپنا بے اعتنائی سچلے آنا، کچھ شرابا کر بات کو مطلب کی جاسے جابجا کر کہا۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ مستوق کے روبرو جو اس پر کبھی کوئی عاشق ہوا ہے، اس کا ذکر کرتا ہے، شیخی بگھارتا ہے، کچھ جھوٹ اپنی طرف سے بوڑھتا ہے، دل کے پھپھوے توڑتا ہے، اس کی شرح گو طول طلب ہے، پر عاشق مزاجوں پر منکشف سب ہے۔

ایجن آرا نے جادوگر کی قصے پر تاسف کیا، ملکہ کے مذکور پر بناوٹ سے ہنس دیا، پھر روکھی صورت بنائی ناک بھوں سمیٹی، تیوری چڑھائی، مگر چلے آنے کے سہارے پر مسکرائی، اپنا بھی اشتیاق لئے دیئے۔ از روز ملاقات، محنت و مشقت کی قدردانی سے، جادوگر کی لڑائی کی جانفشانی سے، بیان کیا پھر دونوں بے ساختہ ہو شرم و حیا کھو، ہم آغوش ہوئے۔ رنج درکنار غم و دردِ مہاجرت فراموش ہوئے۔ مولف ۵

یہ کناری جاناں سے تازہ لطف اٹھا گلے سے ملتے ہی، سب رنج درکنار ہوا

سینے سے سینہ، لب سے لب، ہاتھ پاؤں، بلکہ جتنے اعضائے جسم ہیں، سب وصل تھے، مثل ہے ایک جان دو قالب۔ وہ ایک جان ایک ہی قالب، غالب ہے کہ ہو گئے۔ استاد ۵

ایام وصل میں ہم لپٹے ہیں جیسے اسے یوں وصل کے بھی کاغذ چپاں ہم نہ ہونگے خواہش کو اضطرابِ حیا مانع کار، بر سرِ تکرار، دونوں کے دم چڑھ گئے۔ جنگ زرگری گاؤں زوریاں کر رہے تھے، شاہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ جب بے بس ہو جاتی تو چٹکیاں لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی — "اے صاحب آنا کوئی گھراتا ہے، دیکھو تو کون آتا ہے، کبھی خود اٹھ کر دیکھتی بھالتی تھی، کوئی دم یوں طالتی تھی، آخر کار خنجر سربستہ و تمنائے دراز، بھرت نیم وصل و شگفتہ و خنداں ہوا، دُرِ ناسفہ درج شہریاری، رشک عقیقِ یمن، غیرت وہ وصل بدخشاں ہوا، رشک و حسرت سے جگر صدف چاک ہوا، دشمن کبخت در پردہ ہلاک ہوا۔ تقاضائے

بن، المہر پینے کے دن، اس وقت دونوں گھراٹے، اور وہ کیفیت سب بھولے۔ جب دامنِ شب میں، چادرِ پلنگ پر، شفق صبح پھولی۔ غرض کہ شرابا کر استراحت فرمائی، دل بیتاب نے تسکین پائی۔ ہنوز پلک نہ جھپکی تھی، نمود سحر ہوئی، عام شب کی خبر ہوئی، دم صبح ایک سرخورد، دوسرا زولیدہ، حمام میں داخل ہوئے جو محرم راز، شریکِ ناز و نیاز تھیں، رات کی باتوں کے پتے، رمزد کناٹے میں دینے لگیں۔ سب نے قہقہہ مارا، جب روبرو پنجرہ اور شیشے میں تنبول آیا، شرابا کر سر جھکایا، غمزہ و ناز ہر انداز میں رہا، نہا دھو، خاصہ نوش فرمایا۔

جاننام بادشاہ کے حضور میں آیا، خلعت فتح پایا، امورات سلطنت بمشورہ شاہزادہ ہونے لگے، بعد رسم چوتھی چائے کے، لب دریا ایک باغ بہت پُر تکلف کا نشاط افزا نام، بادشاہ نے رہنے کو عنایت کیا۔ اگر اس باغ کی تعریف رقم کروں، شاخِ زنبق و زگس کی ٹہنی کو لکھ بار قلم کروں، الا خضر کی حیات، رضواں کا ثبات درکار ہے، نہیں تو ناقصا م ہے، لکھنا بیکار ہے، سو بار خزاں جاٹے بہار آئے، ایک پٹری کی روشِ صفا تحریر نہ ہو سکے، خامہ مان پھیل جائے۔ رشکِ گلزارِ جاناں ایک تختہ فردوس سا، کئی کوس کا، باغ بے پایاں برگ و بار گل، اس کے جوہر خزاں سے آزاد بالکل، نہ بلبیل پرستم باغیاں، نہ خوفِ صیاد، عجباب و غراب چھپے، نئے رنگ ڈھنگ کے ترانے یاد، جتنے دنیا کے میوے ہیں تر و تازہ، ہمیشہ تیار، سرسبز، پتے خوش رنگ، پھول پھل مزیدار، گل تکلیفِ خار سے بری، جہاں کی نعمت ہر تختہ میں بھری۔ روش کی پٹریوں پر ہندی کی ٹٹیاں کڑی ہوئی برابر۔ چمن میں وہ درخت پھلے پھولے، جسے دیکھ کر انسان کی عقل بھولے، پھولوں کی بوئے خوش سے دل و دماغ طاقت پائے، جو پھل نظر سے گذرے، بار خاطر نہ ہو۔ ذائقہ زبان پر، منہ میں پانی بھر آئے، نہریں ہزار در ہزار، پُر انداز آبشار، گرد چرند و پرند، خوبصورت، قطعدار، باغبانیاں پری زاد، عورتیں کمن، مہ لقا، بیلچے جواہر نگار، ہاتھوں میں ہر ایک آفت کا پرکالہ، دربار، مہ سیم، کنوئیں سجتے، جڑاؤ چرخ رسی کلاب تو کی۔ ڈول وہ کہ عقل دیکھ کر ڈالوں ڈول ہو، چہرے پر نزاکت بر سے۔ بیل کے بدلے نیل گائے کی جوڑیاں، آہو جن کے روبرو چکارہ۔ باغبانیاں، مہ پارہ زربفت کے لہنگے، قیمت کے مہنگے، شبنم کے نفیس دوپٹے، مغرق مصالح کی کرتی انگیاں چھڑے، پاؤں میں طلائی دا چھڑے۔ کان کی لو میں، میرے کی بجلی، برق دم، سب کی آنکھ جس پر پڑے۔ کوئی ڈول کو سنبھال پٹا خیال گاتی، کوئی شعر برجستہ یا ہندی کا دوہا اس میں ملائی، چھیڑ چھاڑ میں چٹکی لے کے اچھل جاتی۔ ایسے باغ پُر بہار میں جاننام اور انجن آرا ہاتھ میں ہاتھ، پریوں کا اکھاڑا ساتھ، دین و دنیا فراموش، ہر دم نوشا نوش باعیش و نشاط، اوقات بسر کرنے لگا، جہاں کا ساز و سامان، ہر دم مہیا، شراب و کباب، جنگ و رباب کا جلسہ، خدمت گذاریں، پیری پیکر ماہ طلعت، سب کام کو حاضر، جیسے کھنیا، شامِ عشرت سحر کرنے لگا، نہ خیال اپنے شہر و دیار کا، نہ خوفِ گردشِ روزگار کا، نہ دھیان اس جگر نگار، کشتہ انتظار، ملکہ مہر نگار کا۔

پھر مذکور اس مہجور کشتہ فراق کا خستہ آتش اشتیاق کا

وہ کون خستہ و محزون جگر بشتہ دل خوں ملکہ مہر نگار، شہزادے کے آنے کی امید وار

اور حکایات ضرب المثل

کہ صحر ہے تو اے ساتی بے خبر
ہوا حال شادی کا سب اختتام
طیش سے تڑپ سے تو کردے ہم
خوشی سے مجھے رنج مرغوب ہے
یہی ساتھ دیتا شب و روز ہے

نہ کی لطف سے غمزدوں پر نظر
مگر غم کا قصہ ہے وہ نامتام
کہ لکھتا ہوں پھر داستانِ الم
یہ مولس ہی ہمد بہت خوب ہے
یہ غم عاشقوں کا غم اندوز ہے

نالہ نوازانِ بزمِ ماتم و تفتہ جگر ان کلبہ غم، حاکمیانِ حکایتِ اندوہ و ملال و نشانِ
دل خوں آشفہ حال لکھتے ہیں کہ اس بے سرد سامان، کشتہ ہجران دور از دلدار، دہقرینِ غم
رد نادیدہ شادی، جملہ نشینِ ماتم، دلریشِ سینہ فگار، یعنی ملکہ مہر نگار کا فرقت میں یہ حال
ہوا۔ استاد

یاں تک کہ اٹھانے کا وقت اپنے قریب آیا
میں نام ترا لے لے دن رات جو چلاؤں
اس پر مرے بالیں پر تم اٹھ کے نہ آ بیٹھے
ادستے ہوئے بہرے کیوں کہ نہ گلا بیٹھے
جو کوئی کتنا خیر ہے، ملکہ گھلی جاتی ہو، کیوں اتنا رنج و غم اٹھاتی ہو، تو یہ کہتی

مصطفیٰ

غم کھاتی ہوں لیکن مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مولف

نہ پوچھو کچھ مری حالت کہ اس دل کے لگانے سے
پریشاں سینہ سوزاں منفصل سرد گر بیاں ہوں
ایسی باتیں درد آمیز دشت انگیز کرتی کہ سننے والوں کی چھاتی پھٹتی، وہ کہتیں "ملکہ نظر بخدا
رکھو حسن"

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار

سوز

پھر بہار آتی ہے تجھ میں اے گلستاں غم نہ کھا
وہ چلی آتی ہے فوجِ عندلیباں غم نہ کھا
گو کہ شب آخر ہوئی اے شمع تو زاری نہ کر
پھر وہی محفل وہی تیرا شبتاں غم نہ کھا
وہ سن کر یہ کہتی کہ "میں چراغِ سحری ہوں، یقین ہے کہ تا صبح جل کر، بزمِ جہاں سے سفری
ہوں۔ خروہ"

پس از آنکہ من نمانم بچہ کارِ خواہی آمد

مولف

ہماری جان کے جانے میں جب عرصہ رہا تھوڑا
تب اس کے دل میں آیا دھیان میرے پاس آنے کا
آج تک اس غفلتِ شمار، فراوشِ کار کی کچھ خبر نہ آئی۔ ہم نے غمِ جدائی میں جان گنوائی۔ مولف
تب جدائی سے اس طرح اب نزار ہوں میں
اجل کے منہ سے بھی غالب ہے شرمسار ہوں میں
کیا ہے رنجِ جدائی نے ایسا کاہیدہ
نظر میں خلق کی رشکِ خطِ غبار ہوں میں
جو تو وہ گل ہے کہ عالم کے دل میں ہے تری جا
تو سب کی آنکھ میں کھٹکا کیا وہ خار ہوں میں
قرار می برد از قلقِ آہ و زاری ما
سرورِ رنج میں کس کے یہ بیقرار ہوں میں
یہ معمول تھا، جب چار گھڑی دن رہتا، سوار ہو کر ان درختوں میں جہاں جان عالم سے ملاقات
ہوئی تھی جاتی اور جو جو شریکِ رنج و راحت تھیں، ان سے مخاطب ہو یہ کہتی۔ اپنی شیرازی
خوش آنکھ تو باز آئی دمن پائے تو بوسم
در سجدہ فتم خاک قدم ہائے تو بوسم
ہر جا کہ تو روزے نفیسے جائے گرفت
آنجا دم و گریہ کناں جائے تو بوسم
ردے تو تصور کنم و لالہ و گل را
در حسرتِ رخسارِ دل آراے تو بوسم

ہر جا کہ غزالیست چو مجنوں سر و چشمش
من اہل درویش تو آن شاہ بتا نے
در آرزوئے نرگس شملائے تو بوسم
دستیکہ بوسم بتمنائے تو بوسم
اور کبھی صبح سے پھرتے پھرتے قریب شام، بادلِ ناکام، اسی جنگل میں پھر آئی، یہ غزل
زبان پر لائی۔ جرات سے

بہ شکلِ مہر ہی گردش ہے ہم کو سارے دن
بہ وصل کیونکہ مبدل ہوں ہجر کے ایام
رہے تھا جبکہ ہم آغوشِ مجھ سے وہ پیارا
نہیں ہے ترے مریضانِ ہجر کا چارہ
کب اس سے ہوگی ملاقات میں یہ پوچھوں ہوں
لگایا روگِ جوانی میں کیوں میاں جرات
رات کو بحالِ بقرار، وہ سو گوار، ناچار، گھر آئی، تمام شب کراہ کراہ سب کو جگاتی اور یہ
سنائی۔ استاد سے

حرام نیند کی، اقرارِ وصلِ جاناں نے - الہی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو
وہ رات جسے شبِ فرقت کہتے ہیں، بے چینی سے پہاڑ ہو جاتی، تو وہ غم کی ماری سخت گھبراتی،
یہ لب پر لائی۔ استاد سے

جیسا شبِ عشرت کو فلک تو نے گھٹایا
کی جلد نہ فرقت کی ستم گر سحر ایسی
ہے ہے آج نہ صدائے مرغِ سحر آئی، نہ موزن نے ندائے اللہ اکبر سنائی، نہ خوابِ غفلت
سے پاس بان کبخت چو نکا، اور نیند کی جھونک میں گھر طیالی بھی گھر کا بجانا بھول گیا۔ جرات سے
تھے شبِ وصل میں سب جان کے کھانے والے آج کیا مر گئے گھر طیاں بجانے والے
شب کو نالہ تھا دن کو زادی تھی، دن رات اس پر سخت بھاری تھی۔ لوگ کہتے تھے
”ملکہ اللہ کو یاد کرو، کبھی تو دل شاد کرو، شانی مطلق تمہارے مرضِ مفارقت کو، بہ صحبتِ وصل
بدل کرے۔ اب روزِ وصالِ عنایتِ ذوالجلال سے قریب ہے“ تو اُس وقت بہ حسرت یہ
کہتی۔ مؤلف

شبِ وصل جو قسمت میں ہے تو ہودے گی
دعا کرو شبِ فرقت تو یہ سحر ہودے

عزل

اگرچہ صبح کو یہ بچ گیا تو شام نہیں
ہمارے زخمِ جدائی کو التیام نہیں
یہ دیکھو مری شامت کہ ہوتی شام نہیں
کہ بہتر اس سے مرے فوں کا انتقام نہیں
میں تم سے کہتا تھا گلشن کو کچھ قیام نہیں

مریضِ ہجر کو صحت سے اب تو کام نہیں
رکھو دیا نہ رکھو مرہم اس پہ ہم سمجھے
کیا جو وعدہ شب اس نے دن پہاڑ ہوا
وہی اٹھائے مجھے جس نے مجھ کو قتل کیا
اٹھایا داغِ گلِ افسوس تم نے دل پہ سرور
استادہ

آخر شب وصال کی جاپیش کی وہی ہر دن تھا اے فلک مجھے جس رات کا خیال

معاملاتِ عشق دیکھئے، وہاں شہزادے کو غم سے فراغ، کیفیتِ باغِ گلزار، بغل میں راحت و
آرام، یہاں ملکہ آتشِ فراق سے، بادلِ پُرِ داغ، خارِ غمِ جگر میں گرفتار، رنج و آلام، لیکن دردِ
دلِ بیقرار، نالہ جگرِ انگار، رائیگاں نہیں جاتا۔ جب تڑپِ بلبل کے دل میں زیادہ ہوتی ہے،
موسمِ گل آتا ہے، اسی طرح سوزِ دل عاشق جو حد سے فرزدن ہو، معشوقِ رحم کھاتا ہے، بھولا
ہو یاد آئے، وگرنہ ہجر میں پھر تک کر مر جائے مطلوب کو نقش پر لائے، اس کی بھی جان گنوا تا
ہے حضرتِ عشق دشمنِ جاں عاشق و معشوق ہیں، ان کا حال کیا کہیں، چنانچہ یہ نقلِ ضربِ اہل
ہے اور حقیقت میں اصل ہے بغور سن کر تامل کرو۔

نقل سوداگر کے بیٹی کی، انگریز کا آنا،

فریفتہ ہو جانا، آخر کو جان دینا دونوں کا

کلکتہ میں ایک سوداگر تھا، عالیشان متاع ہر دیار، تحفہ جوار، جوار، دوکان میں فراداں۔ اس کی بیٹی تھی حسین، مہر طلعت، ماہ جبین، سمین تن، کافر فرنگ، غارت گر لندن۔ غرضکہ اور تو اباب سب طرح کا دوکان میں تھا، مگر گھر میں وہ زور رقم طرفہ ٹوم تھی، فرنگ سے ہند تک، اس کے حُسن کا چرچا تھا۔ روم سے شام تک اور بمبئی سے سورت تک، اس کی صورت کی دھوم تھی۔ استاد

ہے رخنہ سازِ ایماں وہ زادۂ نسرنگی اسلام اب کہاں ہے عاصی فرامشن ہے ہزاروں انگریز بریز، بریز، کرتے، اس پر شیفۂ دبیاب تھے، لاکھوں مسلمان سرگرداں، خسہ و خراب تھے، جب ہوا کھانے کو سوار ہو کر آتے تھے، راہ میں و دردیہ خلقت کی جان، اُس کی خواہی میں برباد جاتی تھی۔ گبر و ترسا اس کا کلمہ پڑھتے تھے، یہود و نصاریٰ اس کا دم بھرتے تھے، مسلمان دل و جان نذر کرتے تھے۔ مولف

اس لعبتِ فرنگ کو دکھلا کے قاشِ دل کتاہوں چکھو یہ دل بریاں کا توس ہے اتفاقِ زمانہ کوئی انگریز لندن سے تازہ دارو ہوا، جلیل القدر، ذیشان، خوبصورت، نوجوان، شورِ عشقِ سودا خیز سر میں، سوزِ دل میں، مزاجِ بے شر، بے قراری آبِ دگل میں۔ میر سے

تھا طر حدار آپ بھی لیکن رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
 قضارا، وہ آفت کا مارا، کچھ اسباب لینے اس کی کوٹھی میں آیا، اور اس غارت گردین و
 ایمان، ہر گبر و مسلمان سے دو چار ہوا، عشق لگے کا ہار ہوا، دیکھتے ہی متاع عقل، اساس
 ہوش و حواس گرہ سے کھو بیٹھا، دل سے ہاتھ دھو دم نقد جان کو رو بیٹھا، اسباب خریدنے
 گیا تھا، سودا مول لیا، اس نے مشتری سمجھ، میزانِ محبت میں تول لیا، ہاتھ پاؤں نہست، دل
 نے ہمت ہاری، دن دہاڑے لٹ گیا۔ عشق کا بیوپاری جب اور کچھ تدبیر بن نہ آئی، خرید
 فروخت کے حیلے میں آمد و رفت بڑھائی، پھر تو یہ خال ہوا۔ جرات سے
 دن میں سو سو بار اب ہم اُن کے گھر جانے لگے منہ پھپھانے وہ لگے ہم ان پر مرجانے لگے
 سلف سے عشق آج تک پھپھانے نہیں۔ مشہور ہے اس مقدمے میں انسان مجبور
 ہے۔ میر سے

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا مضطرب کہ خدائے خانہ ہوا
 جب یہ امر مفصل سوداگر کے گوش زد ہوا۔ پاس نام و نشان، خوں ذلت و دروائی
 کا از حد ہوا پہلے دونوں کو نصیحت کی۔ پند کیا، پھر سلسلہ آمد و رفت قطع کیا، دیکھا
 بھالی کا رخنہ بند کیا۔ ادھر شعلہ عشق نے بھرپک کر، صاحب کو سلامت نہ رکھا، تاب و توان
 شکیب و تحمل کو، میزیم خشک کی طرح جلا، صبر کا قافلہ لوٹ لیا میر سے

بستر خاک پر گرا یہ زار درد کا گھر ہوا دلِ بیمار
 خاطر افکار، خار خار ہوئی جاں تمنا کش نگار ہوئی
 دل نہ سمجھا اور اضطراب کیا شوق نے کام کو خراب کیا
 رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے لگے اڑنے جگر کے پر کالے

یہاں تک تب مہاجرت اور دردِ مفارقت سے حال درہم برہم ہوا کہ صاحب بہادر
 شکست فاش اٹھا کر صاحب فراش ہوئے، دل و جگر سینے میں پاش پاش ہوئے۔ جس و
 حرکت کی طاقت نہ رہی، لینے کے دینے پڑ گئے۔ استاد سے

مرض یہ پھیلا پڑا ہے تب جدائی سے کہ پیٹھ لگ گئی یاروں کی چار پائی سے
 جو جو اس کے دوستِ دلی، محبِ قلبی تھے، نصیحت و پند و قید و بند کرنے لگے، عورتوں
 کی یونانی، بتوں کی سنگ دلی، معشوقوں کی کج ادائی، بہت مشرح سمجھائی، سود مند نہ ہوئی،

خاطر میں نہ آئی۔ ایک دوستدار۔ اس کا غم خوار تھا کہنے لگا "کیوں جو یائے مرگ ہوا ہے،
 ظالم یہ کیا کرتا ہے، اس کا انجام ذات ہے حاصل اس کا خفت ہے، یہ خیال محال اپنے
 دل سے نکال، زورِ زندگی، سفینہٴ نوجوانی، دیدہ و دانستہ درطہٴ ہلاکت میں نہ ڈال، اپنے
 کس و کو پر نظر کر، لشد دل خود رفتہ کو سنبھال؛ تو نے پیرِ مجسٹن کی حکایت نہیں سنی، کہ
 اس پر کیا گزری، آخر کار کیسی خفت ہوئی۔"
 اس نے کہا "کیوں کر"

حکایت پسر بٹن، ٹیے کا پیدا ہونا، سفر کی کیفیت،

جہاز کی تباہی، شہزادی کا ملنا پھر مفارقت، بٹن کا ساتھ جانا

وہ بولا ”اسی شہر میں ایک شخص تھا، بٹن نام۔ نہایت اہل دُول، مرثہ حال، صاحبِ علم و فضل، جامع ہر کمال، طیب اور ادیب بے بدل، سخن سنج، لطیفہ گو بر محل، کمالات میں یگانہ روزگار، تجارت میں نامور ہر دیار، سو سو جہاز۔ ایک بار تجارت کو جاتا تھا، نصیب ایسا جاگتا تھا، مٹی کو چھوتا، سونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طرح کا خواہش مند، بجز فرزند ارجمند نہ تھا، شب و روز اس کا خیال تھا، مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش فہمتوں کی دُعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا، حسبِ دلخواہ صورت میں غیرتِ ماہ، بہت شاداں سرگرم پرورش ہوا۔ جب بارہ برس کا بن ہوا، بسبب طبع رسا و تعلیم استادانِ باذکا جمیع علوم اور فن میں کامل ہوا۔ درس دینے کا مطب کرنے لگا۔ تیرہویں سال باپ سے سفر کی اجازت چاہی، کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔ بٹن نے کہا: ”اپنا بھی یہی قصد ہے، مگر چندے تو قف شرط ہے۔“ اس نے عرض کی ”حضورِ عمر طبعی کو پہونچے، من ہیں، فدوی کے سیاحت کے دن ہیں، چاہتا ہوں آپ کے بعید حیات سفر کو جاؤں، جو دتِ طبع دکھاؤں؟“ آخر بٹن نے دس بارہ جہاز پُر از متاعِ دِمال، پندرہ بیس رفیقِ قدیم دیانت دار،

امانت شعار، ہمراہ کر، رخصت کیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے، دوسرے کے بعد، ہوائے جوہر گردوں سے جہاز تباہ ہو گئے۔ مجسٹن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوبا، یاران ہمراہی عالم بقا کو راہی ہوئے، یہ ایک تختہ پر ڈوبتا، اچھلتا بہہ چلا، حیات مستعار باقی تھا۔ ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا، اس کو غش سے جو افاقہ ہوا، تختے سے اترا اور گھاس کی رسی بنا، وہ تختہ پتھر سے اٹکا دیا، پھر آپ تلاش آبِ ودانہ، روانہ ہوا، چند قدم بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا، آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سا رخ طرفہ ماجرا نظر آیا، دکان ہر ایک کھلی، اشرفی، روپیہ کا ڈھیر، اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتہ مفقود، اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصہ سے یہ بازار جنس بشر سے خالی ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے، پھرتا پھرتا قلعہ میں آیا، دیکھا باغ سرسبز، پرمیوہ، بیچ میں بنگلہ، زربفت کے نفیس پردے پڑے۔ پردہ اٹھا، بنگلے میں آیا۔ پلنگ جواہر نگار گسترده، اس پر کوئی شکل مردہ، دوپٹہ تانے، نہ کوئی پاکنتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اس نے دوپٹہ سر کا یا، عورت نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی صورت دیکھ کر کہا کہ "اے عزیز! اپنی جوانی پر رحم کر، یہ مکان نہیں، سیل فنا ہے، تو نا آشنا ہے اس سے درگزر، وگرنہ آفت کا مبتلا ہوگا، خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا۔"

اُس نے کہا کہ "ایسا ماجرا کیا ہے، بیان تو کر"

عورت نے کہا "پہلے تو اپنے آنے کا حال سنا کیونکر آسنا"

اس نے کہا "سات دن سے بھوکا پیاسا ہوں، جو کچھ کھاؤں، داستاں پریشان سناؤں"

عورت بولی "مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے، سو کھانا یہاں کہاں،

بجز غم کھانے کے اور پانی ہوا اشک بہانے کے، آنسو پینے کا نام ہے، اس سے نہیں پیتی ہوں

اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی، متحیر ہوں، کیونکر جیتی ہوں، مگر تنہائی میں ہاں خوف کھا کے

روز دن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شبِ ادلیں گور ہے، جاں کنی رہتی ہے، سخت جانی کی بددت

نہیں مرتی ہوں۔ جرات سے

یہ غلط کہتے ہیں بے آب و خورش جیتے ہیں لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر جیتے ہیں

تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا۔"

مجسٹن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا، نہر سے پانی پیا، گو نہ الم در بخ فاقے سے

افاقہ ہوا، پھر عورت کے پاس آئے، حب و نسب اپنا اور باعثِ سفر، جہاز کی تباہی کی مفصل

سرگزشت سنائی، پھر اس کا ماجرا پوچھا، وہ بولی "اے شخص اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا والی ملک تھا، مجھ کو سحائے سیر و شکار، کسی امر سے سردکار نہ تھا، ایک روز بربدیا مصروف تماشہ بیٹھی تھی، دفعۃً سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا، میں نے تیر مارا، معلوم نہیں لگا، یا خطا کر گیا، پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب، بہ شکل عجیب جھپٹا آتا ہے، میں تو ڈر گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی، جو جو ہمراہ رکاب تھے، وہ طمعہ دہن مار خوشخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں، ساکنان شہر مع بادشاہ انسان سے مایحوان کوئی بھی نہ بچا، فقط میں سخت جان باقی ہوں اور یہ صحت ہے کہ قریب شام وہ خون آشام آکر اس جنگل کے نیچے بیٹھتا ہے، دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے، اسی باغ سے سیوہ کھا پانی پیتی ہوں، اس خرابی سے جیتی ہوں۔ کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا، آج تجھے دیکھا خوش خدا آیا، مطلع کر دیا۔"

پسر مجسٹن نے کہا "خاطر پریشان جمع رکھ، اگر فضل الہی شریکِ حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر جس جگہ سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا، وہاں گلاھا کھودا اور قلعے سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی، پھر گھاس ہری اس پر جمائی۔ شہزادی نے کہا۔ "اب وہ آتا ہی ہوگا۔" یہ سن کر سر نقب جا پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا کہ دفعۃً وہ انسی پڑ زہر، خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرش زقردیں پایا۔ بہت خوش ہو کر بیٹھا، یہ تو تاک میں تھا، پتھر سے آگ نکال، اس نقب میں ٹال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا، وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہونچا، دونوں نے شکر کا سجدہ بدرگاہِ دافع البلیات کیا۔ باہم بے اندیشہ دغم رہنے لگے۔ سات برس دونوں ساتھ رہے۔ اس عرصے میں ددوڑ کے بھی پیدا ہوئے۔ ایک دن رنج تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔

صائب ۷

بہارِ عمر ملاقاتِ دوستدارِ انت
چہ خط بردِ خضر از عمرِ جادواں تنہا
کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ شہر آباد ہو، خاطر غمگین شاد ہو۔
وہ بولا کہ "اگر وطن جاؤں اور مجسٹن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بے ؟
عورت نے کہا۔ اکیل میں کیونکر بسر کروں گی، میں بھی ساتھ چلوں گی۔"
آخرش ایک ایک رٹکا دونوں گود میں سے کر چل نکلیے، قضا را وہاں پہونچے جہاں تختہ بندھا تھا،

ذہن میں آیا، اُسی پر سوار ہو کھول دو، کہیں تو جانکلو گے۔ یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے۔ وہ تختہ کھولنے لگا۔

شہزادی بولی "مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے، مگر ایک تاریل اکیر سے بھرا ہے، دولت لا اہتا ہے، جو تو اجازت دے تو اسے لے آؤں۔ مہر طہ بدوزد طمع دیدہ ہوش مند

محسن کے بیٹے نے کہا: اچھا۔ وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھایوں ہی رہا، شہزادی لڑکائی اتری، اس کے اُترتے ہی ایسی تندہوا چلی، کہ رسی مکان سے ٹوٹ گئی، تختہ بہ چلا۔ ہر چند اُس نے ہاتھ پاؤں مارے، وہ ساحلِ مطلب سے کنارے ہوا، کنارے پر شہزادی بحال خراب۔ دریا میں وہ بادل کیاب بہ نکلا، دل سے کتا تھا، دیکھئے مرضی ناخدا کے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے۔ یہ جھونکا ہوا ہے قوم عاد کا ہے، اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمود ہوا، اہل جہاز نے جو دیکھا تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا، نادان بیٹے بھا جاتا ہے، رحم کھا پیوٹی کو دوڑا، جہاز پر آیا۔

اتفاق زمانہ مالک جہاز محسن کا دوست دمساز تھا، اس کو پہچانا، بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا، برس روز میں جہاز کلکتہ میں داخل ہوا، جہاز کا حاکم محسن کی ملاقات کو آیا، بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا۔ یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی محسن نے سُن پائی تھی۔ غرقِ لبہ غم تھا، بالے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہ باری کیا، پوتا گھاتے میں ملا، اور کلماتِ شکر یہ اس سے کرنے لگا۔ اس نے کہا "بندہ پرور خیر ہے، دنیا اسی کا نام ہے، جس کا کام جس سے نکلے، وہ فخر و سعادت سمجھے۔"

بعد چند روز محسن نے بیٹے سے روئدادِ سفر پوچھی، اس نے ابتدا سے انتہا تک سب سرگزشت بیان کی، یہ سن کر سمجھا، مشکل پیچ پڑا، مگر سہل سایہ جواب دیا "الْخَيْرُ بِمَا وَقَعَا" خیریت اسی میں تھی۔ جو ہوا مصر کے برسرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد۔ بیٹے نے کہا "مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلے، ایسا ملک مالا مال، یہ دولت لازوال، ہاتھ سے نہ دیکھئے۔"

محسن نے کہا "خیر ہے یہ بھی ایک فسانہ تھا، جو میں نے سُننا، اور خواب تھا، جو تو نے دیکھا۔ لا اعلم۔"

ایامِ دصال و صحبتِ سیم تنان در عالمِ خوابِ احتلائے شد درفت

اس نے کہا۔ ”آپ ساعقلندہ ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے۔ دنیا میں تین سرکے ہیں زر، زن، زمین۔ یہ سامان سب جمع ہیں۔ اگر آپ نہ جائیں گے فدوی تنہا جائے گا۔“
 مجسٹن نے کہا ”افسوس! ہم تجھے دانا جاننے لگے۔ اِلا ہمارے نادانی تھی، حق کی مقتضی تمہاری نوجوانی تھی، اے بھائی! کوئی نادان سے نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا، یہ باتیں جب تک تھیں، جو تم اور وہ باہم تھے، وہ مونس تھی، تم ہمد م تھے، اب خیریت ہے۔ سدی ۵

زن دوست بود دے زمانے تاجز تو نیافت مہربانے
 چو در بر دیگرے نشیند خواہد کہ ترا درگہ نہ بیند
 مصرطہ ۵ آپ و زن شمشیر دفا دار کہ دید

ہر چند اُس نے مغز خالی کیا، یہ مقدمہ اس پر حالی کیا، وہ بے مغز نہ سمجھا۔
 مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے
 ناچار مجسٹن نے کہا۔ ”تم جب تک ذلت نہ اٹھاؤ گے، اور ہمیں خراب نہ کر دو گے، اس حرکت بیجا سے باز نہ آؤ گے، نہ چین لو گے۔“

اسی دن سامان سفر درست کیا، بہت سے جہاز مع اسباب اور چند مشیر خوش تدبیر ہمراہ لے، روانہ ہوا۔ چند روز میں وہ جزیرہ ملا، جہازوں کا لنگر ہوا۔ مجسٹن کا بیٹا اتر، مگر جہاں دیرانہ بوم و غول کا آشیانہ تھا، وہاں بستی دیکھی، اور جس جگہ بیٹھ تھا، اسے ہموار پایا، بلندی نظر آئی، نہ پستی دیکھی، آدمی ہر سمت سرگرم کار و بار، شہرِ نپاہ تیار۔ اسے تعجب ہوا، سمجھا کہ میں بھول گیا۔ کسی سے پوچھا ”اس شہر کا نام کیا ہے، والی ملک کون سا ہے۔“

وہ بولا ”مدت سے یہ ملک بہ سبب آفت آسمانی اجاڑ ہو گیا تھا۔ رعایا برایا، بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا، فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی، اب برس دن سے اُس نے شوہر کیا ہے، شہر از سر نو آباد ہوا، نیا طرز ایجاد ہوا، یہاں مفسد ہے نہ ڈنڈی ہے، نام اس کا شہزادی سنڈی ہے۔“
 مجسٹن نے یہ ماجرا سُن بیٹھے سے کہا ”خوش تو بہت ہوئے ہو گے، لویدھے پھر چلو۔“

اُس نے کہا ”اتنی سفر کی صعوبت اٹھائی، اس کی صورت بھی نظر نہ آئی، دو باتیں کروں

تو پھر چلوں۔“

مجسٹن نے کہا ”یہ مصیبت کچھ نہ تھی، جو بات کرنے میں ایذا اٹھے گی۔“

وہ کب مانتا تھا۔ انہیں لوگوں سے پھر پوچھا۔ "شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے۔"
وہ بولے "روز۔"

غرضکہ سواری کا وقت دریافت کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر سر راہ کھڑا ہوا کہ شہزادی ٹہنیز کو ہمیز کرتی آپہنچی۔ یہ پکارا "ہم نے ایسے وعدہ کیا حاضر ہوئے اور لڑکا بھی فضل الہی سے سلامت موجود ہے کیا ارشاد ہوتا ہے۔"

اس نے بیگانہ دار جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے، گھورا مگر جواب کچھ نہ دیا، چلی گئی۔ یہ خفیف گھر پھرا۔ محبسن نے حال پوچھا، بولا "ملاقات نہ ہوئی، کل پھر جاؤں گا۔"
اس نے کہا "صبح کا جانا روزِ الم شامِ غم دکھائے گا، بہت بچھٹائے گا۔"

اس نے دوسرے روز بیٹے کو سکھایا کہ جب سواری قریب آئے گھوڑے سے ہٹ جانا اور یہ زبان پر لانا کہ "دنیا کا لہو سفید ہو گیا، مہر مادی سے محبتِ پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ بہ آرام تمام لئے پھرتا ہے۔ تم بات بھی نہیں پوچھتی ہو، بلکہ پہچانتی نہیں۔"

جس دم سواری قریب آئی تو یہ بہت جلاتھا اور سمجھ چکا تھا کھیل بگڑ گیا، کہا "شہزادی باگ کو رد کو وہ خود تو رکی تھی باگ بھی رک گئی۔ پسر محبسن بولا۔ مولف

یاد ایام کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے
بید صرطک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا
کبھی چوٹی کی خبر تھی، نہ تھا کنگھی کا خیال
پان کے لاکھے سے اور مستی سے ہوتا تھا ملال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم
تھی لگاؤ ہی تجھے یاد نہ خلطاسب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے
اب تو ٹپٹی میں کیا چھید غضب تو نے کیا
فکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں کیا کیجئے برائی تجھ سے
بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے

ہوئی دشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
مگر تھا یادِ اخیر تھی نہ بہانے سے تجھے
ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا
بارہا الجھے ہی رہتے تھے ترے سر کے بال
مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گذرا نہیں سال
دفعاً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم
گر محوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب سے
تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
کھل گیا سب پہ ترا بھید غضب تو نے کیا
اب تو تا حشر مکر رہے صفائی تجھ سے
نہ ملیں پر جو کسے ساری خدائی تجھ سے
خوش رہو تم کہ تمہیں کھول کے دل رد بیٹھے

اب قسم کھاتا ہوں لو دل نہ لگاؤں گا کبھی
 گر طر حصار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی
 موسم اب دل کے لگانے ہی کا جانا نہ رہا
 بر زبان یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار
 دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا انکار
 کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے
 ذلت درنج نہ اس طرح اٹھاؤں گا کبھی
 ربط تو کیا ہے نہ میں پاس بٹھاؤں گا کبھی
 ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانہ نہ رہا
 گو کھاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
 سرچنگ مر گئے سب پر نہ ملا وہ نہ ہمار
 بچ کرے بات کی عاشق تو بھلا ایسی کرے

یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی، پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا، یہ بیچارہ نادان باتوں کا سود و
 زیاں کچھ نہ سمجھا، جو کچھ کہ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا۔ جب کہ چکا، شہزادی نے پنچہ قبور
 سے کھینچ لڑکے پر بھونک دیا۔ وہ دھم سے گر پڑا، دائی اہل نے کنارہ عاطفت میں اٹھا،
 اہل قبور سے ملادیا، پھر باگ اٹھا چل نکلی۔ مجسٹن کے بیٹے نے بہت خاک اڑائی، بیٹے کی
 لاش باپ کو دکھائی۔ اس نے کہا "کیوں جو ہم نے کہا تھا، وہی آگے آیا۔"

وہ بد نصیب بولا۔ "صبح اختتام ہے، جو ہونا ہے ہو جائے گا۔"

مجسٹن نے کہا "تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا۔"

سحر دم جب وہ چلا، مجسٹن کا جی نہ رہ سکا۔ ساتھ ہوا، جس دم شہزادی کی سواری
 پاس آئی باگ پکڑ لی، ہنوز زبان نہ ہلائی تھی، شہزادی نے کہا "اے مجسٹن! ہم نے سنا تھا
 کہ تو مرد جہاں دیدہ و سرد و گرم روزگار حشیدہ، بحر بہ رسیدہ ہے، مگر افسوس بہ! میں ریش و
 فاش، تو نے سنا نہیں۔ لا اعلم"

زحافات جہاں بس ہیں پسند آمد کہ خوب و زشت بد و نیک در گذر دیدم
 اس پیرانہ سالی میں تجھ پر ہزار سانچے گذرے ہوں گے، کچھ الم و رنج کا مزا یا فرحت
 خوشی کا نشہ باقی ہے، اے نادان دنیا میں کس کس بات کو یاد کیجئے، کس کا غم، کس سے خاطر
 شاد کیجئے، اگر عقل رسا یا کچھ فہم و ذکا ہو تو دنیا میں کافی ہے یہ بات، گذشتہ راصلوات۔
 مصحفی ۷

اے مصحفی میں روؤں کیا پھیلی صحبتوں کو بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا چھپکارا کہ پھر سلسلہ جنبانی اس امر بے معنی کی موجب مضرت جاں جاننا۔
 مجسٹن نے بیٹے کو سلام کیا اور کچھ کلام کیا، وہ بھی نطفہ ضعیف کا پیدا، بوڑھے باپ کا بیٹا

تھا، محبوب دہن پھرا، جیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

پھر اس انگریز نے کہا: ”مطلب اس حکایت سے یہ ہے کہ آدمی وہ بات نہ کرے، جس کا حصول ذلت و خفت ہو، کہو اب کیا کہتے ہو؟“

یہ قصہ سن کر وہ فریاد بے ستون، عشق شیریں زبانی سے یہ کہنے لگا۔ بقول استاد سے

کب تلک جیوں گا میں موت اک دن آنی ہے ہجر میں جو آجادے عین مسربانی ہے

سب جلتے سریشک کر اٹھ کھڑا ہوا کہا ”جب یہ جان گنوائے گا۔ تب جھگڑا جائے گا؟“

آخر کار جب اس کا حال ردی ہوا، دوستوں کو چٹھیاں لکھ کر جمع کیا۔ کل اس مقام سے

ہمارا کوچ ہے۔ اگر ہماری وصیت بجا لاؤ گے، دنیا میں نام حشر کو بخیر انجام ہوگا۔“

سب نے قبول کیا۔ اس نے کہا ”بعد انتقال روح، ہمارا جنازہ تکلف کا بنا کر بھرے کی

چھت پر صندوق میں فحش و حر، باجے بجاتے، ہمارے مشوق کی کوٹلی جو لب دریا ہے، اس کے

نیچے سے لے جانا اور دل میں یہ تھا۔ استاد سے

ساتھ وہ میرے جنازے کے لحد تک آئے اسے اجل تیرا قدم مجھ کو مبارک ہووے

غرض کہ رات کو اُس مریضِ فرقت کا، ہجر میں وصال ہوا، اس جہاں سے انتقال ہوا۔ گویا

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وصال یہ اگر سچ ہے تو مرجاتے ہیں ہم

مولف

مر کے حاصل کیا فرقت ہی میں لو نام وصال جاں دی ہم نے مٹایا ہے خلش ہجران کا

صبح کو یہ خبر عام ہوئی کہ سوداگر بچے کے عاشقِ محروم ناکام کا کام تمام ہوا، مر گیا۔ شدہ شدہ

سوداگر کو اور اُس ماہ بیکہ کو، یہ حال معلوم ہوا، جذبِ محبت سے جالِ تغیر ہوا، مگر ضبط سے کام لیا،

دلِ بیقرار کو تھام لیا، انگریز جمع ہو، بصد پریشانی وصیت بجا لائے، جنازہ درست کر، بھرے کی چھت

پر دھر، لباس سب نے سیاہ کیا، بلند نالہ دآہ کیا، سرنگے باجے بجاتے چلے، عجب سانحہ تھا۔ ہزار ہا

زن و مرد کنارے کنارے گریاں چلا آتا تھا جس نے صندوق کی طرف دیکھا، فریاد مچاتا تھا،

اُسی دن سے دریا دریا اشک، ہر بھر کی چشم سے رداں ہے۔ مثلِ سیلاب بے قرارانہ دداں ہے۔ اور

جسے اجاب جاب کہتے ہیں، یہ فرط قلق سے ہر محیط کی چھاتی میں، پھیمولا پڑتا ہے اور پھوٹتا

ہے، موجوں سے تلاطم نہیں چھوٹتا ہے، ماہیانِ دریا کا خیرِ الم سے حشر یعنی گلا زخم دار ہے،

سناں غم سینہ کے پار ہے۔ ساکنانِ دریا کو بسکہ شمشیرِ عشق کا خوف و خطر ہے، اس ڈر سے

ہر سنگِ پشت کی پیٹھ پر سپر ہے ۔

خلاصہ یہ کہ اسی صورت سے جنازہ اس کی کوٹھی تلے آیا، اور صندوق سے اُس زندہ

جادید نے بہ آواز بلند سنایا، استاد سے

اے فلکِ آخری پھیرا ہے نہ ہو تجھ سے گراور اُس کے کوچے میں جنازہ مرا سنگین تو ہو

اُسی وقت وہ نہ پارا، کششِ دل اور طیشِ متصل سے مطلع ہو، دیوانہ وار بیقرار کوٹھے

پر چڑھی اور بیتا بانہ پوچھا کہ ”یہ لاشِ دھڑاش، کس جگرِ پاش پاش کی ہے، کہ صاحبانِ بارگاہِ عشق

سے صدائے دورِ باش، دورِ باش کی ہے“

وہ بولے کہ ”یہ کشتہ تمھارا ہے۔ رنجِ مفارقت نے آپ کے اسے مارا ہے، افسوس کہ

اس بکس نے جان دی، اور تم کو مطلقِ خبر نہ ہوئی“

کسی شخص نے عمداً اسے سنا کہ یہ شعر پڑھا جرات سے

مگر جانے کا قاتل نے نہ لادھب نکالا ہے سمجھوں سے پوچھتا ہے کس نے اس کو مار ڈالا ہے

یہ سنتے ہی وہ نعرہٴ جانور، آہِ دلہوز، سینہٴ بریاں سے کھینچ کر کود پڑی، عشق کا نشانہ

دیکھئے، صندوقِ نفش پر گر کر مڑے مڑے مثلِ جگرِ عاشق زار ہو، خوابِ مرگ میں سو بختِ خفتہ

عاشق جگایا، کششِ محبت نے بچھڑوں کو اس طرح ملایا، دیکھنے والے تھرا گئے، دلگدازوں کو عشق

آگئے۔ شہر میں یہ چمچا گھر گھر ہوا، منزلوں یہ اخبارِ شہر ہوا۔ اس کے ماں باپ نے بہت سی خاک

سر پر اڑا، دونوں کو پیوندِ زمین کیا۔ اس عشقِ فتنہ انگیز نے کیا کیا نہیں کیا، تہہ خاک ہجر کے ماروں

کو، بیقراروں کو قرار آیا، ہزار ہا شخص دیکھنے کو، سہرِ مزار آیا۔ مطابق توں میر تقی سے

حیرتِ کارِ عشق سے مردم غفلِ تصویرِ آپ میں تھے، گم

کام میں اپنے عشق پکا ہے ہاں یہ نیرنگ سا دیکھا ہے

جس کو ہو التفات اس کے نصیب ہے وہ سہماں چند روزِ عزیز

ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

کون محرومِ دصل یاں سے گیا کہ نہ یار اس کا اس جہاں سے گیا

پھر یہاں سے خامہٴ مصیبت نگار حالِ ملکہ زار لکھتا ہے کہ آخر کار جی بہ تنگ ہوا، تپ

دوری سے یہ ڈھنگ ہوا۔ استاد سے

لگے زمین پر اب سب اتارنے ہم کو یہ دن دکھائے ترے انتظار نے ہم کو

فراق میں ترے بن موت اب تو مارا ہے تڑپ تڑپ کے دل بیقرار نے ہم کو
جب اپنا آہ دم نزع کمنٹھ بیٹھ گیا تم آئے بالیں پہ اُس دم پکارنے ہم کو
صبح سے تا شام، ٹٹکی جانبِ در، دستِ تاست بر سر، اور ہر دم یہ کلمہ زبان پر

استاد سے

ز بسکہ رہتا ہے آنے کا اس کے دھیان لگا صدائے در پہ ہے در پر وہ اپنا کان لگا
بیاد زلف نہ تا دُورِ آہ سب پہ کھٹکے میں منہ پہ اس لئے رہتا ہوں بیچوان لگا
ہزار خوار ہوئے تجھ سے عندلیب یہاں یہ بے ثبات چمن ہے نہ آشیان لگا
آخر کثرتِ انتظار سے، نظر کمی کرنے لگی، اور جانِ زار تڑپنے سے، دل بیقرار کے
برہمی کرنے لگی یہ ذبت آئی ہے

گئے دن ٹٹکی کے باندھنے کے اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پر بند
اس وقت کششِ محبت، ملکہ مہر نگار نے، جانِ عالم کے دل کو بیچین کیا، خیال آیا
کہ خدا جانے صدہ فرقت سے اس کا کیا حال ہوگا، دل نے کہا جینا و بال ہوگا۔ گھبرا کہ
دستِ پاچہ ہوا، عیش و نشاط بھولا، یہ تازہ گل پھولا، انجمنِ آرا سے کہا: "زیادہ طاقت
مفارقتِ احبابِ وطن مجھ خستہ تن کو نہیں، آج بادشاہ سے رخصت خواہ ہوں گا۔" بہر حال
اطاعت اور رضا اس کی جمیع امور پر مقدم جانتی تھی، کہا: "مجھے بھی تنائے میر کوہ و بیابان،
بے بیاں ہے۔" شہزادہ موافق معمول دربار میں حاضر ہوا اور سلسلہ سخن بہ طلبِ رخصتِ وطن
کھولا، بادشاہ محزون و غمناک ہو، فرمانے لگا: "یہ کیا کہا جو کلیجہ منہ کو آنے لگا، جانِ من تاب
جدائی نہیں، رخصتِ بادیہ پیمائی نہیں، اگر خواہش سیر ہے، تو فضا اس نواح کی جا بجا مشہور
ہے۔ خزانہ موجود، فوج فرمانبردار، ملک حاضر، جو منظور ہے۔"

جانِ عالم نے دستِ بستہ عرض کی: "اے شہریار! بادشاہ پُر تمکین برس دن میں حضور
کو مجھ نعلین سے یہ محبت ہوئی کہ مال و ملک سلطنت، بلکہ جانِ تک سے دریغ نہیں، دائے
بر حالِ مادرِ پدر سوختہ جگر جنھوں نے لاکھوں منتوں، کہ دڑ مرادوں سے، دن کو دن، نہ رات کو
رات، جانِ کر سولہ سترہ برس دنیا کی خاک چھان کر، مجھ کو پالا، دیولہ طبیعت نے گھر سے نکالا،
اب مدتِ مدید، عرصہ بعید گزرا، انھیں میرے مرنے جینے کا حال معلوم
نہیں، ان کے صدمے کو غور کیجئے، رخصت بہر طور کیجئے، آدمیت سے

بعید ہے، آپ عیش و نشاط کرے، ماں باپ کو رنج و تعب میں چھوڑ دے، امیدوار ہوں۔
 اس امر میں حضور در کد نہ کریں، بلکہ شادہ پیشانی اجازتِ وطن دیں، اگر حیاتِ مستعار، زلیلت
 ناپائدار باقی ہے، پھر شرفِ آستان بوس حاصل کروں گا، نہیں تو اس فکر میں گھٹ گھٹ
 کے مروں گا۔ دین برباد ہوگا، دنیا میں عزت آبرو نہ رہے گی، خدا ناخوش ہوگا، خلقت تن پرور،
 راحت طلب کسے گی۔“

بادشاہ سمجھا یہ اب نہ رکے گا، آنسو آنکھوں میں بھر کر کہا ”خیر بابا مرضی خدا، جو تیری رضا،
 مگر تیاری سامانِ سفر کو چالیس دن کی مہلت چاہئے۔“
 جان عالم نے یہ بات قبول کی، یہ تو زحمت ہو کر گھر آیا۔ خبرداروں نے اس حال کا خاص و عام
 میں چرچا مچایا۔ خلاصہ یہ کہ شدہ شدہ، یہ غلغلہ گھر گھر ہوا۔ خورد و کلاں بوڑھا، اور جوان شہر کا
 اس خبر سے باخبر ہوا۔

عزم جانعام زرنگار سے سوئے وطن،

تیاری سامان رخصت انجن آرا کی عزیزا قربا سے فرقت اور پونچنا ملکہ پاس،

پھر نکاح کرنا —

چل اے تو سن خامہ چالاک وچیت کہ اب بیٹھے بیٹھے بہت جی ہے سست
جگہ بیٹھ رہنے کی دنیا نہیں یہاں خاک بیٹھے کوئی دل حزیں
سفر ہر نفس سب کو رہتا ہے یاں سرائے فنا بھی عجب ہے مکاں
نہ بیٹھا کبھی جم کے اک جا سرور قریبوں سے اپنے رہا دور دور
طے کنندگان ملک معانی، و سیاحانِ اقلیم خوش بیانی، بادیہ پیا یانِ بے توشہ، باہرِ محبت
بر سر راہ نور دان ہوش باختم، بے راہ بر، یادِ دلدار دردِ دل، دین و دنیا، فراموشِ الم ہمراہ
ہر گام نالہ و آہ، تصویرِ یار ہم آغوش، لکھتے ہیں کہ اس عازمِ سمتِ معشوق، عاشقِ خصال، کو چلے
وہیں گذرا، سامانِ سفر تیار ہوا، اب صبح کو اُس چلے نشینِ حجرہٴ محبت کی رخصت ٹھہری، سرشام
بادلِ ناکام، بادشاہِ دامنِ سحر کی صورت گر بیاں چاک کر، مع ارکانِ سلطنت، دو کوس شہر
سے باہر، سر راہِ دامنِ کوہ پر جا بیٹھا، وزیرِ خوش تدبیر سے فرمایا کہ "تم شہزادے کو رخصت
کرو، ہم یہاں سے جلوس، سواری، سامانِ سفر دیکھ لیں گے، یہ خبر اہل شہر کو معلوم ہوئی تمام

خلقت پانچ برس کا لڑکا، پچانوے برس کا بوڑھا، رنڈی مرد، دوسرے ٹیکرے پر اسی دم جمع ہوا۔ جھپٹے وقت جان عالم نے سواری طلب کی، ہرکاروں نے حضور میں عرض کی۔ بادشاہ راہ کی طرف متوجہ ہوا، روشنی نمود ہوئی، پلٹیں آئیں، سبھی سجائیں، تو پچانہ گذرا، پھر بارہ ہزار ہاتھی سواری کا، ہودج و عماری کا، ہزار بارہ سو جنگی گاڑہ مست، ایک سے ایک زبردست، چاروں بھٹیاں ٹپکتیں، بان، پٹے، سونڈوں، میں چڑھے، بھسونڈے رنگے، طلائی، نقرئی، زنجیریں کھنکیتیں، جھولیں زربفت کی، نئے نئے ریسے، کلابتوں کے سکیلیں، جڑاؤ مغرق گجکا ہیں پڑیں۔ دو رویہ اس انداز کی کہ اگر اصحابِ نیل، انہیں دیکھتے خوت کھاتے، کبھی کعبہ ڈھانے نہ آتے فیلبان زربفت کی قبایا کمخواب کی پہنے، جوڑیدار پگڑیاں باندھے، کمر میں پیش قبض یا کٹار، ہاتھوں میں گجباگ، جواہر نگار، مستوں کے ساتھ، دو بوڑے بردار، ایک چمکٹا سنڈا، ہاتھ میں ڈنڈا، دو برہمنی والے، دیکھے بھائے، آگے نہ پیچھے تریں قریب، سانٹھ مار۔ برابر دو سوار، پھر کئی لاکھ سواروں کے پرے، ہاتھوں سے پرے پرے، سرتاپا، لوہے کے دریا میں ڈوبے، میں اکیس برس کا ہر شخص کا سن، شباب کی راتیں، جوانی کے دن، خود بکتر زرہ پہنے، بائیں دہنے چار آئینہ، فولادی میں ہر دم روئے مرگ معائنہ کرتے، ہاتھوں میں داستانے، خانہ جنگوں کے بانے، دولواریں، ایک قاش زین میں، دوسری ڈاب میں۔ تینچے کی جوڑیاں قبور میں، نشا بہادری سے سرور میں۔ کمر میں قزوی، یا کٹار آبدار، سپر پشت پر، برچھا ہاتھ میں، تیکھاپن ہر بات میں، مثل ننگان بحر ہیجا و شیران گنام دغا، مونچھوں کو تاؤ دیتے، ہر بار نوک کی لیتے، گھوڑے وہ خوش خرام کہ سمند سبز فام، جس کا قدم دیکھ کر آج تک چال بھولا ہے۔ دیکھنے والے کہتے تھے، چمن رداں کیا پھلا بھولا ہے، دو صفیں باندھے ہوئے، بیچ میں پنج شاخے روشن، گھوڑے کداتے، جو بن دکھاتے، چلے گئے۔ پھر ہزار بارہ سو سانڈی سوار، خوش رفتار، زرد زرد قبائیں، دربر سرخ پگڑیاں سر پہ، آبی بانات کے پاجامے پاؤں میں، ہتھیار لگائے، مہاریں اٹھائے، ستاروں کی چھاؤں میں، سانڈیوں میں دو دو سو کوس کا دم، ہر قدم گھنگھرد کی جھم جھم، بختی فلک اب تک بلیلاتا ہے، جب ان کا دھیان آتا ہے، قدم قدم پر جب بڑھے، تو سواری کے خاصے نظر آئے، عربی، ترکی، تازی، عراقی، یعنی ادھر کا ٹھیا داڑ کا دکھتی، وہ وہ گھوڑا جو ابلت لیل دہار کی نظر سے نہیں گذرا، ہڈانہ موترانہ رس کا خلل، ڈنگ اجاڑ، نہ کھوٹا اکھاڑ، سانپن نہ ناگن، عقرب نہ ارجل، شب کو نہیں، منہ زور نہیں، کم خور، نہ مٹھانہ کھوٹا، بال بھورے

سے صاف، حشری، کمری، کمنہ لنگ نہیں، سینہ تنگ نہیں، ہمہ تن اوصاف، کسی پر جہڑاؤ دین
 بندھا، کسی پر چار جامہ، دوال کو کسا، کسی کی فقط گردنی الٹی گنڈہ، پیٹھ ساز، یراق جو اہرنگار،
 پوزی دمچی، طرحدار کلفی لگی، پاکھر پٹکلف، پٹھوں پر پڑی، دو گاما گام، شہ گام، یرغہ ایسیہ لہوا
 دُلکی کو مینجا ایل کرتا، جلودار، چنور لئے مشغول، مگس رانی میں ہمرکاب تپائی بردار، معقول سرگرم
 جانفشان میں۔ باگ ڈوریں، پُر زور سائیں لے کر نکلے، اُن کے بعد نوبت نشان، ماہی مراتب،
 علم اژدہا پیکر، جلو میں نصرت و ظفر، بڑا جلوس، نہایت کر و فر آیا، نوبت کی ندا، جھابجھ کی
 جھابجھ سے صدا، قرنا کا شور و غل، شہنا میں بھیروں بھباس کے سُر بالکل۔ نقیب اور
 چوہداروں کی آواز پر سوز و گداز، عجب کیفیت کا عالم تھا، اور ہر نقار لئے شہری اور فیلی
 سے گوش کر دے بیان کر ہوا جاتا تھا۔ ایک طرف شہر کے لڑکوں کا غول، بچا دے، بچا دے،
 کا غل مچاتا چلا آتا تھا۔ میر سوز ۵

کے تو مہر دم لے کر عصائے نور ہاتھوں میں یہی کہتے تھے گر دوں پر ادب سے اور تفاد سے
 پھر شکار کا سامان، میر شکار لائے، باز آہنی چنگال، تیز بال، بحری با شے، شاہین
 عقاب، فلک سیر، جہاں کے طیر، ان کے قریب تازی، ولایتی کتے، بودار گلڈانک تازی،
 جان بازی کرنے والے۔ چیتے جو دشمنوں کا بُرا چیتے بلکہ لو پیتے، سیاہ گوش در آغوش، ہرن
 لڑنے والے، خانہ زاد گھر کے پالے، اُن کے بعد ہزار ہا سقہ، خواجہ خضر کا دم بھرتا، چھڑکاؤ
 کرتا، کمر میں کھاروے کی تنگیاں، شاؤں پر باد لے کی جھنڈیاں، مشکوں میں بید مشک بھرا دہانے
 میں ہزارے کا فوارہ چڑھا، متعدد غلام بادل پوش، حلقہ بگوش، ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے
 پڑے، منقل انگلیٹھیاں، سونے چاندی کے لئے عنبر و عود جھونکتے نکلے۔ پھر تو کوسوں تک
 جنگل رشکِ قن و تاتار، مثل طبلہ عطار ہو گیا۔ ان کے متصل دو ہزار لالٹینیں والے،
 کسن، بلور کی صاف صاف شفاف لالٹینیں لئے، شمع مومی دکا فوری، روشن کئے، وہ سب
 غنچہ دہن، زیب انجن بڑھے، پھر صدائے اہتمام نقیبان خوش گلو چار سو بلند ہوئی اور صبح
 صادق نے جلوہ دکھایا، ہاتھ کو ہاتھ نظر آیا۔ شاہِ خاور بھی دریچہ مشرق سے سرنگاں، مشغول
 نظارہ ہوا، حسرت میں وطن آوارہ ہوا۔ دم سحر، نیم و صبا کی فرز، شمع کا جھللا جھللا اداس
 چلنا، سواری کا آہستہ آہستہ چلنا، پہاڑی جانوروں کی سیر، ذکرِ حق میں دُش و طیر، سرسبز درخت
 لہلہ پھول، رنگ برنگ کے ڈھٹھے، سقوں کی آب پاشی، صدائے نالہ مرغانِ خوش الحان

سے دلخراشی، خسرو انجم کا مع ثبات و سیارہ چھپتے جانا، سورج کی کرن کا جلگنا، پتھروں کی
 بو باس، چشمہ سرد و شیریں، آس پاس۔ خلق کا مجمع، دامنِ کوہ پر سب کی نگاہ، کبھی اس
 کیفیت پر، گاہ اُس انبوہ پر، ادھر مسافروں کی کثرت، ادھر بادشاہ پُر ارمان، خلقِ خدا باحسرت۔
 بچشم انتظار، امیدوار آمدِ پیادہ و سوار، و تماشاے عجیب روزگار تھے۔ یکایک غولِ خاص
 برداروں کا آیا۔ کمخواب کی مرزائی، انگڑھے گجراتی، مشرورع کے گھٹنے، دلی کی ناگوری پاؤں
 میں، سر پر گلزار اینٹھے، طرحدار خاصوں کے غلاف، بانائی سقر لاتی، باغ و بہار۔ گرد پوش،
 ململ کے سینگرے، ساز مٹلا، جھلا بھل کے۔ رفل، چھاق توڑے دار۔ قرابین، شیر بچے
 جس سے شیر زندہ نہ بچے، جواہر نگار اور برہمی دار، یکے بیش قرار درما ہے دار، راکب و مرکب
 جھکڑے کا عالم۔ گردا گرد بیچ میں شہزادہ جان عالم، اسپ باد رفتار پر سوار، برابر انجن اُدا
 کا سکھپال، پری تمثال، ہزار پانچو کہاریاں، پیاری پیاریاں، کمرن جسم گدرا یا شباب چھایا۔
 نہ بنت و اطلس کے لنگے، مسالہ مکا مل کے دوپٹے، باریک بنت گولہرو کی کڑی، انگیا کاشانی
 منجلی کی کرتیاں کندھوں پر سکھپال کے برابر کچھ اٹھائے، باقی پر جا جائے۔ کچھ ادھر کچھ ادھر۔
 جھلکڑے، ملائم ہاتھوں میں پڑے۔ پاؤں میں سونے کے تین تین جھڑے، کانوں میں سادی
 سادی بایاں، نشہ حسن میں متوایاں۔ کسی کا کان جو آلا تھا تو حسن کی دوکان میں ناز و انداز کا
 نرخ دو بالا تھا۔ اندازِ ناز نہ آلا تھا۔ وہ آہستہ توری چڑھا کے پاؤں رکھنا، کبھی سسکی جھبکی،
 بڑی سیر بھتی، کٹی سو سواری کا دوڑنے والا خواجہ سرا۔ عجیب عجیب طرح کا نکلنا، جھنیں رکنیں
 سر گرم اہتمام، خواجہ سرا یان ذی لیاقت معقول، گھوڑوں پر سوار، بند و بست میں مشغول، حریب
 زمین میں پڑتی، کوس کا پیہہ ساتھ، زمین کی پیمائش، سواری کی آرائش، بڑا تزک، بہ مرتبہ کرد فر
 نہایت دھوم دھام، بادشاہ کے پاس آپہنچے۔

جان عالم نے دیکھا نعلِ سبحانی کے چشمہ چشم سے جوئے خون جاری، ہچکی لگی، بقراری طاری،
 گھوڑے سے کود کر تسلیات بجا لایا۔

بادشاہ نے بہ قسم فرمایا۔ "اس وقت ہمارے پاس نہ آؤ، خدا کو سوچنا، چلے جاؤ۔"
 مجبوراً شہزادہ مجرا کر سوار ہوا، جس دم جان عالم نے گھوڑا بڑھایا، تمام خلعت کاہلی بھر
 آیا۔ علی الخصوص بادشاہ کی بقراری، جان عالم اور انجن آرائی گریہ و زاری دیکھ کر، تمام تماشا
 داد بلا مچا کہنے لگے۔ "آج رونق شہر کی رخصت ہے۔ زینتِ سلطنت کی فرقت ہے، ایسے

مہر و ماہ کے جانے سے شہر میں غم پڑے گا، اندھیر ہو جائے گا۔ ان کا الم جدائی و رنج و دشت
پیمائی، ہزار روزیہ شام غم دکھائے گا۔

کہتے ہیں کہ سیکڑوں مرد، زندگی، بے کسے شے ہمراہ ہوئے، غریب الوطنی اختیار کی،
وہاں بود و باش گوارا نہ ہوئی۔ ان کے بعد چھ سات سو پانچ، نالکی چندوں، محافہ امیر رادیوں
کا، اور انیسویں جلیسوں کی، تین چار سو کھڑکھڑایا اور فتنہ پیش خدمتوں کا دو تین سو میانہ، چوہپلا
مغلانی، آتون محلہ اردوں کا، ہزار نو سو تھہ اکبر آبادی، دو برجے سائبان دار، نئے مغزق پردے
چمکتے ناگوری بل جو ڈور فلک نے نہ دیکھے تھے، جتنے آتا، چھو چھو، چمٹھی نوٹس، باریدار، لوندیاں،
باندیاں، سوار، یہ بھی قطار قطار گزر گئے۔ چمکڑے اونٹ ہاتھی خزانے اور اسباب کے ڈیرے
خیچے لدے لدائے کسے کسے، جکڑے نظر آئے۔ غرضکہ تا شام، بھیر بنگاہ بازاری، سرکاری،
سب لوگ چلے گئے۔ لکھا ہے کہ روپے اور اشرفیاں امام ضامن کی دم رخصت اتنی آئیں کہ
تمام راہ سید مسافروں نے پائیں اور کھجور کچھوں کا یہ حال ہوا کہ رات کے سوا ہاتھیوں کو کچھے
ملے اور اہل شکر کو بانٹ دیئے، کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راہ میں پھینک دیں، وہ اگیں اسکے
درخت اُگے، کم تھے، اس دن سے جنگل ہو گئے۔ اس وقت بادشاہ سراسیمہ، بدحواس با حال یاس
دولت سرا میں آیا، وہ بسا بسا شہر لٹا اُجڑا ویران نظر آیا، بازار میں جا بجا چراغ گل، سرشام
پگڑی غائب، اندھیرا بالکل جس طرف دیکھا لوگ تھکے ماندے پھر کہ پڑے تھے۔ بازار میں تھکے
لگے، ٹھٹھڑے تھے۔ لوگ سوزِ مفارقت سے درد مند، دوکانیں بند، جو جہاں پڑا تھا، شہزادے
کی رخصت کا ذکر کہ رہا تھا۔ وہ شخص اگر باہم تھے، بادل پر غم تھے کوئی سوتا تھا، کوئی چپکا پڑا
روتا تھا، بستی سنان، بازار میں سناٹا، خلق خدا اندوہ کی مبتلا، بادشاہ کو دنا قلع ہوا،
رنگ فق ہوا، مجلسرا میں آیا، وہاں بھی چھوٹے بڑے کو غمگین پایا۔ لوگوں کے عزیز جدا ہو گئے۔
سب اس یوسف رفتہ کے زندانِ فراق میں اسیر بلا ہو گئے۔ علی الخصوص انجن آرا کی ماں جس کی
نظر سے وہ چاند سورج چھپ گئے، زمانہ آنکھ میں تیرہ دتار، دل غم سے خار خار حیرت میں
نقش دیوار ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر زور تھا، رو رہی تھی۔ بادشاہ نے سمجھایا، ہاتھ منہ دھلویا،
کچھ کھلایا۔

یہ تو سب نالہ لب آہ درد دل، جان عالم اور انجن آرا درد بمنزل پانچ پانچ کوس کا
کوچ، چار دن کے بعد ایک دو مقام براحت و آرام کرتے چلے، فوج نظربوج ساتھ اردو

معلیٰ کا عجب عالم تھا۔ ایک شہر روزِ ہمراہ۔ جہان کی نعمت تیار، شام و پگاہ، صراف بزاز،
 جوہری۔ روبیہ پیسہ اشرفی، کھرے سے کھری۔ ڈھاکے کا ریزہ، بنارس کا گلبدن، گجرات کا کھوپا،
 الماس زمرہ یا قوت، احمر جو چاہو سولو، ایک طرف قصاب اور نانپائی کی پکائی لئے ہوئے، میوہ
 فروش، خانہ بدوش، حلوائی مٹھائی درست کئے، مینا بازار، باغ و بہار، جدا جدا، ہر گنج کا جھنڈا
 گڑا، چوڑے کا بازار پڑا، جلو خانے کے رو برو نصف گزرے تک دوکانیں کھلیں۔ اکاسی دیا جلتا،
 بھولا، بچھڑا، اس کی روشنی میں آملتا، کوتوال سرگرم پاسبانی۔ بازار یوں کی نگہبانی، زرنگاروند
 میں پھینکتا۔

غرض کہ سب خرم و شادان رواں تھے مگر جان عالم جذبِ محبتِ ملکہ سے کبھی یہ کہتا
 تھا شعر

بہ سامان سفر با خود دلِ رنجیدہ دارم
 بکف چیزیکہ دارم دامنِ برچیدہ دارم

دردِ شکر فیروزی اثر دیارِ ملکہ مہر نگار میں

بیر مرد کی ملاقات، اور انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کی دوبدو گفتگو، پھر جانِ عالم کا نکاح، بعدِ نصرتِ بصد شوکت و حشمت

مشاطہ خامہ نے عروسِ دلفریبِ سخن کو بصدِ زیب و زینت، حجلہٴ بیان میں اس طرح گویا کیا ہے کہ جس روز دردِ شکر فیروزی اثر، ملکہ مہر نگار کے باغ سے قریب ہوا، خبرداروں نے یہ مژدہٴ جاں بخش فوراً ملکہ کو پہنچایا کہ ”مبارک ہو، شہزادہ تشریف لایا“
 بسکہ غمِ مفارقت سے تاب و طاقت طاق تھی، سننے ہی غش آیا۔ پھر سنبھل کر فرمایا، بختِ خفہ کب بیدار ہوتا ہے، ایسا پاؤں پھیلائے سوتا ہے اور جو میرا دل بہلانے کو یہ کہتے ہو تو سن لو۔ مولف ۛ

تفریحِ کلفتوں کی ترغیب ہے لا حاصل بہلانے کی باتیں ہیں یہ دل بھی بہلتے ہیں
 چندے جو یہی یل و نہار ہے، تو قصہٴ فیصلہ ہے، تدبیرِ خلافِ تقدیر سراسر بیکار ہے۔
 مولف ۛ

گہ اس کے ہجر میں یونہی اندوہ گیں رہے تو ہونے کا دصال ولا یہ یقین رہے
 ہے احتیاط شرط کہ اس چشمِ تر پہ آہ دامن رہے رہے نہ رہے آستیں رہے
 مدفن کا اپنے ہم کو تردد ہو کس لئے کوچہ کی یترے یارِ سلامت زمیں رہے

تو گلشنِ دصال کی کر سیر عندلیب
ہم خرمنِ فراق کے بس خوشہ چین رہے
جو جو کہ انتخاب تھے صفحے پہ دہر کے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشان بھی نہیں رہے
کس کی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے
پھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اس کا اے سرور
دم بھرتے ہم اسی کا دم واپس رہے
اس عرصے میں، وہی خواص، دل آرام، بارہ دری سے نیچے اُتری پھر کہا: "خدا جانے
کہاں سے یہ شکر اتر رہا ہے۔"

ملکہ ہنس کر، بھیلہ سیر خواصوں کے کندھوں پر ہاتھ دھر، ٹھنڈی سانس بھر کر ٹھٹھے بد
چڑھی، دیکھا تو فی الحقیقت لشکرِ بے پایاں، سپاہِ فراواں ہے، خیام شاہی، استادہ ہیں، پھرتے،
چلتے، سوار اور پیادہ ہیں۔

یہ ایک شہزادہ جالِ عالم بچند سوار، اس پر صرصر خرام، رخسِ تیز گام پر سوار نظر آیا،
یا تو اُسے پُچا کچھا، منزلوں کا مارا، دشتِ غربت کا آوارہ دیکھا تھا، اب چم و خم، جاہ و حشم
سے پایا، بدن تھرا آیا، اعضا اعضا میں رعشہ ہوا۔ یہ زور تماشا ہوا۔ استادہ

آتے ہی ترے چھٹتا ہے رعشہ سا بدن میں ہر چند کہ ہیں بیٹھتے ہر لحظہ سنبھل ہم
وہ زردی چہرہ پر غم، مرزدہ وصل کی سُرخ سے بدل گئی، غش سے سنبھل گئی۔ شہزادہ
گھوڑے سے اتر سیدھا ملکہ کے پاس گیا، رسمِ سلام بجا لایا۔ اس نے دعا خیر دے کر چھاتی
سے لگایا "للہ الحمد تمہیں بصحت و عافیت اللہ نے کامیاب دکھایا؟" پھر انجنِ آرا کی سواری
آئی تسلیم کی۔ پیر مرد نے فرمایا "شہزادی! فقیہ کے حال پر رحم کیا، اللہ بھلا کرے۔"
اس نے عرض کی کہ "کینز مدت سے حضور کی، صفت و شنا ظل سبحانی کی زبانی سنا
کرتی تھی، آج شہزادہ کی بدولت، سعادتِ آستانِ بوس حاصل ہوئی۔" دو گھڑی بیٹھی پھر
التماس کیا کہ "اگر اجازت دیجئے، ملکہ کی ملاقات سے سرور ہوں۔"

اس حق پرست نے فرمایا "اس کا پوچھنا کیا، بابا! بے تکلف، خانہ خانہ شما است۔"
جانِ عالم رخصت ہو خیمہ میں آیا۔ انجنِ آرا نے ملکہ کے مکان کا رستہ لیا۔ آنے کی خبر پشیر
ملکہ کو پہونچی تھی، سامان اس اجڑے مکان کا درست ہو چکا تھا، جب سواری اُتری، اب فرش
لینے آئی، فراتنی سلام کیا، اس نے گلے سے لگالیا۔ ملکہ ابدیدہ ہو کر بولی "تم نے مجھے محبوب کیا،
میں فقیہ کی بیٹی، تم شہزادی، ہر چند شاہ دگدا دونوں بندہ خدا ہیں، الا تمہارے قدم آنکھوں

پر رکھوں تو بجا ہے۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار حاصل ہوا ہے۔“

انجن آرا بولی ”ہم نے خوب کیا، رنڈی یہ چونچلے کی باتیں بیگانہ دار نہ کرتی، تو کیا ہوتا، اے صاحب! ہمارے تمہارے تو رشتہ، ہماری، سر رشتہ، برابری ہے اور حساب کی راہ سے پہلے تو سلامتی سے تمہیں ہو۔ سرکار کائنات میں ملا ہے، پہلے مزا آپ نے چکھا ہے، جو بن لوٹا ہے۔“

غرض کہ دو دو نوکیں ہو گئیں، پھر اختلاط حرف و حکایات، رمز و کنایہ، شب بھر رہے۔ جس وقت عروسِ شب نے مقنعہ مغرب میں منہ چھپایا اور نوشاہ، روزِ مشرق سے نکل آیا، انجن آرا جان عالم کے پاس آئی، دیر تک اخلاق و محبت، ملکہ کا مذکورہ کیا کی کہ اس صفت کی عورت آج تک دیکھی تھی۔ دوسرے دن جان عالم نے ملکہ کے باپ سے عرض کی، ’الکریماں ا وعد وفا‘۔ اُس سالکِ راہِ حق نے ارشاد کیا، ”ہم اس لائق کہاں ہیں“ لیکن مصرعہ شاہاں چہ عجب گریزِ زندگد ادا — تم قول کے پورے، اقرار کے سچے ہو، بسم اللہ اپنے زمرہ کینزوں میں، سرفراز کرو، شادی کا نام لینا منہ چڑانا ہے نہ اب وہ ہم ہیں نہ ہمارا زمانہ ہے۔“ آخر میں بطورِ شرع شریف ملکہ کا نکاح، جان عالم کے ساتھ ہوا۔ اب یہ معمول ہوا کہ ایک شب انجن آرا کی، دوسری رات ملکہ کی ملاقات ٹھہری، اور ان دونوں میں وہ راہ و رسم، محبت و الفت کی بڑھی کہ شہزادے کی عاشقی نظر سے گر گئی۔ نظری ہوئی اور سچ ہے جو طرفین سے نجیب الطرفین ہوتے ہیں، ان میں رشک و حسد، رینج و ملال، دخل نہیں پاتا، کٹی جلی ڈاہ، بغض، عداوت کچ بجتی، دانتا کلکل، روز کی تو تو میں میں چھوٹی امت پر ختم ہے، لاکھ طرح انھیں سمجھاؤ، نیش و فراز دکھاؤ، لیکن ان لوگوں سے بے جھوٹک جھانٹا نہیں رہا جاتا۔ دو دن ایک طرح پر صحبت برقرار نہیں آتی ہے۔ زندگی انسان کی تلخ ہو جاتی ہے۔ لاکھ طرح کا غم ہوتا ہے، ناک میں دم ہوتا ہے۔ مولف ۵

عشق میں طرفین سے الفت برابر چاہئے جو بدل بندہ ہو اس کو بندہ پر در چاہئے

داستان حیرت بیان رخصت جان عالم

پیر مرد کا عمل بتانا، چلتے وقت وزیر زادے کا مل جانا، انجن آرا کے میلان سے

شہزادے کو بندر بنانا، اس بیچارے کا ہزاروں مصیبت اٹھانا، پھر مع اخیر صحت پانا

مصیبت نگار و مصائب رستم
زمانے کے کچھ طرز لکھتا ہے یاں
مری بات یارو یہ کرنا یقتیں
جو یہ دوست ہیں ایسے دشمن کہیں
کیا امتحاں میں نے اکثر سرور

جگر چاک و مغموم میرا قلم
عجائب غرائب ہے یہ داستان
کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں
ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

قصہ کوتاہ 'چندے شہزادہ والا جاہ' وہاں رہا۔ ایک روز یہ سب عاشق و معشوق باہم
بیٹھے تھے۔ جان عالم نے کہا "ہمیں دطن پھوڑے، عزیزوں سے منہ موڑے، عرصہ ہوا، ہنوز دلی
دور ہے اب چلنا ضرور ہے!"

وہ دونوں نیک جو، رضا جو بولیں "بہت خوب۔"

اسی روز حرف رخصت، ملکہ کے باپ سے درمیان آیا۔ مرد انجام میں نے رد کنا مناسب
نہ جانا۔ سفر کی تیاری ہوئی۔ دم رخصت اس قدر مال و اسباب، نقد و جنس کی قسم سے شہزادے

کو ملا کہ انجن آرا کا جہیز بھول گیا اور وقتِ وداع پیر مرد نے بادلِ پُر دردِ جانِ عالم سے کہا ”فقر پاس کچھ نہ تھا جو پیش کرتا، مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں، جب امتحان ہوگا خزانہ، قارون سے زیادہ کام آوے گا۔ اگر احتیاط کر دو گے۔“

پھر چند فقرے تنہا لے جا کے بتا کے تاکید سے کہا ”اگر یہ مقدمہ حقیقی بھائی سے اظہار کر دو گے، یاد رکھو حضرت یوسف سے زیادہ صدمے سہو گے۔ زمانے کے اخوان الشیاطین پُر اذکیر آمادہ کیس ہیں۔ اسی سبب سے دنیا میں راز کھنا بُرا ہے، چپ رہنا بھلا ہے۔ یہ نکتہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے سب کو یاد ہے کہ دنیا میں برادرِ حقیقی دشمنِ مادرِ زاد ہے۔“

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی۔ بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادرِ ہودے پھر انجن آرا پاس آفرمایا ”شہزادی! فقیرِ زادتی کینز کو عزیزِ جان کر، نظرِ الطافِ دکرِ ہر دم رکھنا یہ بھی خدمتِ گزاری میں قصور نہ کرے گی، اسے تم کو سونپا، تمہیں حافظِ حقیقی کے سپرد کیا، لو خدا حافظ۔“ سواری دیر سے تیار تھی، لوگوں پر ثابت تھا کہ کوئی امر پوشیدہ درویش باوقار شہزادے پر بہ تکرار ظاہر کرتا ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ، اسی وزیرِ زادہ وزیرِ زادہ، جو دہن سے ساتھ نکل، ہرن کے پیچھے، گھوڑا پھینک، دشتِ ادبار میں شہزادے سے جدا ہوا تھا، سرگشتہ د پریشان پھرتا پھرتا، پیادہ پا، ادھر آنکلا، اس نے جو یہ لشکرِ جرّار اور قافلہ تیار دیکھا، پوچھا ”کس کی سواری ہے، کہاں کی تیاری ہے؟“

لوگوں نے تمام جانِ عالم کا قصہ سنایا۔ یہ خوش ہوا جی میں جی آیا، پوچھا ”شہزادہ کہاں ہے؟“ وہ بولے ”پیر مرد جو یہاں کا مالک ہے، فقیرِ سالک ہے، کچھ کہنے کو تنہا جدا لے گیا ہے۔“ اس عرصے میں جانِ عالم رخصت ہو سوار ہوا۔ وزیرِ زادے نے دوڑ کر مجرّا کیا شہزادے نے گھوڑے سے کود کے گھٹے لگایا۔ دیر تک نہ چھوڑا۔ اسی دم لباسِ فاخرہ پہنا، ہمراہ سوار کیا، راہ میں سرگذشتِ تفرقہ پوچھتا کہتا چلا، جب خیمہ میں داخل ہوا، وزیرِ زادے کو مجلسِ امین طلب کیا۔ انجن آرا اور ملکہ کو نذرِ دلوا کہا۔ ”یہ وہی شخص ہے جس کا اہم مفارقت مدام دل میں کانٹا سا کھٹکتا تھا، جی سینے میں بھٹکتا تھا۔ دیکھو جب اچھے دن آتے ہیں، بے تلاش بھڑے مل جاتے ہیں۔ جس دن گردوں نے ہمیں آوارہ دشتِ ادبار کیا تھا، جدا ہر ایک دستار و عنقوار کیا تھا، اب مساعدتِ بخت سے ایامِ سخت دور ہوئے، ہم مجبور ہوئے۔“

وزیرِ زادے کا حال سنو، انجن آرا کا حسن و جمال بے مثال دیکھ دیوانہ ہو، ہوش و حواس

عقل کو، نمک حرام بنا واصل کی تدبیر میں پھنسا استاد سے

یار اغیار ہو گئے استاد کیا زمانے کا انقلاب ہوا
خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا استاد کوئی کسی کا نہیں دوست بکھانی ہے

دو چار گھڑی صحت رہی، پھر اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ دزیر زادے کے واسطے
خیمہ عالی استاد ہوا۔ پھر جتنی جلیسیں انیسیں حسین رحبین، دونوں شہزادیوں کے ہمراہ تھیں،
اُسے دکھا فرمایا۔ ”جس طرف تیری رغبت ہو دلا دوں۔“

وہ نطفہ حرام اور خیال میں تھا، عرض کرنے لگا: ”میری کیا مجال ہے اور کیا تاب و
طاقت ہے جو انہیں بُری نگاہ سے دیکھوں۔“

جان عالم بہت رضامند ہوا کہ بڑا نیک طینت صاف باطن ہے۔ بہ اسباب ظاہر اس نظر
سے زیادہ مد نظر ہوا، دل میں گھر ہوا۔ تمام صعوبتیں حالات سفر، رنجِ راہ نفع و ضرر، شہزادے
نے بیان کیا، مگر جب پیر مرد کے مشورے کا ذکر آتا، طال جاتا۔ وہ سمجھا کچھ اس میں بھید ہے۔
ایک روز ملکہ مہر نگار اور انجن آرا نے متفق ہو کر، جان عالم سے کہا: ”یہ نیا ماجرا ہے۔
ہر دم ایک شخص غیر اور جو ان کو شریکِ صحبت، خلا بلا رکھنا، کیا مناسب ہے اور دابِ سلطنت
سے بھی یہ امر بعید ہے۔ شیطان کو انسان دور نہ جانے، غیر تو کیا اپنے کا اعتبار نہ مانتے؟“

جان عالم نے کہا: ”پھر ایسا کلمہ زبان پر نہ لانا، اس نے تمہاری لونڈیوں کا پاس کیا، نہ
کہ تمہارا حفظِ مراتب اور میں بھی تو ایسا بیودہ نادان نہ تھا، جو خلافِ وضع حرکت کرتا۔“

ملکہ یہ سُن کر ہنسی، انجن آرا سے مخاطب ہو کر کہا: ”برائے خدا انصاف تو کیجئے، خاطر کی
نہ لیجئے، ان کے حق میں کس بوقیوت کو تامل ہوگا، آپ اگر عقل کے دشمن نہ ہوتے، تو کیوں
حوض میں کود کر ساحرہ کی قید میں پھنستے، نام ڈبوتے، لا بھلا سچ کو، شرمندہ نہ ہو، جی میں کیا
سمجھے تھے، جو کود پڑے، ذرا یہ خیال نہ آیا، غواصِ فکر کو محیطِ تامل میں غوطہ زن نہ فرمایا کہ کہاں
انجن آرا، کجا جنگل کا حوض، وہ اس میں کیونکر آئی۔ وہ از نسلِ شاہی تھی، یا از خاندانِ ماہی تھی؟“

جان عالم کھینا نا ہو گیا، کہا: بات اور مسخر اپن اور کہاں کا ذکر، کس جگہ ملایا، کیا میری

حماقت کا موقع تمہارے ہاتھ آیا۔ یہ تو سمجھو۔ شعر سے

عشق ازیں بسیار کر دست دکند
اتادہ کہتے ہیں جسے عشق وہ از قسم جنوں ہے
سبحہ را ز نثار کر دست دکند
کیونکر جو اس اپنے میں پاتے ہیں خلل ہم

بھلا اپنی باتیں قیاد کرواؤں میں منصف ہو ۔

ملکہ نے کہا "دیکھا آپ شرابے تو یہ کہانی لائے" میں تو زندگی ہوں۔ ناقص عقل سب کہتے ہیں۔ بھلا صاحب ! اگر مجھ سے بیوقوفی کی حرکت ہو دے، تعجب نہیں، لیکن شکر کرنے کی جاسے کہ آپ کا مزاج بھی میرا ہی سا ہے ۔

آخر یہ بات سننے میں اڑ گئی۔ مگر وہ مکار ہر کوچ و مقام میں وقت کا منتظر تھا۔ ایک روز غم اندوز شہزادے کا خیمہ، صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زار، مگر ہمہ تن خار خار، پیراز آزار میں ہوا۔ فضائے صحرائے کیفیت دکھائی، پھولوں کی خوشبو دماغ میں سمائی، جا بجا چشمے رواں دیکھ کر، یہ لہرائی کہ تنہا وزیر زادے کا ہاتھ پکڑا، لبِ چشمہ جا بیٹھا۔ کشتی شراب کی طلب ہوئی۔ جس دم جانعالم کی آنکھوں میں سرور آیا، اختلاط کا زبان پر مذکور آیا۔ اس دغا شعار غدار نے دقتِ تنہائی کھجوت بادہ پیمائی، نشے کی حالت، غنیمت جانی، رونے لگا۔

شہزادے نے ہنس کر کہا "خیر ہے۔"

وہ بولا "جو جو شرطِ رفاقت، حقِ خدمت دنیا میں ہوتا ہے، غلام سب بجا لایا، مگر محنت و مشقتِ غریبِ الوطنی، دشتِ نوردی، کا عوض خوب بھر پایا۔ جب آپ سا قدر داں بات کو چھپاؤ تو پھر اور کسی سے کس بات کی امید رہے ۔"

جانعالم نشے میں انجام کار نہ سوچا۔ اس فیلسوف کے رونے سے یچین ہو گیا کہا۔ "اگر تجھے یہی امر ناگوار ہے تو من لے جو اسرار ہے۔ مجھے ملکہ کے باپ نے یہ بات بتائی ہے کہ جس کے قاب میں چاہوں، اپنی روح لے جاؤں۔"

اس نے پوچھا "کس طرح؟"

شہزادے نے ترکیب بتادی۔ جب وہ سب سیکھ چکا، بولا "غلام کو بے امتحان غلطی کا

گمان ہے ۔"

شہزادہ اٹھ کر جنگل کی طرف چلا۔ چند قدم بڑھ کر، بندرِ مردہ دیکھا کہا "دیکھ میں اس کے قاب میں جاتا ہوں ۔" یہ کہہ کر شہزادہ زمین پر لیٹا بندر اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر زادے کو سب ڈھنگ یاد ہو گیا تھا، فوراً وہ کورنک زمین پر گرا اور اپنی روح جانعالم کے قابِ خیالی میں لا کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار نکال، اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا، شہزادے کا نشہ کرا ہوا، سمجھا بڑی خطا ہوئی، ازماست کہ ہرماست، خود کردہ را علاجے نیست ۔

وہ کافر بندہ کے پیچھے دوڑا، شہزادہ بے چارہ بھاگ کر درختوں کے پتوں میں چھپا، پھر تو یہ دُجی تلمکادہ نطفہ حرام، ہو کپڑوں پر چھڑک، بیدھڑک ملکہ کے خیمے میں آیا، رو دیا بیٹا چلایا کہا۔ ”اس وقت ظلم کا حادثہ ہوا۔ میں وزیر زادے کے ساتھ سیر کرتا تھا، یکایک جنگل سے شیر نکلا، اسے اٹھائے چلا۔ ہر چند میں نے جانبازی سے شیر کو تہ شمشیر کیا، زخمی ہوا، مگر اُسے نہ چھوڑا لے ہی گیا۔“

ملکہ نے تاسف کیا، سمجھایا ”تضا سے کیا چارہ۔ یہی حیلہ مرگ اس کے مقدر میں تھا۔“ پھر انجن آرا کے پاس گیا، وہاں بھی یہی اظہار کیا، الا گھرایا ہوا، باہر چلا گیا۔ ملکہ انجن آرا کے خیمہ میں آئی۔ وزیر زادے کا مذکور آپس میں رہا، لیکن ملکہ کو قیافہ شناسی کا بڑا ملکہ تھا، پریشان ہو کر یہ کلمہ کہا۔ ”خدا خیر کرے، آج بہت شگون بد ہوئے تھے۔ صبح سے داہنی آنکھ پھڑکتی تھی، راہ میں ہرنی اکیلی رسہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی، اپنے سائے سے بھڑکتی تھی۔ خیمے میں اترتے وقت کسی نے پھینکا تھا، خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا، تم بھی فضل الہی سے عقل و شعور رکھتی ہو، آج کی حرکتیں شہزادے کی غور کرو، خلاف عادت ہیں، یا مجھے کو وہم بے جا ہے؟“ انجن آرا نے کہا ”تم جانتی ہو، وزیر زادے سے محبت کیسی تھی، رنج و الم بڑا ہوتا ہے بدحواسی میں کیا ہوتا ہے؟“

الفصہ وہ شب ملکہ کے پاس رہنے کی تھی۔ اسے اندر کا حال کیا معلوم تھا، طبیعت کے لگاؤ سے انجن آرا کے خیمے میں آگیا۔ جس وقت پہر بجا، ملکہ انتظار کر کے وہاں گئی، دیکھا شہزادہ مضطرب بیٹھا ہے مگر اس نے پوچھا ”آج کہاں آرام کرو گے؟“ وہ شجک کر بولا۔ ”جہاں تم کہو۔“ ملکہ نے کہا۔ ”یہیں سو رہو۔“

شہزادے نے کہا ”خوب۔“ یہ کلمہ بھی خلاف دستور ظہور میں آیا۔ اس کا خوب کہنا، ملکہ نے بُرا مانا۔ انجن آرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لائی، روٹی، پیٹی، چلائی۔ انجن آرا بولی ”ملکہ خدا کے واسطے کچھ مفصل بتاؤ۔“

وہ بولی ”غضب ہوا، قسمت اُلٹ گئی۔ شہزادے سے پھٹ گئی۔ خدا کی قسم یہ جاننا نہیں۔“ وہ بھی شہزادی تھی، گو سیدھی سادی تھی، کہا ”درست کہتی ہو، بہت سی باتیں اُس نے آج نہی کی ہیں۔“

ملکہ نے کہا "خیر اب جو ہوا سو ہو، تم یہیں سو رہو۔" پھر بھنوں اور ترکوں سے فرمایا "ہم سوتے ہیں، تم درخیمہ پر مسلح جاگو۔ اس وقت اگر شہزادہ کیا فرشتہ آئے، بار نہ پائے۔" یہ خبر سن کر وہ نامرد ڈرا۔ اکیلے اور خیمے میں جا پڑا۔ ایک ڈر دو طرف ہوتا ہے۔ ملکہ نے کہا "دیکھا اگر جان عالم ہوتا، کبھی اکیلے نہ سوتا، بے تامل چلا آتا۔ بد مزگی کا باعث خفگی کا سبب پوچھتا، اسے کس کا ڈر تھا؟"

انجن آرا کہنے لگی "صورت تو وہی ہے۔" اس وقت ملکہ نے ماجرا غیر کے قلاب میں روح لے جانے کا دم رخصت اپنے باپ کے بتانے کا مفصل بتایا، پھر کہا "یہ حال وزیر زادے سے کہا ہوگا، یہ فساد اس کا ہے۔ ہمیں روزِ آدل اس کی چٹون پر شک آیا تھا، سامنے لانے کو منع کیا تھا، سمجھایا تھا، وہ نادان ہمارا کہنا خاطر میں نہ لایا، اس کا مرزہ پایا۔"

القصہ وہ شب کہ شبِ اولین گور تھی، رونے پیٹنے میں کٹی۔ انجام کار کا تردد و تفکر رہا کہ دیکھئے شیشہ ناموس و ننگ سنگِ ظلم سے کیوں کر بچتا ہے، اور یہ کہتی تھیں سے کسے تیغِ جفا نے چرخ سے امید ہنسنے کی جو ہو دے بھی تو ہاں شاید وہاں زخمِ خداں ہو۔

اسی فکر و اندیشہ میں صبحِ قیامت نمود ہوئی۔ سواری ڈیوڑھی پر موجود ہوئی، کوپچ ہوا خبرداروں نے اس بنے شہزادے سے عرض کی۔ "یہ سرزمین غضنفریہ ہے، یہاں سے پانچ کوس شہر ہے، حاکم وہاں کا غضنفر شاہ زرہ پوش ہے۔ حکم کیا خیمہ ہمارا شہر کے قریب ہو۔ کار پر داذ حب الارشاد عمل میں لائے۔ جب شہزادیاں خیمہ میں داخل ہوئیں، خود آیا۔ ادھر یہ بیچاریاں ڈر سے بادلِ صد چاک، ادھر وہ بچا بھی فونناک ساعت بھر بیٹھا، اٹھ گیا۔"

جب غلغلہ فوج اور آمدِ لشکر وہاں کے بادشاہ نے سنا کہ لشکر بے شمار، سپاہِ حمہار، شہر کے متصل آپہنچی۔ اسے بہت تشویش ہوئی۔ وزیر خوش تدبیر کو چند تحفے دے کر استفسارِ حال بظاہر استقبال کو بھیجا تا ملازمت حاصل کر کے، من و عن حضور میں عرض کرے۔ وزیر حاضر ہوا۔ عرض بگیوں نے خبر پوچھائی، وہ تو ذابِ سلطنت ریاست کا رنگ ڈھنگ جانتا تھا۔ وزیر اعظم کا بیٹا تھا، ردِ بد و طلب کیا، بعدِ ذکر و اذکار، ہر شہر و دیار، اپنا سبب آمد، بھت سیر و شکار، اور اچھا ہونا، آب و ہوا اس جوار کا، اور دیکھنا یہاں کے شہر و شہریار کا، بیان کیا۔ دم رخصت خلعتِ فاخرہ، وزیر کو عنایت ہوا، اور بطرزِ دوستانہ کچھ ہدایا بادشاہ کو روانہ کیا۔

جب وزیر اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، حسنِ آفاق، دبدبہ شوکت و صولت،

آئین سلطنت، رعب و جرات کا اس کے، اس رنگ ڈھنگ سے ذکر کیا کہ وہ بادشاہ بیاختہ مشاق ہو کر سوار ہوا۔ خیرداروں نے اس حال سے مطلع کیا۔ ارکان سلطنت، دزرا، امرا، نجشی، سپہ سالار، پیشوائی کو گئے۔ جب قریب پہونچا، خود درخیمہ تک آیا۔ معافہ کر، دونوں تخت پر جا بیٹھے، سلسلہ کلام، بلاغت نظام، طرفین سے کھلا، وہ بھی اس کی صورت پر غش ہو گیا۔ فصاحت پر غش کرتا رہا۔ بصد تکرار شہر کا مکلف ہوا۔ جلد جلد عمارات شاہی، سبھی سجائی خالی ہوئیں۔ اس کو اتارا، لشکر وہیں رہا۔ پھر حسب طلب ملکہ و انجن آرا، سرچوک دو محسرا برابر خالی ہوئے۔ شہزادیاں وہاں اتریں۔ چند روز دعوت، جلسے رہے۔ جب فرصت ملی، دل میں سوچا اگرچہ جان عالم بند رہے، الا اس کے جینے میں اپنی مرگ کا خوف و خطر ہے۔ ایسی تدبیر نکالئے کہ اسے جان سے مار ڈالئے۔ پھر بے کھٹکے، آرام صبح و شام کیجئے۔ ملکہ سے ڈرتا تھا، پیر مرد کے نام لینے سے مڑتا تھا، جیسے چور کی داڑھی میں تنکا۔ یہ سوچ کر حکم کیا، ”ہمیں بندر درکار ہیں، جولائے گا دس روپیہ پائے گا۔“

اہل شہر ہزاروں بندر پکڑ لائے۔ جو سامنے آتا بغور دیکھ کر تڑپا داتا۔ تھوڑے عرصے میں بہت بندر ہلاک اس مفاک نے کئے۔ جب بندر کم ہوئے، دام بڑھے، بچہ یکہ فی بندر سو روپیہ مقرر ہوئے۔ دو کوس چار کوس گرد پیش نام و نشان نہ رہا۔ بندر غنقا ہو گیا۔ چنانچہ وہیں کے بھاگے ہوئے آج تک متھرا، اور بندرا بن، اور اودھ بنگلے میں خستہ تن ہیں۔ بلکہ اس زمانے میں بندر ابن بالفتح تھا۔ اب عرصہ دراز گزرا، وہ بندروں کی کثرت جو نہ رہی۔ اس کسرت سے یہ لفظ بالکسر خلقت کہنے لگی۔ غرض کہ شہر میں ہر طرف غفلت ہوئی۔ سب کی یہی معاش ہوئی، ہر شخص کو بندر کی تلاش ہوئی۔ ایک چڑھیار زیر دیوار، سرا اس بستی میں بستا تھا، مگر محتاج، مفلوک، ہزار جستجو و تنگدلی، تمام دن کی گردش میں دس پانچ جانور جو ہاتھ آجاتے، دو چار پیسے کو بیچ کر، جو دشمن روٹی کھاتے، اگر خالی پھرا، فاتے سے پیٹ بھرا۔ ایک روز اس کی جو رد کہنے لگی، ”تو سخت احمق ہے، دن بھر جانوروں کی فکر میں در در خاک بسر، اُلو سا دیوانہ ہر ایک دیرانہ جھانکتا پھرتا ہے۔ اس پر جو روٹی ملی تو بدن پر لٹا ثابت نہیں۔ کسی طرح ایک بندر بھی ہاتھ آئے تو برسوں کی فرصت ہو جائے۔“

لایح تو بُرا ہوتا ہے، وہ راضی ہوا کہا: ”کیس سے آٹھ لاکھ روٹی پکا، اور جس طرح بنے، تھوڑے چنے ہم پہونچا، صبح بندر کی تلاش میں جاؤں گا، نصیب آزمادوں گا۔“ اس نے مانگ جا پانچ وہ سامان کر دیا، دو گھڑی رات رہے، چڑھیار جال پھٹکی، پھینک

لاسا کیا چھوڑ ٹٹی جو دھوکے کی تھی، وہ توڑ روٹی اور چنے اور رستی لے کر چل نکلا۔ شہر سے چھ سات کوس باہر نکل درختوں میں ڈھونڈ مھنے لگا۔

وہاں کا حال سنئے شہزادہ جو بندر بنا تھا، اُس نے جس دن سے بندر پکڑتے لوگوں کو دیکھا تھا اور سر توڑوانے کا حال سنا تھا، بدحواس پریشان، سراپیمہ، زیت سے یاس، حیران ہر طرف چھپتا پھرتا تھا کہ مبادا کوئی پکڑ لے جائے، زندگی میں خلل آئے۔ اس روز کئی دن کا بے دانہ داب خستہ و خراب، ضعف و نقاہت سے ایک درخت کی کول میں غش ہو کر پڑا تھا۔ چڑیہار نے دیکھا، دبے پاؤں آکر گردن پکڑی۔ اس نے آنکھ کھولی، گلا دستِ قضا میں پایا، جینے سے ہاتھ اٹھایا۔ یقین ہوا زیت اتنی تھی۔ آج پیانہ بقا بادہ اجل سے بریز ہو کر چھلکا، پکارا "اے گردنِ دوں! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" چڑیہار نے کمر سے رسی کھول، مضبوط باندھا، پھر شہر کا رستہ لیا، تھوڑی دور چل، بندر نے کفِ افسوس مل کہا۔

"اے شخص بکریوں خون بے گناہ، راندہ درگاہ اپنی گردن پر لیتا ہے۔ مصیبت زدہ کو اور دکھ دیتا ہے۔"

وہ بولا "کیا خوب! تو تو باتوں سے مجھے ڈراتا ہے، اگر دیو، بھوت، جن آسیب جو بلا ہے، بلا سے، مگر تیرا چھوڑنا ناروا ہے! آج قسمت آزمائی، نعمت غیر مسترقبہ ہاتھ آئی، تجھے بادشاہ کو دوں گا، سو روپے لوں گا، چین کروں گا۔"

یہ سنئے ہی سُن ہو گیا۔ رہی سہی جان قاب سے نکل گئی۔ ہر چند منت و سماجت سے کہا "لا پلج کا کام بُرا ہوتا ہے"۔ کچھ کام نہ آیا، چڑیہار نے جلد جلد قدم بڑھایا، قریب شام، شاد کام گھر آیا۔

جور و سے کہا "ابھی ساعت گھر سے گیا تھا، طاہرِ مطلب، بے دام و دانہ، خواہش کے جال میں پھنسا! یہ کہہ کر خوب ہنسا۔

اب دو کھلے یہ سنئے، جس دن شہزادہ گرفتار ہلائے تازہ ہوا، یعنی چڑیہار کے دامِ حرص میں گرفتار ہوا، ملکہ دل گرفتہ خود بخود گھبرائی اور رو رو کر یہ بیت زبان پر لائی۔ استاد سے ہوئی کیا وہ تاثیر اے آہ تیری تھی آگے تو کچھ بیشتر آزمائی

انجن آرا نے کہا۔ "تم نے سنا یہ کبھت بندر پکڑوا کے سر کھلواتا ہے، یقین جانو جان عالم اسی ہیئت میں ہے اور آج خدا کرے، صبح سے بی طرح دلِ ناکام کو اضطراب ہے، جانِ زار کو

بیچ دتا ہے۔ گھر کاٹتا ہے، غم کلیجہ چاٹتا ہے، معلوم ہوتا ہے، شہزادہ پکڑا گیا یا کوئی اور آفت تازہ ستم لڑے اندازہ چرخ کہن دکھائے گا، ہنسی کے بدلے رولائے گا۔ میرے

جس سے جی کو کمال ہو الفت
جس کی جانب درت ہو نسبت
جس میں یاں کاوش اک نمایاں ہو
چشم عاشق لہو سے تر ہو دے
داں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی
حسن اور عشق میں ہے یک رنگی

انجن آرا نے جھٹکا کر کہا: "اس سے اور افراد کیا، دنیا میں تباہی اور خرابی ہوگی! شہر چھٹا سلطنت گئی۔ ماں باپ عزیز و اقربا کی جدائی نصیب ہوئی۔ زخم دل و جگر آئے پڑے ہیں۔ جان کے لالے پڑے ہیں۔ مصحفی سے

مرض الموت سے کچھ کم نہیں آزار اپنا
دل میں دشمن کے بھی یارب نہ چھپے خار اپنا
اور جس کے واسطے ادارہ د سرگشتہ ہوئے، یہ صدمے سہے، نخوت بخت نافرجام، گردش ایام سے اسے کھو بیٹھے، دطن سے ہاتھ دھو بیٹھے، اب رضینا بھہ قضا مرضی ہوئی از ہمہ ادلی۔
ناسخ سے

مجھے فرقت کی اسیری سے رہائی ہوتی
ابو رحمت سے تو محروم رہی کشت مری
کاش عیسیٰ کے عوض موت ہی آئی ہوتی
کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
یہاں تو یہ باتیں تھیں، ادھر چڑیا کی جورد، چراغ لے کر بندر کو دیکھنے لگی۔ بندر سوچا، وہ کینخت مرد بر سر رحم نہ ہوا، کیا عجب یہ رند ہی ہے، اگر نرم زبانی سے مذکور آفت آسمانی سنے اور مہربانی کرے، اس خیال سے پہلے سلام کیا، وہ ڈری تو یہ کلام کیا۔ "اے نیک بخت! خوف نہ کر، دو باتیں میری گوش دل سے سن لے!"

گنذاریاں جی کی کڑی بھی ہوتی ہیں۔ بندر کا بولنا اچنبھا سمجھ کر کہا "کہہ۔"

وہ بولا۔ "ہم غریب الوطن، گرفتار رنج و مبتلائے محن، گھر سے دور، قید میں مجبور ہیں۔ ماں باپ نے کس کس ناز و نعم سے پالا، فلک نے کون کون سی مصیبت دکھانے کو گھر سے نکالا۔ یہاں تک کہ در بدر حیران پریشان کر کے بڑے دن دکھائے، کہ تیرے پاس گرفتار ہو کر آئے استاد سے

پیدا کیا خدا نے کسی کو نہیں بحث لایا مجھی کو یاں پر جہاں آفریں بحث

اب صبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے۔ تب سو روپے تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ خون بے گناہ کی جزا حشر کو پاؤ گی، بکینٹھ چھوڑ نرک میں جاؤ گی۔ بیسہ روپیہ ہاتھ کا میل ہے، اس پر جو میل کرتی ہو، کتنے دن کھاؤ گی۔ دھبہ اس کا جیتے جی نہ چھوٹے گا۔ دھوتے دھوتے مر جاؤ گی۔ اگر ہمارے حال پر رحم کر دو، خدا اور کوئی صورت کرے گا سو روپے کے بدلے، تمہارا گھراشرفیوں سے بھرے گا۔ ہمارے قتل میں گناہ بے لذت یا ایک موذی کی حسرت نکلنے کے سوا اور کیا فائدہ ہے۔ اگرچہ ایسا جینا مرنے سے بُرا ہے۔ لیکن خدا جانے ارادہ ازلی مشیت ایزدی کیا ہے۔ ہماری تقدیر میں کیا کیا لکھا ہے، جو خدا کے نام پر نثار ہے، اللہ اس کا ہر حال میں مُمدد مددگار ہے، تو نے بادشاہِ مین کا قصہ سنا نہیں، ایک سلطنت دی، دو پائیں، لالچیوں کی قضا آئی، جانیں گنوائیں، زندگی موم کی ناک ہوتی ہے۔ جب گھر گئی، جدھر پھیرا پھیر گئی۔ بندر کی باتوں پر کچھ تعجب کچھ تاسف کر کے کہنے لگی —

”ہنومان جی! وہ کہانی کیسی ہے سناؤ مہاراج“

فسانہ شاہِ مین

سلطنت سائل کو دینا، اوہ بی بی کو مع بیٹوں لے کر شہر سے نکلتا،

راہ میں سوداگر کا فریب، پھر فرزندوں کی جدائی، آخر کو سلطنت ہاتھ آئی

بندر نے کہا "سرزمین مین میں، ایک بادشاہ تھا، ملک اس کا مالا مال، دولت لازوال،
بخشنده تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت، جس دم سائل کی صدا گوشِ حقِ نبوش میں در آئی، وہی احتیاج
پکاری میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اس کا نزدیک و دور خدا دوست مشہور ہوا۔

ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ "اگر تو خدا دوست ہے تو اللہ تین دن، مجھے سلطنت
کرنے دے۔"

بادشاہ نے فرمایا "بسم اللہ، جو رکن سلطنت مستنشینِ حکومت حاضر تھے، بتا کید انہیں حکم ہوا
کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتابِ سلطانی ہوگا۔" یہ فرمانِ روا تخت سے اٹھا، سائل جا بیٹھا، حکمرانی
کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا "اب کیا قصد ہے؟"

سائل بولا۔ "پہلے تو وہ فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزا ملا، برائے خدا یہ تاج و تخت
میک لخت مجھے بخش دے۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ "یہ حکومت آپ کو مبارک ہو۔" بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیبت لیا، فقط
لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا کہ اتنے دنوں سلطنت، حکومت کی، چندے فیری

کی کیفیت، فاتے کی لذت دیکھئے، گوجاہ وحشم مفقود ہے لیکن شاہی بہر کیف موجود ہے، مگر اس شہر سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکم خدا قل سیروانی الارض ہے۔ دنیا جائے دید ہے، عنایت خالق سے کیا بعید ہے، جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک رڈ کا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست، شہر سے تہی دست نکلا، بلکہ تکلف کا لباس بھی نہ لیا۔ جامہ عربانی جسم پر چھپت کیا اور چل نکلا، دنیا کا زور نقشہ ہے۔ مصرعی

ایں عبوزہ عروس ہزار داماد است

کل وہ سلطنت، ثروت، کرد فر، افسرد تاج، آج یہ مصیبت اذیت۔ در بدر پیادہ پا سفر، محتاج، کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقارہ دو کوس، ہزار رنج و تعب چلتا، جو کچھ میسر آیا تو روزی، نہیں تو روزہ۔ یونہی ہر روز راہ طے کرتا، جب یہ نوبت پہنچی۔ چند روز میں ایک شہر ملا۔ مسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا، قافلہ باہر اُترا، تنہا گھوڑے پر سوار ہوا، سیر کرتا، مہمان سرا میں وارد ہوا، شہزادی کہ گرد راہ صعوبت سفر کی مبتلا تھی، لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدی علی

حاجت مشاطہ نیت روئے دل آرام را

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بیک نگاہ از خود رفتہ ہوا۔ بادشاہ کے قریب آسلام کیا۔ یہ بیچارے اللہ کے دلی، وہ ولد الزنا، شقی، بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اس عرصے میں وہ غدار، حیلہ سوچا، بہت افسردہ خاطر ہو کر کہا "اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اُترا ہے۔ میری عورت کو درد زہ ہو رہا ہے، دانی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں، تو مرد بزرگ ہے، کچھ ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو اللہ میرے ساتھ کر دے تا اس کی شراکت سے اس کو رنج سے نجات ملے۔ وگرنہ بندہ خدا کا مفت خون ہوتا ہے"

یہ اللہ کا نام سن کر گھبرائے۔ بی بی سے کہا: زہے نصیب جو محتاجی میں کسی کی حاجت رفع ہو، کام نکلے بسم اللہ دیر نہ کر۔

اس نے دم نہ مارا۔ سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل۔ اس غریب سے کہا "قافلہ دور ہے، مجھے آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے۔ آپ گھوڑے پر چڑھ لیں، تو جلد پہنچیں۔" وہ فلک ستائی قریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پر بٹھا۔ قافلے پاس آکے چچ کا حکم دیا۔ آپ ایک سمت گھوڑا بھینکا۔ اس وقت اس نیک بخت نے داد بیداد فریاد مچائی، تڑپا،

روٹی، پیٹی، چلائی، آہ و زاری اس بے رحم سنگدل کی خاطر میں نہ آئی۔ بادشاہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا، خود چلے، دیکھئے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سراسے نکلے۔ ہر چند ڈھونڈا نشان کے سوا قافلے کا سراغ نہ ملا، دور گرد اڑتی دیکھی، جس کی صدا سنی، نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب۔ سب طرح عذاب، نہ کوئی یار نہ غمگسار، نہ خدا ترس، نہ فریاد رس، بحسرت دیاس قافلے کی سمت دیکھ کر یہ کہا: مصحفی سے

تو ہمرہانِ قافلہ سے کیوں اے صبا ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے

لاچار بڑکوں کو لے کر اسی طرف چلا، چند گام چل کر راہ بھول گیا۔ ایک ندی ملی، مگر نہ کشتی نہ ڈونگی، نہ ملاح۔ راہ سے یہ نا آشنا نہ وہاں سیاح کا گذرا، ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہی بے آب و اہی تباہی پھرا۔ رہبرِ کامل کو پکارا، ساحلِ مطلب سے ہٹنا نہ ہوا مگر کچھ ڈھب ڈھب نیکا ڈھب تھا۔ ایک بڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اٹھا دریا میں در آیا، نصف پانی بصد گرائی طے کیا تھا کنارے کا بڑکا بھیڑیا اٹھالے چلا۔ وہ چلا یا۔ بادشاہ آواز سن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا بڑکا پانی میں گر پڑا، زیادہ مضطرب ہو ہوا، خود غوطے کھانے لگا، لیکن زندگی باقی تھی، ہر کیف کنارے پر پہونچا۔ دل میں سمجھا بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب مرا۔ نیرنگی فلک سے عالم حیرت، بی بی کے چھٹنے کی غیرت، بیٹوں کے الم سے دل کباب، سلطنت کے دینے سے خستہ و خراب، اسی پریشانی میں شکر کرتا، پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہونچا، در شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، ادھر آیا۔ اس ملک کا یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ عازمِ اقلیم عدم ہوتا، ارکانِ سلطنت، روسائے شہر وہاں آکر باز اڑاتے تھے، جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے۔ ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہ گد صورت کا پہنچنا تھا، باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے، تخت رو برد آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا "میں گم کردہ آشیائے سلطنت کشایاں نہیں ہوں۔ میں نے اسی علت سے اپنے مرزبوم شوم کو چھوڑا ہے، حکومت سے منہ موڑا ہے۔ مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا، غنقا سمجھ نہ باز رہے۔ جو شاہین تھے، تار گئے پر بن پہچان گئے کہ یہ مقرر ہمارے ادج سلطنت ہے۔

قصہ مختصر رگڑ جھگڑا تخت طاووس پر بیٹھا، اندریں دیں، تو پچانے میں شلک ہوئی، بڑے تیزک حسمت سے آشیائے سلطنت، کاشائے دولت میں داخل کیا۔ تمام قلمرو نقد و جنس، اشیائے بحری و برسی، ان کے تحت حکومت، قبضہ تصرف میں آیا۔ گز، سکے پر نام جاری ہوا، منادی نے

ندا دی 'دہائی پھر گئی۔ کہ جو ظلم و جور کا بانی ہوگا، وہ لٹیرا گردن مارا جائے گا۔ سوز
 بیل میں چلبے تو گدا کو وہ کرے تخت نشین کچھ اچنبھا نہیں اس کا کہ خدا قادر ہے
 کارخانہ قدرت عجیب و غریب ہیں، نہ اعتماد سلطنت، نہ قیام عزت و عسرت۔ مرزا رفیع
 سودا سے

عجب نادان ہیں جن کو عجب ہے تاج سلطانی فلک بال ہما کو پل میں سو پئے ہے مگس رانی
 یہ سلطنت تو کرنے لگا، مگر افسردہ خاطر، پڑ مرودہ دل، بہ سبب شرم و حیا مفصل حال کسی سے
 نہ کہتا تھا۔ شب و روز غمگین اور اندوہناک پڑا رہتا تھا جب وہ ببل ہزار داستان، یعنی فرزند شمع
 دودمان یاد آتے تھے۔ نفل سبحانی آہ کو لب پر لاتے تھے۔

اب اُن لڑکوں کا حال سنئے، جس کو بھڑایا اٹھائے لئے جاتا تھا، ادھر سے کوئی میر انداز
 سبک دست آتا تھا، اُس نے چھڑایا۔ دوسرا جو غوطے کھاتا تھا اس کو ماہی گیر نے دام محبت میں اُلجھایا،
 وہ دونوں لاد لیتے۔ اسی شہر کے رہنے والے یہاں ان لڑکوں کا باپ بادشاہ ہوا تھا، وہ اپنے
 اپنے گھر میں لا بقدر مقدور، لڑکوں کو پرورش کرنے لگا۔ جل جلالہ، کیا سنگ تفرقہ فلک نے
 پھینکا، کہ ایک دوسرے سے جدا ہو گیا۔ چند عرصے تک بیٹوں کی مفارقت نے بادشاہ کو بے چین کیا،
 وزیر سے فرمایا کہ "دو لڑکے قوم شریف سے ہماری صحبت کے قابل ڈھونڈ کے لا۔"

وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کئے، حکم حاکم مرگب مفاجات، وہ دونوں بھی آئے۔
 سبحان اللہ! جامع المتفرقین بھی اسی کا نام ہے۔ پچھڑے ملانا اس کے روبرو کتنا کام ہے!
 وہی وزیر کو پسند آئے، روبرو لایا۔ بہ سبب طولِ زمانِ مفارقت اور تکلیف و عسرت نقشے بدل گئے
 تھے، قطع اور ہو گئی۔ نہ بادشاہ نے پہچانا، نہ تقاضائے سن سے لڑکوں نے باپ جانا،
 اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ یہ بھی قدرت نہائی ہے، بہم ہوئے، مگر جدا رہے،
 لیکن بادشاہ بہ محبت تمام مصروفِ عنایت علی الدوام تھا۔ ب نے سنا کامل کا یہ نکتہ ہے،
 کَلَّ امْرُؤٌ مَرَّ هَوْنًا بِأَدْقَاتِهِ — تھوڑے دن میں معتمد و مقرب ہوئے اور وہ سوداگر جو فروش
 گندم نما، دغا کا پتلا، یہاں کے پہلے بادشاہ سے رسائی عملے سے شناسائی رکھتا تھا، اس
 نظر سے وہ بھی اُس عورتِ ناراض کو لے کر، وہاں وارد ہوا۔ خیر مرگب بادشاہ سن کر ملول ہوا
 کہ مطلب نہ حصول ہوا۔ لوگوں نے کہا "بادشاہ تازہ" اس سے زیادہ خلیق و عزیز پر در ہے،
 بوساطتِ وزیرِ عظم تحفہ تحائف حضور میں نذر کر، شرف اندوزِ ملازمت ہوا، اس کو بھی بادشاہ

نے نہ پہچانا، نہ سوداگر نے حریف جانا، مگر بادشاہ نے اس کو ذی اعتبار سیاح دیار دیار سمجھ،
بیشتر اطراف و جوانب کا مذکور سنا تھا۔

ایک دن قریب شام حضور میں حاضر تھا، بادشاہ نے فرمایا "آج کی شب گھر نہ جا،
کچھ پوچھنا ہے۔"

وہ بیٹھا تو مگر مکدر و پریشان۔ بادشاہ نے تردد کا سبب پوچھا۔ یہ باعث عنایت فی الجملہ
ہو چلا تھا، دست بستہ عرض کی۔ "خانہ زاد کے پاس ایک عورت ناراض ہے، اس کو فدوی سے
اغماض ہے، اس کی نگہبانی بذات خود کرتا ہوں۔ بمرتبہ ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ نکل کے راز پنہاں
فاش کرے، حمایتی تلاش کرے۔"

حکم ہوا کہ یہ مقدمہ آج ہمارے ذمہ ہے۔ وہی لڑکے بسکہ معتمد تھے، خاص دستہ ان کے
ہمراہ کر پاسبانی کی تاکید اکید کی، لڑکے آداب بجا کر سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ پر خیمہ برپا تھے۔
درخیمہ پر کرسی بچھا دوڑوں بیٹھے۔ پاسبان آس پاس پھرنے لگے۔ جب آدھی رات گزری، ایک کونینہ
آنے لگی۔

دوسرے نے کہا "سونا مناسب سنیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنہ خواہیدہ جاگے، خیمہ سے
چونک بھاگے۔"

وہ بولا "تو ایسا فسانہ کہو جو نیند اچھٹنے کا بہانا ہو۔"

اس نے کہا "خیر آج ہم اپنی سرگزشت کہتے ہیں، اگر غور سے سنو گے تو نیند کیا کٹی روز بھوک
پیاس پاس نہ آئیگی۔" اے عزیز باتیں! میں بادشاہ بین کا بیٹا ہوں، میرا باپ اللہ سلطنت
سائل کو دے، مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ وہ تم سے بہت مشابہ تھا، اس کو اور اپنی بی بی کو
ہمراہ لے کر غریب الاطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہزادی کو لے گیا۔ ہم دونوں بھائی
ساتھ رہے۔ آگے چل کر دریا ملا، ناؤ بیڑہ کچھ نہ تھا، بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے
پر چڑھا، پار چلا، مجھے بھیڑیے نے پکڑا، میرے چلانے سے بادشاہ جو بدحواس ہوا، بھائی دوش
سے آغوش دریا میں کھسک پڑا، خود غوطے کھانے لگا، پھر نہیں معلوم کیا ہوا، مجھے تیر انداز نے
دھن گرگ سے چھڑایا۔ اب فلک اس بادشاہ پاس لایا۔"

وہ رد کر لپٹ گیا کہا "بھائی! دریا میں ہم گرے تھے، مچھلی والوں کے باعث ترے
تھے۔" پھر تو دونوں بفلگیر ہو، ایسے چلائے کہ وہ عورت نیند سے چونک پڑی، پردے کے پاس

اگر حال پوچھنے لگی۔ انھوں نے ماجرائے گزشتہ بیان کیا، وہ پردہ الٹ لڑکوں سے پٹ گئی،
 کہا ”ہم اب تک سوداگر کی قید میں مجبور ہیں۔“

اسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہنچی، سواری بھیجی طلب کیا۔ اس وقت سب نے پہچانا، فوراً سوداگر
 کو قید کیا۔ صبح دم جب جلا د پھر یعنی مہر شمشیر شاع کھینچ کر ہنگامہ پرداز عالم ہوا، سوداگر کو کاروان
 عدم کا ہمسفر کر بارہتی سے سبکدوش کیا۔ یمن میں اخبار نویسوں نے حال لکھا، وہاں عجب ہر بونگ
 مچا تھا۔ وہ سائلِ تم شعار، بدرجہ ظلم پیشہ و جفا کار نکلا، رعیتِ نالاں، ارکانِ سلطنت ہراساں رہتے
 تھے۔ ہزاروں رنج رات دن سستے تھے۔ جب یہ خبر دہاں پہنچی، وزیر نے زہر دے کر اسے مارا، تلخکامی
 سے سب کو نجات ملی اور عرضداشت اپنی بادشاہ کو لکھی۔ تمنائے قدبوس تمام شہر کی تحریر کی۔ بادشاہ
 کو بھی محبتِ وطن دل میں جوش زن ہوئی۔ سفر کی تیاری ہونے لگی قطعہ ۵

حُب الوطن از ملک سلیمان خوشتر خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
 یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر
 القصہ یمن میں آیا، دونوں سلطنتیں قبضہ میں رہیں۔

جب بندر نے یہ فسانہ تمام کیا پھر کہا۔ ”اے نیک بخت مطلب اس کہانی سے یہ تھا کہ
 جو بادشاہ عاشقِ اللہ خدا پر شاہ تھا، ایک سلطنت دی، دو پائیں۔ یہ دونوں بد بخت جو لالچی تھے،
 انھوں نے جانیں گنوائیں، قیامت تک مطعونِ خلائی رہیں گے۔ جتنے نیک ہیں، یہ قصہ سن کر
 بد کہیں گے۔“

زندگی ان باتوں سے برسرِ رحم ہوئی، بندر کی تسکین کی کہا ”تو خاطر جمع رکھ، جب تک کہ
 جیتی ہوں، تجھے بادشاہ کو نہ دوں گی، فاقہ قبول کروں گی، پھر اُسے روٹی کھلا، پانی پلا، کھڑی
 میں لٹا سو رہی۔ صبح کو چڑیا ر اٹھا، بندر کے لے جانے کا قصد کیا۔ عورت نے کہا ”آج اور
 قسمت آزما، پھر جانور پکڑنے جا، جو روٹی میسر آئے، تو کیوں اس کی جان جائے، تو ہم پر
 ہتیا لگے، بدنامی آئے نہیں تو کل لے جانا۔“
 وہ بولا ”تو اس کے دم میں آگئی۔“

بندر نے کہا ”ماشا اللہ! زندگی تو خدا پر شاہ ہے، تو مرد ہو کر مضطر ہوتا ہے! پاچی تو
 زن مرید ہوتے ہیں، پھر ٹپک جھٹک، جاں پھٹکی، اٹھا لاسا کیا لے ٹٹی کندھے سے لگا گھر سے
 نکلا۔ یا تو دن بھر خراب ہو کر دو تین جانور لاتا تھا، اس روز دوپہر میں بچاس ساٹھ ہاتھ

آئے۔ پیشکی بھر گئی، خوش خوش گھر پھرا، کئی روپے کو جانور بیچے آٹا، دال، نون، تیل، لکڑی، خرید
تھوڑی مٹھائی لے۔ بھٹی پر جا، ٹکے کا ٹھرا پیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے، جھومتے گیت گاتے، گھر
کا رستہ لیا، مفلسی کا غم بھول گئے، جو دسے آتے ہی کہا "اری! ہنومان جی کے قدم بڑے
بھاگوں ہیں۔ بھگوان نے دیا کی، آج روپیہ دلوائے، اتنے جانور ہاتھ آئے۔" وہ گھر بسی، بہت
ہنسی، پہلے مٹھائی بندر کو کھلانی، پھر روٹی پکا، آپ کھا کچھ اسے کھلا پڑ رہی۔ بندر بچارا بھانچندے
پھر جان بچی، جو فلک نہ جل مرے، اور اس کا رشک نہ کرے۔ مؤلف ۷

کیا شاخ گل پہ پھول کے مٹی ہے عندلیب ڈرتا ہوں میں نہ چشم فلک کو بڑا لگے
جب لایا بار یاس ہی لایا یہ اسے سرور گا ہے نہ نخل غم میں ثمر اس سوا لگے
اب روز چڑیہار کی ترقی ہونے لگی، تھوڑے دنوں میں، گھر بار کپڑا لٹا گنا پاتا، درست
ہو گیا۔ قضا را کوئی بڑا تاجر، سر میں اس بھٹیاری کے گھر میں اُترا، جس کی دیوار تلے چڑیہار رہتا تھا۔
ایک روز بعد نمازِ عشا سوداگر وظیفہ پڑھتا تھا، ناگاہ آوازِ خوب صداٹے مرغوب، جیسے لڑکا پیاری
پیاری باتیں کرتا ہے، اس کے کان میں آئی۔ بھٹیاری سے پوچھا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"
وہ بولی "چڑیہار"

سوداگر نے کہا "اس کا لڑکا خوب باتیں کرتا ہے"

بھٹیاری بولی "لڑکا بالا تو کوئی بھی نہیں، فقط جوڑو و خصم رہتے ہیں"

سوداگر نے کہا "آسن، یہ کس کی آواز آتی ہے؟ بھٹیاری جو آئی، لڑکے کی آواز پائی۔

وہ بولا "اس صدا سے بولے درد پیدا ہے، اس کو میرے پاس لا، باتیں کروں گا، کچھ

لڑکے کو دوں گا اور تیرا بھی منہ میٹھا کروں گا"

بھٹیاری چڑیہار کے گھر گئی، بندر باتیں کرتا ہے، اسے دیکھ چپ ہو رہا۔ وہ دونوں بھٹیاری

کے پاؤں پر گر پڑے۔ منت کرنے لگے، کہا "ہم نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے، اپنا دکھ ٹالا ہے،

شہر پر آشوب ہو رہا ہے، بندر کش بادشاہ اُترا ہے، ایسا نہ ہو یہ خبر اڑتے اڑتے اسے پہنچے،

بندر چھین جائے، ہم پر خرابی آئے"

وہ بولی "مجھے کیا کام جو ایسا کلام کروں۔" سر میں آ کے سوداگر سے کہا "دہاں کوئی نہ تھا"

اس نے کہا "دیوانی ابھی وہ آواز کس کی تھی؟ بغور سنئے کہ کیا معقول جواب وہ نامعقول

دیتی ہے"

بولی ”بلیاں لوں، بھلا مجھے کیا غرض، جو کہوں بندر بولتا ہے۔“

سوداگر خوب ہنسا، پھر کہا ”تو سرتن ہے، اسی بندر کہیں بولتا ہے۔“

پھر بولی ”جی غریب پر دربار صدقے گئی، اسی سے تو میں بھی نہیں کہتی، بندر بولتا ہے۔“

سوداگر کو سخت خلجان بھر تہہ خفقان ہوا، کہ یہ کیا ماجرا ہے، مکان قریب تھا، خود چلا گیا۔

دیکھا تو فی الحقیقت ایک عورت دوسرا مرد مچھندر، تیسرا بندر ہے۔ یقین کامل ہوا، یہی بندر بولتا

تھا، بھٹیاری سچی ہے، وہ سوداگر کو دیکھ کر بندر کو چھپانے لگی، اس نے کہا ”بھید کھل گیا، اب

پوشیدہ کرنا لا حاصل ہے، مصلحت یہی ہے، بندر ہمیں دو، جو احتیاج ہو اس کے جلد میں لو،

نہیں تو بادشاہ سے اطلاع کر دوں گا۔ یہ بے چارا مارا جائے گا، تمہارا کیا جائے گا۔“

دونوں روئے پیٹنے لگے، بندر سمجھا، اب جان نہیں بچتی، اتنی ہی زریست تھی۔ چڑھیا

کہا ”اے شخص! فلک بھر تیار کر دوں دوڑنے اتنی جفا پر صبر نہ کیا۔ یہاں بھی چین نہ دیا،

سب یہی ہے، رضائے الہی پر راضی ہو، مجھے حوالے کر دو۔ قضا آئی، ملتی نہیں، تقدیر کے آگے

کسی کی تدبیر چلتی نہیں۔ فرد بشر کو حکم قضا و قدر سے چارہ نہیں، اس کے ظالم دینے کا یا ر نہیں،

اِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔“

چڑھیا نے کہا ”دیکھو بندر کی ذات کیا بے دفا ہوتی ہے! ہماری محنت مشقت پر نظر نہ کی،

تو تے کی طرح آنکھ پھیر لی۔ سوداگر کے ساتھ جانے کو راضی ہو گیا۔ بڑا آدمی جو دیکھا، ہمارے پاس

رہنے کا مطلق پاس نہ کیا۔“

بندر نے کہا ”اگر نہ جاؤں، اپنی جان کھوؤں، تم پر خرابی لاؤں۔“ آخر کار بہ ہزار گریہ نزاری

سوداگر سے دونوں نے قسم لی کہ ”بادشاہ کو نہ دینا، اچھی طرح پرورش کرنا، یہ کہہ کر بندر حوالے کیا۔

سوداگر نے اس کے عوض بہت کچھ دیا۔ بندر کو سرا میں لاپیاری کیا۔ بدلداری اور نرمی حال پوچھا۔

بندر نے یہ چند شعر حسب حال سوداگر کے رو بہ رو پڑھے۔ مرزا رفیع سودا سے

نے بلبیل چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں میں موسم بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بشکلِ جام اس میکدے کے بیچِ عبثِ آفریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ درد جو کچھ کہ ہوں سود ہوں غرضِ آفتِ رسیدہ ہوں

اے عزیز! آتش کارواں نقشِ پائے یارانِ زلفگانِ ظاہر ہوں، مگر پنہاں ہوں بلبیل

دور از گلزارِ کم کردہ اشیاءِ سیادِ درپے آزار، گھات میں باغبانِ کیونکہ نہ سرگرمِ فغاں

ہوں، حضرت عشق کی عنایت ہے، زمانے کی شکایت ہے، حاجتِ روائے عالم محتاج ہے،
تخت ہے نہ افسر ہے، نہ وہ سر ہے، نہ تاج ہے۔ غریب دیار، چرخِ موجدِ آزار، شفیق و
مہربان نہیں، حالِ زار کا کوئی پُرسان نہیں، حیرت کا کیوں نہ مبتلا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے اسیرِ
دامِ بلا ہوں، خود گرفتارِ پنجہ ستم ہوا، کبھی مجھے جن کا الم تھا، اب انھیں میرا غم ہوا۔ مرنے سے
ہم اس لئے جی چھپاتے ہیں، کہ ہمدِ میرے فراق میں موئے جاتے ہیں، مجھے دامِ مکہ میں الجھایا،
دوستوں کو میرے، دشمن کے پھندے میں پھنسایا، گردشِ چرخ سے عجیب سانحہ پیش آیا۔ میر تقی میر

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں جو ہو دے شفیق بیکسی چھٹ نہیں ہے کوئی رفیق

آہ جو ہم دمی سے کرتی ہے اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات ایک میں اور ہزار تصدلیات

مصروع گوئم مشکل و گرنہ گویم مشکل — مگر آج خوش قسمتی سے آپ سا قدر داں ہاتھ
آیا ہے، امتیازِ طبیعت برطرف، ہو تو بہ دلجمعی تمام، آغاز سے تا انجام اپنی داستانِ غم، سانحہ
ستم گذارش کر دوں گا۔

سوداگر کے اس مضمونِ دردناک سے آنسو نکل پڑے۔ سمجھایہ بندر نہیں، کوئی نصیح و
بلیغ، عالی خاندان والا دودمانِ سحر میں پھنس گیا ہے۔ کہا ”اطینان خاطر رکھ، تیری جان کے
ساتھ میری جان ہے اب زیت کا یہی سامان ہے۔“

بندر کو تسکینِ کامل مل ہوئی، غزلیں پڑھیں، نقل و حکایات میں سرگرم رہا، اپنا حال پھر کچھ
نہ کہا، تمام شب سوداگر نہ سویا۔ اس کے بیانِ جانکاہ پر خوب ردیا۔ اب بہت تعظیم و تکریم سے
بندر رہنے لگا۔ مگر امرشدنی بہرکیف ہوا چاہے رازِ فاش ہو، اگر خدا چاہے۔ سوداگر کا یہ
انداز ہوا، جو شخص نیا اس کی ملاقات کو آتا، اسے بندر کی باتیں سنو اتا، وہ استعجاب سے غرق
بھر فکر ہوتا، ہر جگہ ذکر ہوتا۔

آخر میں اس کی گویائی کا چرچا، کوچہ و بازار میں مچا اور یہ خبر اس کو رنمک، محسنِ کُش
کے گوش زد ہوئی۔ سننے ہی سمجھایہ وہی ہے۔ بعد مدتِ فلک نے پتہ لگایا، اب ہاتھ آیا، فوراً
چو بدار بندر کے لینے کو سوداگر کے پاس بھیجا، یہ بہت گھبرایا اور تو کچھ بن نہ آیا، بصدِ عجز و نیاز
عرضداشت کی — ”غلام، صاحبِ اولاد نہیں، اس اندوہ میں دلِ مضطرب شاد نہیں، طبیعت

بھلانے کو اسے بچہ سالے کر فرزندوں کی طرح پالا ہے، رات دن دیکھا بھالا ہے، بند رہے مگر عنقا ہے،
مفارقت اس کی خانہ زاد کی جان لے گی، آئندہ جو حضور کی مرضی ہے۔“

یہ جو بدار یہاں سے خالی پھرا، وہ ظالم اظلم غضب میں بھرا، وہاں کے بادشاہ کو لکھا
”اگر سلطنت اور آبادی مملکت اپنی منظور ہو، سوداگر سے جلد بند لے کر یہاں بھیج دو، نہیں تو
ایٹ سے ایٹ بجا دوں گا، نام و نشان مٹا دوں گا۔“

یہ خبر وحشت اثر سن کے غضنفر شاہ ستر ڈھوا، شیران خوش تدبیر، امیر وزیر سمجھانے لگے کہ
”خداوند نعمت، ایک جانور کی خاطر کشت و خون نہ لوں ہے۔“

حکم ہوا کہ کچھ لوگ سرکاری دہاں جائیں، جس طرح بنے سوداگر سے پکڑ کر بند، اس کی ڈیڑھ سی
پر پہنچائیں، جب بادشاہی دستہ سرا میں آیا۔ بندر دست بستہ زبان پر لایا۔ ”اے مولیٰ غلگسار،
وفا شعار اس اجل رسیدہ کے باب میں کہد و کوشش بیکار ہے، سراسر بے جا ہے، قضا کا زمانہ
قریب پہنچا، درنا کامی دا ہے۔ مبادا کسی طرح کا رینج میری دوستی میں تمہارے دشمنوں کو پہنچے،
تو مجھے حشر تک حجاب و ندامت رہے، خلقِ خدا بُرا بھلا کہے۔“

سوداگر نے کہا ”استغفر اللہ یہ کیا بات ہے، جو کہا وہ سر کے ساتھ ہے۔“
جب بادشاہ کے لوگوں کا تقاضا شہید ہوا اور دن کم رہا، بعد رات و قدح بہ معذرت
بسیا و منتِ بیشمار، ہزار دینار دے کر، اُس شب مہلت لی اور صبح کے وقت چلنے کی ٹھہری، بوج
مثل — مصرطی زرد بر سر فولاد نہی نرم شود۔

اس عرصے میں یہ حال تباہ و ماجرائے جانکاہ گلی کو چے میں زبان زد خاص و عام ہوا کہ
ایک بندر کسی سوداگر پاس باتیں کرتا تھا، وہ بھی کل مارا جائے گا۔ بعد کیہ اُس کشتہ انتظار، مایوس
و لفکار، یعنی ملکہ مہرنگار کو بھی معلوم ہوا، وہ شیدا لے جانے عالم سمجھی کہ یہ بندر نہیں، شہزادہ ہے،
افسوس صد افسوس! اب کون سی تدبیر کیجئے، جو اس بکیں کی جان بچے۔ دل کو موس و وزیر زادے
کو کس لوگوں سے پوچھا۔ ”دمِ سحر کدھر سے وہ سوداگر جائے گا، یہ تماشہ ہمارے دیکھنے میں
کیونکر آئیگا؟“

لوگوں نے عرض کی ”حضور کے جہر د کے تلے، شاہراہ ہے، یہی ہرست کی گزرگاہ ہے۔“
یہ سن کر تمام شب تڑپا کی، خند نہ آئی، دو گھڑی رات سے برآمدے میں برآمد ہوئی اور
ایک تو تاپنجرے میں پاس رکھ لیا، گھر سے پیشتر بازار میں ہلکا، تماشا یوں کا میلہ سا ہو گیا۔

جس وقت تاجر ماہ نے متاعِ انجم کو نہاں خانہ مغرب میں چھپایا، اور شحنہ چرخ چہارم خود بخود ہی کو مشرق سے نکل آیا، سوداگر نمازِ صبح پڑھ، ہاتھی پر سوار ہو کر، کمر میں پیش قبض رکھ، گود میں بندر کو بٹھا، مرنے پر کمر مضبوط باندھ کر مجبور چلا۔ بندر سے کہا "پریشان نہ ہو، جب تقریر سے اور اصرافِ کثیر سے کام نہ نکلے گا، جو بن پڑے گا، وہ کروں گا، اپنے جیسے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ قول مرداں جاں دارد۔ مصرعی بعد از سرمن کن نیکون شد، شدہ باشد۔ سوداگر کا سرا سے سراسیمہ آگے بڑھنا تھا کہ خلعت نے چار طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگا میر سوز سہ

برقِ طیبہ یا شریر بر جمیدہ ہوں جس رنگ میں ہوں میں غرض از خود میدہ ہوں
اے اہل بزم میں بھی مرقع میں دہر کے تصویر ہوں دے لب حسرت گزیدہ ہوں
صیاد اپنا دام اٹھا لے کہ جوں صبا ہوں تو چین میں پر گلِ عشرت نہ چیدہ ہوں
اے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں بچھڑا ہوں کارداں سے مسافر جریدہ ہوں
غم ہوں الم ہوں درد ہوں سوز و گداز ہوں سب اہل دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں
صاحبِ دنیا اے دد، نیرنگی زمانہ سفلہ پرور، تو قلموں عبرت و دید کی جا ہے۔ گرما گرم
آیند و روند کا بازار ہے۔ کس و ناکس جنسِ ناپائیدار، لہو لعب کا خریدار ہے، اپنے کام میں مصروف
قضا ہے، جو شے ہے ایک روز فنا ہے، معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے، یہی مسئلہ
جبر و اختیار ہے۔ کوئی کسی کی عداوت میں ہے، کوئی کسی کا شید ہے، جسے دیکھا آزاد نہ پایا،
کسی نہ کسی بکھیرے میں مبتلا ہے۔ ایک کو اتنا سو جھتا نہیں، کیا لین دین ہو رہا ہے۔ سود کی امید
میں سراسر زیان ہے، سڑی ہونے کا سودا ہے، اُس کی قدرتِ ناطقہ دیکھو! مجھ سے بیزبان
نابیز کو یہ تکلف گویائی عنایت کیا، تم سب کا سامعون میں چہرہ لکھ دیا، باتیں سننے کو چلے آتے ہو
جدائی میری شاق ہے، جو ہے مشتاق ہے، حالِ زار پر رحم کھا، آسو بہاتے ہو، یہ رحیمی کی صفت
ہے، شانِ قہاری دیکھو، اسی تقریر کی دھوم ہے۔ ایک ظالم شوم سے مجھ مظلوم کا مقابلہ ہوتا
ہے۔ یقین کامل ہے وہ قتل کرے گا، بیگناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا۔ سَوَادًا لَوَجِدُنِي الدَّارِ
ہوگا۔ تب اُسے آرام و چین ہوگا۔ یہ گویائی گویا پیام مرگ تھا۔ دنیا جائے آزمائش ہے۔ سفیہ
جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسائش ہے، دو روزہ زیست کی خاطر، کیا کیا ساز و سامان
بیدا کرتے ہیں۔ فرعون بے سامان ہو کر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے ہیں، جب سر کو اٹھایا

آنکھ بند کر چلتے ہیں۔ خاکساروں کے سر کچلتے ہیں۔ آخر کار پھر حسرت و ارمان فقط لے کر مرتے ہیں۔ جان اس کی جستجو میں کھوتے ہیں، جو شے ہاتھ آئے، لذت سے جمع ہو، پریشانی و مشقت سے پاس رہے، آخرت سے چھوٹ جائے، یا اس وحسرت سے پھر سر پہ ہاتھ دھر رو دتے ہیں۔ ناخ ۵

دنیا اک زال بیوا ہے بے مہر و وفا و بے حیا ہے

مردوں کے لئے یہ زن ہے، بہن دنیا کی عداوت ہے دیں کی دشمن

رہتی نہیں ایک جا یہ جم کر پھرتی ہے برنگ نرد گھر گھر

انجام شاہ دگدا، ددگزن کفن اور تختہ تابوت سے سوا نہیں، کسی نے ادھر سایا محمودی کا دیا یا، تھریہ کر بلا، کسی کو گزی، گاڑھا میسر ہوا بعد کرب و بلا، اس نے صندوق کا تختہ لگایا، اس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا، کسی نے بعد سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مرمر کے گور گڑھا پایا، کسی کا مزار مٹلا، منقش، رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینہ جاہل گور تنگ ہے، حسرت دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرش خاک ہوا، نہ امیر سمور و قائم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پیٹی شطرنجی اور ٹوٹا سا بوریا لاسکا۔ بعد چندے جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گور شاہ ہے، یہ لحد فقیر ہے۔ اس کو مرگ جوانی نصیب ہوئی۔ یہ استخوان بوسیدہ پیر ہے، سو یہ بھی خوش نصیب ہے، نیک کماٹی والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں، نہیں تو سیکڑوں ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں۔ لوگ ددگور کہہ کر چلے آتے ہیں کتے، بلی، چیل، کوسے، بوٹیاں، نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامنِ دشتِ عریاں کفن گور بے چراغ صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یا اس وحسرت کے سوا کوئی نہ سر ہانے رہتا ہے، تمنا چھٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔ سالہا ہزاروں کی عمارتِ عالی، اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریع السیر رہے۔ ہزاروں رنج گور بے چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے سے طرفہ نقل ہے کہ والی دارث ان کے سر پر سلطنت، منہ حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے، مگر تبنیہ غفلوں کو قدرت حق سے گنبدوں میں آشیانہ، زاغ و زغن میناروں پر مسکن، بومِ شوم قبروں پر کتے لٹٹے دیکھے۔ میر ۵

مزارِ غریباں تاسف کی جا ہے وہ سوتے ہیں پھرتے جو کل جا بجا تھے

رنگ چمن، صرف خزاں دیکھا، ڈھلا ہوا حسنِ گلر خاں دیکھا، اگر گل خنداں پر جو بن ہے بہار ہے، غور کیا تو پہلوئے ناز میں، نشر سے زیادہ خلشِ خار ہے، سینہ فگار ہے۔ دنیا میں دن رات زق زق، بق بق ہے، کوئی چہچہے کرتا ہے، کسی کو قلق ہے، نوش کے ساتھ گزندِ نمیش

ہے، ہر رہرو کو کڑی منزل درپیش ہے۔ مولف ۵

بلبل کو خزاں میں جاں کھوتے پایا صیاد کو سر پٹک کے روتے پایا
گلچیں کی بھی نیند اڑ گئی لیک سردر جو اہل دہل تھے ان کو سوتے پایا
مذقوں صدائے مرغِ سحر کے رنج اٹھائے، کبھی دم نہ مارا، شکوہ لب پر نہ لائے
برسوں ندائے اکبر کے صدے سے، شکر کیا چپ رہے، مہینوں بگر کی آواز نے دم بند کیا، قلق جی
پر لیا، نالہ نہ بلند کیا سوچے تو وصلِ مہرویاں خوابِ شب تھا۔ لطف ان کا عین غضب تھا، تمام
عالم کی خوب سیر کی، کبھی حرم محترم میں مسکن رہا، نگاہ دھونی رماٹی، کنشت و دیر کی۔ عالم سے آیہ حدیث
و عطا و پند سنا، تا قوسِ برہن سن سر دھنا، وہ بدکیش مانع ملت صنم لطفِ زیتِ حظ نفس کا دشمن
تھا۔ یہ کوئی اندیشِ رخنہ پرداز اہل ایمان و دین کا رہزن تھا۔ تامل کیا تو ان دونوں سے دور
حد بغضِ بیرہونا معلوم، اپنے نزدیک اُن کا انجام بخیر ہونا معلوم۔ واللہ اعلم یہ لوگ کیا سمجھے،
خود اچھے ٹھہرے اور کو بُرا سمجھے۔ مطلب کی بات ہیہات دونوں کی سمجھ میں نہ آئی، بایں دانائی،
اُن سے خدا سمجھے، مولف ۵

اچھے کو بُرا جڑے کو اچھا سمجھے کتنی یہ بُری سمجھ ہے اچھا سمجھے

دنیا فقط رہگذر ہے، ہر دم مثالِ تارِ نفس درپیش سفر ہے، تازیت ہزاروں مسندے
ہیں۔ ڈر ہے مرنے کے بعد باز پُرس کا خطر ہے۔ کسی طرح انسان کو مفر نہیں، کون سانس ہے،
جس کی تلاش میں ضرر نہیں۔ حاصل کار یہ ہے کہ دنیا میں جینے کی خوشی، نہ مرنے کا غم کرے،
تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے دگر نہ شرے

نیم شبے آہِ زندِ بیرِ زال دولتِ صد سالہ کسند پامال

دل شکستہ کی دلداری، پافتادہ کی مددگاری کرے۔ ہوا و ہوس جو دل سے دور ہو جائے
تو مال سے، یا کمال سے عجب و سخت نزدیک نہ آئے۔ عنایتِ ایزدی پر قانع ہو، شکر ہر نیت
پاس خدمت کر، منہیات کا مانع ہو، رنج کا حامل رہے۔ سب رنگ میں شامل رہے، زمانے
کے مکروہات سے گھبرائے نہیں۔ صحبتِ غیر جنس سے نفرت کرے، تو بدنامی پاس آئے نہیں، دولت
کا اعتبار کیا، مفلس سے تنگ و غار کیا، ایک دن مرنا ہے جینا مستعار ہے، اس پر کس کا اختیار
ہے۔ نیک عمل کا خیال رکھے کہ قید مہتی زیت کا نام ہے، رہائی یہاں سے انجام ہے۔ شعر
کسی کے مرگ پر اسے دل نہ کیجئے چشمِ تر ہرگز بہت سارے اُن پر جو اس جینے پر مرتے ہیں

عمر خضر کی تمنا اور حشمت خسروانہ، خزانہ قاروں کی فکر میں ہر ایک صبح و مسا ذیل و غوار
 ہے تحصیل لا حاصل کوشش اس امر میں سراسر بیکار ہے بقول ناسخ
 ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت
 جو علم و ہنر رکھتے ہیں وہ ہیں محروم مانوس ہے بل احمق و خر سے دولت
 روپے کا جمع ہونا، جواہر کی تلاش میں دن کا جاگنا، چاندی سونے کی امید میں رات کا نہ
 سونا، یسین تن لعل بوں سے بہم ہونا، جنہیں میسر ہر بار ہے، انہیں مفارقت دینا ناگوار ہے، اور
 یہ کلام ہے۔ مولف

یاں کے جانے سے جی اُلجھتا ہے کیا ہی دلکش سرائے نانی ہے
 سلف سے اہل کمال، دنیا کے مال سے محروم رہے، جو سزاوار حکومت تھے، وہ محکوم
 رہے۔ شعر

اسپ تازی شدہ مجروح بزمیر پالاں طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم
 لیکن کبھی صبحِ عشرت ہے، گاہ الم کی شام ہے، دنیا عجب مقام ہے، نہ امیر ہوتے عرصہ
 نہ فقیر ہوتے کچھ دیر ہے، اس کار گاہ بے ثبات میں عجب اندھیر ہے۔ سودا
 ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار رکھتا نہیں ہے ہاتھ عناں کا بیک قرار
 جن کے طویلے بیچ کئی دن کا ذکر ہے ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
 اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے سوچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار
 اور جب وعدہ آپونچا، تو نہ روپہ کام آتا ہے، نہ فوج ظفر موج سے کچھ ہو، نہ تمہیں
 جرّار بچاتا ہے نہ کوئی آشنا دست آڑے آئے۔ نہ عزیز و اقربا، پیچھے ملک الموت سے چھڑائے
 اگر یہی امر مانع قضا، قدر ہوتے، جمشید کا دس، دارا و سکندر بصد حسرت و افسوس جان نہ
 کھوتے۔ نیک عمل کرے تو وہ ساتھ جاتا ہے، احتیاج کسی کی برلائے۔ یا اللہ کچھ دے یہ
 البتہ کام آتا ہے، دگر نہ دنیا سراب زندگی، بدتر از حباب ہے، پابند اس کا خراب، ترک کرنے
 والا نایاب ہے۔

ترک دنیا کا سوچ کیا ناسخ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں
 اس گلشنِ ہستی میں عجب سیر ہے لیکن جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دنیا خوابیت کیش عدم تبیر است صید اجل است از جوان در پیر است
ہم روئے زمین پڑ است وہم زیر زمین ایں صفحہ خاک ہر دو رو تصویر است
الامقضا نے عقل یہ ہے کہ عالم اسباب میں کسی اسباب کا پابند نہ ہو، تعلق خاطر نہ رکھے،
ہمیشہ اسنے بھلے سے برائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے یعنی جہان گزراں سے۔ اس کا شاکی تھا بادشاہ
سے فقیر تک، جو ان پیر تک حقیقت میں نفسِ امّارہ سخت ناکارہ ہے، اسے پچھاڑے۔ گرد ہوا دہوس
سے دامن جھاڑے ۷

دیوانہ باش تا غم تو دیگران خوردند آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش
آدمی کو لازم ہے وہ بات پیدا کرے، تا صفحہ دنیا پر چنڈے بنیکی نام یاد رہے۔
اس طرح جی کہ بعد مرنے کے یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے
دنیا میں کسی سے دل نہ لگائے کہ یہ کارخانہ بہت بے ثبات ہے۔ وصل سے فرحت،
ہجر کی مصیبت اپنے سر پر نہ لائے کہ مرجانے کی بات ہے۔ معشوقِ با وفا غنقا کی طرح نابیدا ہے
اور پر دغا ہر جانی ہر جا مہیا ہے، خواہش کا انجام کاہش ہے، تمنا دل سے دور کرنے میں جان
کی آسائش ہے۔ مولف ۷

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنائے خراب و خستہ میں اس دل کی آرزو سے ہوا
مگر دوائے غفلت، ہائے نادانی، کہ جب نشہ جوانی کا موسم پیری میں خمار اترتا ہے۔ اس
وقت آدمی سر پر ہاتھ دھر کر روتا ہے۔ وقت از دست رفتہ و تیر از شست جست کب ہاتھ آتا
ہے۔ ناچار ہو کفِ افسوس مل کر پچھتااتا ہے، گزشتہ راصلوات کہہ کر دل کو سمجھاتا ہے۔
آدمیوں کو بندر کی تقریر و گزارش پُر اثر سے عبرت و حیرت حاصل تھی۔ کبھی نصیحت و پند گاہ
کلام، رنگین و دلچسپ بادل دردمند، کبھی سخنان و حشت افزا سنا تا چلا جاتا تھا، اہلِ دل طبیعت
کے گداز سے روتے ساتھ آتے تھے، ہر فقرہ پُر درد پر ضبط نہ ہو سکتا تھا، چلا تے تھے، خلقِ خدا
جنازے کی طرح ہاتھی کے ہمراہ تھی، ایک عالم کے لب پر نالے تھے، فغان و آہ تھی۔ اسی سامان
سے ملکہ کے جہر د کے تلے پہنچے۔ وہ منتظر تمام شب، نالہ بلب سوداگر سے بولی —

”ایک دم ٹھہر جا، میں اس کی تقریر کی مشتاق ہوں۔“

سوداگر نے ہاتھی روکا، ملکہ نے کہا۔ ”اے مقررِ بے زبان، گم کردہ خانمان! اگرچہ اب

ہم کس لائق ہیں، مگر تیری داستانِ ظلم و جور کے شائق ہیں۔“

بندر نے آواز پہچانی، پہلے تو خوب رویا، پھر جی ٹھہرا کہ کہنے لگا۔ شعر ہے
ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویش تن فریاد

میرے
کیونکہ کئے کوئی نہیں آگاہ اک قیامت بپا ہے یاں بہر راہ
کچھ چھپا، اب نہیں رہا یہ راز ہے جہاں اس سے سب سخن پرداز
بس تغافل نہ کر تر حسم کر گوشِ دل جانبِ تکلم کر
شعر ہے

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند دد تین ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
انوس یار نے عیاری کی، دعا سے یہ ذوبت، ہماری کی، جس کا ردنا ہمیں ناگوار تھا،
وہ ہمارے لو کا پیاسا، قتل کا ردادار تھا۔ یہ مثل سچ ہے، تیرھویں صدی ہے، نیکی کا بدلہ بدی
ہے۔ مجبوریوں کی تمنا، دل میں رہی، وطن جانے کی حسرت اب و گل میں رہی، دوستوں کا کہنا مانا،
وہ آگے آیا، پچھتا نا پڑا، بے اجل جلاد کے فریب سے ذبح ہوئے، طالب و مطلوب جان جوکوں
میں پھنسے، زندہ درگور ہوئے، الحق دنیا دم مارنے کی جانیں۔ راز کسی سے کتنا اچھا نہیں۔
منصور حلاج نے کلمہ حق کہا تھا، ناحق لوگوں نے دار پر کھینچا، غرض جو بولا، وہ مارا گیا، جان
سے بچا دیا گیا، کہتے تو کہا پر سوچ کر بات بنائی، جی میں دہشت آئی کہ مبادا یہ خبر اس اکفر کو پہنچے
تو یقین کامل ہو، جان دشمن ظالم سے نہ بچے، کہا، اے ملکہ! کوئی کسی کماں سے دنیا میں نہال
ہوتا ہے یہ بیگناہ، گویائی کے سبب ناحق حرام زادے کی بدولت حلال ہوتا ہے۔“ مولف سے

کماں شے ز دال شے ہے اس پر لاکھ حاسد ہوں بھلا نازاں نہ ہوں کیونکر میں اپنی بے کماںی کا
خدا جانے ہے، دیکھا دیکھ کر یہ چاند منہ کس کا ہوئی ہے عید غیروں کو ہمیں ہے چاند خالی کا
میں نے اپنے ہاتھ سے پاؤں میں کھڑی ماری، فلک نے بنا کہ بات بگاڑی۔ مصرع
اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی — شعر ہے

گل دکھیں کا گلہ، بلبل خوش لہجہ نہ کہ تو گرفتار ہوئی، اپنی صدا کے باعث
اب سردست کچھ تدبیر بن نہیں آتی ہے، صورتِ مرگ آئینہ چشم میں مد نظر ہے، ہماری
ہمیں کو خبر ہے، کوئی گھڑی میں مفت جان جاتی ہے، جو جانتا ہے، وہ دیکھتا ہے، جسے خبر

نہیں، اس سے کہہ دو، تمہارے واسطے غریب دیار ہوئے، اور تمہارے سبب سے قتل کے سزاوار ہوئے۔ شعر ہے

بحرم عشق توام می کشند و غوغایست تو نیز بد سیر بام آ کہ خوش تماشا یست
ان باتوں سے رہے سے شک ملکہ کے بر طرف ہوئے، سمجھی جان عالم یہی ہے، جواب دیا جو جانتے تھے، ان سے کیا ہو سکا، انجان کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ، اور توتے کی گردن مروڑ پیچرا باہر نکالا، بندر کی نگاہ جو پتھر سے پر پڑی، سمجھا ملکہ پہچان گئی، یہی فرصت کا وقت ہے، ہنگامہ و تلاطم تو پچھا تھا کسی نے دیکھا نہ بھالا، بندر سوداگر کی گود میں لیٹ کر توتے کے قاب میں پردار کر آیا، تو پھر پھر کا، ملکہ کا خوشی سے دل دھڑکا، پیچرا اندر کھینچ لیا۔

سوداگر نے دیکھا، بندر مر گیا، چاہا ہلاک ہو جائے، بدنامی کا قبضہ پاک ہو جائے۔ جو شخص خواصی میں بیٹھا تھا، سمجھا نے لگا۔ ”بندہ پر دریشکر کرنے کی جا ہے، شکایت کا موقع کیا ہے، حرمت رہی، جان بچی، مرگِ فرزند سے ماں باپ کو چارہ نہیں، مرجانا بحرِ حقائق، عقلمند کو گوارا نہیں۔ اگر بادشاہ جبر سے چھین کر مار ڈالتا، جان کھونے کی جگہ تھی صبر کیجئے، جو خدا کی مرضی اسکی رضا میں مجبوری ہے، جائے صبروری ہے، صابروں کا مرتبہ بڑا ہے۔ ان کے حق میں اللہ فرماتا ہے، ”اِنَّ اللّٰهَ صَعَابُورٌ“

تماشائیوں پر جو یہ حال کھلا، رد نے پیٹنے کا دونا، شور و غل مچا۔ سب نے متفق یہی کہا، بسکہ بندر عقیل تھا، یہ پیام طلب کوس رحیل تھا، سامنے جانے کی نوبت نہ آئی۔ سوداگر کی گود میں جان گزائی، اپنا قتل جو ثابت ہوا، خوف سے مر گیا، داغِ تقریر ہمارے صفحہ دل پر دھڑکیا، یہ خبر اس کا فر اکفر کو پونچی۔ اس پر بھی چین نہ آیا، لاش منگا جلا کر دل ٹھنڈا کیا، خاک تک برباد کی، جب تسکین ہوئی۔

وہاں ملکہ منہ نگار پیچرہ لے بیٹھی۔ لوگوں کو پاس سے سرکا دیا۔ میاں مٹھو نے ہو ہو ابتدا سے اتہا تک مفصل سب حال سنا دیا کہ ”اس طرح نشہ کی حالت میں اس کے رد نے پر عمل بتایا، وہ ہمیں پر عمل میں لایا، بندر بنایا، پھر چڑیا کے جال میں پھنسے، دوست روئے، دشمن ہنسے۔ وہاں سے سوداگر، متاعِ خوبی سمجھ کر اپنے پاس لایا۔ فلک نے بعد خرابی بسیار، آج تم سے ملایا۔“

ملکہ نے کہا ”خاطر پریشان جمع رکھئے، انشا اللہ تعالیٰ جلد کوئی صورت ہوئی جاتی ہے۔“

یہاں یہ گفتگو تھی کہ اس لطفہ شیطان کی آمد ہوئی، ملکہ باہر نکل آئی، تعظیم کی، ہمیشہ یہ معمول تھا، جب وہ آتا، ملکہ بات نہ کرتی، خیف ہو کر اٹھ جاتا۔ اس روز جو گفتگو ہوئی، وہ مردک سمجھا، بندر کا مرنا، چشم ملکہ نے دیکھا، اس سے دب گئی، ہم کلام ہوئی۔ اب جلدی نہ کرو، امروز و فردا مقدمہ درست ہو جائے گا، لیکن پہلے اس سے فیصلہ شرط ہے۔ ملکہ کے باپ کا بہت ڈر تھا، اس باعث ملکہ سے ہر اس کرتا تھا نہایت پاس کرتا تھا، جب رخصت ہونے لگا۔ ملکہ نے کہا: "ایک بکری کا بچہ خوبصورت سا ہمیں بھیج دو پالیں گے، ربخ کو طالیں گے۔"

یا تو چپ رہتی تھی یا آج بچہ مانگا۔ یہ بچا بہت خوش ہوئے۔ اسی دنت ایک برہری کا بچہ تحفہ بھیجا دیا، دوسرے روز جو آیا ملکہ کو زیادہ متوجہ پایا۔ اس کے رو برد بچے سے کھیلا کی۔ دو تین روز یہی صحبت رہی، ایک روز ملکہ نے بچے کو دبا کر ادھ موا کہ دیا اور چو بدادہ دوڑایا۔ شہزادے کو جلد بلالا، عرض کرنا: "اگر دیر لگاؤ گے جیتا نہ پاؤ گے۔"

یہ خبر سن کر وہ محل سرا کا عازم ہوا، ملکہ نے پنجرہ اس ہمارے ادج سلطنت کا پلنگ کے پاس رکھ لیا۔ جب وہ نابکار رو برد آیا، ملکہ نے بچے کو گود میں اٹھا اس زور سے دبایا کہ وہ مر گیا، اس کا مرنا، اس کا نالہ فریاد کرنا، گریبان چاک کرنے کی، بکھیرا پاک کرنے کی تدبیر کی، وہ بیقرار ہو کر بہت بولا، "ملکہ! ہزار بچہ اس سے اچھا ابھی موجود ہوتا ہے، تم کیوں روتی ہو؟" ملکہ نے اُسی حالت میں کہا "میں کچھ نہیں جانتی، تم اسے ابھی جلا دو، جو میری خوشی چاہتے ہو۔"

وہ بولا "بھلا مردہ کہیں جیسا ہے، کبھی کسی نے سوائے مسج ایسا کیا ہے؟" ملکہ نے رو کر کہا "واہ تم نے میری مینا جو جلائی تھی، جب میں بلبلائی تھی، یہ دل میں سمجھا کہ شاید شہزادے نے یہ حرکت کی ہوگی۔ کارخانے مسبب الاسباب کے معروف و مشہور ہیں۔ دنیا میں مثل ہے کہ کہہ کر دکھ نیافت۔ جس نے جیسا کیا دیا پایا، ہر فرعون نے راموسی قطعہ سے اسے یار جو کوئی کسی کو کلپا دے گا۔ یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا۔ اس دار مکافات میں سُن اے غافل بیدار کرے گا آج کل پاوے گا۔ وہ بدحواس ہو چھنے لگا۔ "ہم نے مینا کیونکر جلائی تھی؟" ملکہ بولی۔ "تم پلنگ پر لیٹ رہے تھے، وہ جی اٹھی تھی، یہ پتہ بھی درست پایا، اور قضا کا زمانہ قریب آیا۔" کہا "بچہ گود سے رکھ دو۔"

ملکہ نے پھینک دیا، وہ پلنگ پر لیٹا، اپنی روح بکری کے بچے کے قالب میں لایا، وہ کوہ نے لگا، ملکہ مہرنگار نے گود میں لیا، پیار کیا وہ سوچا، دو گھڑی ملکہ کی طبیعت بہل جائے، پھر روح قالب میں لے جاؤں گا، مطلب تو نکل آئے۔ یہ نہ سمجھا فلک کی گھات ہے، فریب کی بات ہے، چرخ کو کچھ اور منظور ہے اب اس جسم میں جانا، بہت دور ہے۔

شہزادہ جانعالم یہ سب معاملہ پنجرے سے دیکھ سُن رہا تھا، فوراً اپنی روح اپنے جسم میں لانا کھڑا ہوا، یہاں وہ بُزدلا، جانعالم کو دیکھ کر تھرا گیا، خوف چھا گیا، سمجھا قسمت اب بُری ہے، کوئی دم کو کلا اور چھری ہے۔ ملکہ نے جلد دو انچھروہ پڑھ کر پھونک دیئے کہ وہ اور کے قالب میں روح لے جانا بھول گیا۔ پھر انجن آرا کو بلایا، کہا "لو صاحب! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہماری حرمت و آبرو کو بچایا، بچھڑے سے ملایا، یہ آپ کا احق الذی شہزادہ ہے، وہ بکری کا بچہ بے دین، دزیر زادہ ہے۔" یہ کہہ کر تینوں عاشق و مستوق لگے مل مل، خوب روئے جو جو محرم راز تھیں دوڑیں، مبارک سلامت ہوئی۔ جانعالم نے اسی وقت سوداگر کو طلب کیا، حال مفصل کہہ دیا۔ بعد اداے شکر نعمت خلعت و انعام ہر اقسام کا عنایت کیا، وطن آنے کا وعدہ حتمی لیا، پھر چڑ پکار اور اس کی جو رو کو بلایا، بہت زور و جواہر دیا، اور بہ مشورہ غضنفر شاہ اس مملکت کے چڑ پکاروں کا چودھری کر دیا، پھر شکرِ ظفر پیکر کو حکم تیاری سامان سفر فرمایا۔ آپ رخصت ہونے غضنفر شاہ کے پاس آیا۔ آخر کار بدقت تمام طوں کلام درازی ایام مفارقت والدین کہہ کر اُسے راضی کیا۔ پیش خیمہ اسی دن لڈ گیا۔ دو چار دن رخصت کی دعوتوں میں اور لگے۔ اخیر جلسے خوب دھوم دھڑ کے ہوئے۔ اپنے عمل تک وہ ساتھ آیا۔ تمام لشکر نے پکا پکایا پایا، پھر رخصت ہوئے۔ وہی دو چار کوچ ایک دو مقام کرتے بہ راحت و آرام چلے۔

درودِ شکرِ نصرتِ اثرِ دشتِ پرِ خوف و خطر

میں لبِ حوضِ خیام شاہی ہوتا، ساحرہ کا آنا، تمام شکر کو نصف پتھر بنانا
پھر ملکہ کے باپ کا آنا اور جادوگر نیوں کی لڑائی، شہپاں کا قتل، فوج کی رہائی

نگارندہ داستانِ عجیب یہ لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب
طلسمِ جہاں دید کا ہے مکاں پھنسنے اس میں رہتے ہیں پیر و جوان
ولیکن ہنساجو کوئی غنیمت ساں ہوا مثلِ گلِ دستبردِ خزاں
جسے ہم نے دیکھا وہ تھا دلِ حزیں خوشی کی جگہ پہنچ ہے دنیا نہیں

محررانِ جادو نگار و سحر ساز، آفتابِ فساد ہو شراب، حیرت پر دراز نے لکھا ہے کہ جان عالم
ہر صبح مثلِ مہر درخشاں، قطع منازل و مراحل، یعنی کوچ ہر شام، مانند ماہ تاباں، مقام کرتا،
چند عرصے میں پھر اسی دشتِ ادب اور صحرائے خار خار، جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارد ہوا حوض
کے متصل سراپردہ خاص نصب ہوئے، گردِ شکرِ نصرت اتر اتر۔ انجن آرا اور ملکہ مہر نگار کو
وہ چشمہ دکھایا۔

جب دن تمام ہوا، نمازِ شام کے واسطے جدا خیمہ میں تشریف لایا، نماز پڑھ کر کسلِ راہ
سے پسنگڑی جو ہر نگار کبھی تھی، اس پر لیٹ رہا، سستی کے باعث غنودگی سی تھی کہ دفعۃً ایک
خواص، خاص انجن آرا کی، بدحواس دوڑی آئی، کہا شہزادہ جان عالم کی عمر دراز ہو، نصیبِ ثمنان

شہزادی کی طبیعت ناساز ہے، شدت سے کھجے میں درد ہوتا ہے، وہ نقشِ سلیمانی اور لوح
 دیجے دھو کر پلا دیں۔ "عارضہ مزاجِ مطلوب و بد مزگی طبیعتِ محبوب سن کر بقرار ہوا، کچھ نمیند کا
 خمار، کچھ طبیعت کا انتشار، دیکھنا نہ بھالا، لوح و نقش حوالہ کیا۔ نقش دیتے ہی نقشہ بگڑ گیا،
 ایک آواز مہیب پیدا ہوئی کہ "اے جانِ عالم! بہت دنوں اڑتا پھرا، مدت کے بعد پھنسا، خبردار
 ہو جا۔" ایسی آواز ہولناک تھی کہ سب لشکر ڈر گیا، شجاعوں کے دل تھرا گئے، محل میں زندگیوں
 کو غش آگئے، گھبرا کر شہزادے نے اٹھنے کا قصد کیا، جگہ سے ہلانہ گیا، غور جو کیا تو آدھا جسم پتھر
 کا ہو گیا تھا، پھر تو جو جہاں بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا، جو کھڑا تھا اٹھتا رہ گیا۔ ہر طرف غل اور
 شور تھا جو پڑا تھا مردہ گور تھا، کچھ دکھ کچھ ہنسی، تمام فوج آفتِ ناگہانی میں پھنسی، عجب کھلبلی مچی،
 نامردوں کی بائی بچی۔ کل لشکر، انسان سے حیوان تک، نیچے کا دھڑ پتھر کا، اور اوپر کا جسم بدستور۔
 آہ و نالہ و فریاد و ہکاسب لشکر میں بپا تھا اور مجلسِ امیں بھی یہی ہنگامہ مچا تھا۔ ہر ایک گہ فکار بلا
 تھا۔ وہ زندگیوں کی زاری، انجنِ آرا کی بیکراری۔ علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان
 کا پتا تھا جب وہ کستی تھی شعرے

ہر دم زمانہ داغِ دگر گو نہ در دہد یک داغِ نیک ناشدہ، داغِ دگر دہد
 تمام لشکر میں از شام تا پگاہ، ہر ایک کے لب سے نالہ جانکاہ، بلند رہا، جس وقت
 ماہِ دمِ سرد بھرتا، نقابِ سیاہ روئے تاباں پر ڈال کر غمِ کدہ مغرب کی طرف روانہ ہوا اور
 آفتابِ جگر سوختہ مشرق سے نکل کر، خدنگِ آہ جکیں کا نشانہ ہوا، ایک ابر تیرہ دتار آیا،
 آدمی سب خوفزدہ دیکھنے لگے۔ اس ابر سے اڑدہا خونخوار، شعلہ فشاں، آتش دہاں نکلا، ایک زندگی
 اُس پر سوار، آتش بار شہزادے کے خیمے میں اتری۔ جانِ عالم نے پہچانا کہ وہی جادو گر نی ہے۔
 دل سے کہا۔ شہر اپنا دور رہا، موت قریب آئی۔ قسمت نے کس جگہ لاکر نیرنگی دکھائی، وہ بولی۔
 "جانِ عالم! کہو اب کیا قصد ہے؟"

شہزادے نے کہا "وہی جو تھا؟"

اُس نے کہا "اب وہ نقشِ سلیمانی اور لوحِ پیر مرد کی نشانی کہاں ہے، جس کے بھروسے
 پر کودتے تھے۔ اگر زندگی مع لشکر درکار ہے، تو ملکہ اور انجنِ آرا سے انکار کرو، ہماری اطاعت اور
 محبت مقدم جان کر، ہم سے دار و مدار کرو۔ نہیں تو ایک دم میں سب کو بے گور و کفن طعمہ زار و
 زغن کر دوں گی۔ دشت لاشوں سے بھر دوں گی۔"

شہزادے نے کہا "ہمارے لوحِ دل پر نقشِ ارادت حافظِ حقیقی، کلکِ قدرت سے منقش ہے۔ عادت سے مجبور ہوں، یوفائی سے دور ہوں، جو کہا سو کہا، جو کیا سو کیا، اگر قضا آئی ہے، مرنے سے کیا چارہ ہے، مگر جیتے جی بات جانی کب گوارا ہے۔"

یہ سن کر جل گئی، غصے سے رنگت بدل گئی، کچھ بڑبڑا کر جانِ عالم پر پھونکا، یا نصف پتھر تھا اب حلق تک پتھر ہو گیا۔ حسرت و یاس سینہ میں بھری تھی۔ تصویرِ آذری سی پلنگڑی پر جس د حرکت دھری تھی۔ وہ تو اڑ دھے پر چڑھ کر اڑی اور پکاری "اے اجل رسیدہ آج کے دن اور رات کی مہلت ہے، اگر صبح کو بھی انکار کیا تو یاد رکھنا، لشکر کا خون اپنی گردن پر لیا۔"

یہ سنا وہ تو ہوا ہوئی۔ جب تک شہزادہ آدھا پتھر تھا تو ملکہ اور انجن آرا اپنے اپنے خیموں سے گہرا کر پکارتی تھیں، جانِ عالم جواب دیتا تھا۔ یہی آواز کا سہارا، اُن کی زلیست کا سبب تھا، اب تک حلق پتھر ہونے سے وہ جس قافلہ گم کردہ راہِ دشتِ غربت بے صدا ہو گیا۔ وہاں صبر کا راہبر جدا ہو گیا ہر چند دونوں چلائیں، شہزادے نے مطلق جواب نہ دیا، بولا ہی نہ گیا۔ پھر تو ملکہ مہرنگار بادلِ فگار سرپیٹ کر کہنے لگی۔ میر حسن ے

فلک نے تو اتنا ہنایا نہ تھا کہ جس کے عوض یوں دلانے لگا

مژدہ اے مرگِ غریبِ الوطنی! خوب جیلہ ہاتھ آیا، تو بدنامی سے بچی، ہم نے ناکامی میں جان دی، ہر رخ ستم شعار زور رنگ لایا۔ انجن آرا بے چاری مصیبت کی ماری، سب کا منہ حیرت سے تکتی تھی اور روتی تھی۔ نہ بین کر آتے تھے، نہ غل مچایا جاتا تھا، گھٹ گھٹ کر جان کھوت تھی۔ خواصیں سر کھول کر کہتی تھیں "ہے ہے! ہم اس جنگی ویران میں لٹ گئے، وارث سے چھٹ گئے شعر ے

تو وہ کریم ہے ناشاد کو جو شاد کرے مراد مند کو ہر طرح با مراد کرے لوگو! ہم کہہ رہے جائیں، کیونکہ اس بلا سے نجات پائیں۔"

کوئی کہتی تھی۔ "شیطان کے کان بہرے۔ خدا خواستہ اگر جانِ عالم کے دشمنوں کا رنگٹا میلا ہوا، شہزادیاں خاک میں مل جائیں گی، غمِ جدائی سے جانیں گنوائیں گی۔ ہم ان کے ماں باپ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس دشتِ ادبار میں سرٹکرا کر مرجائیں گے۔ یہ جادو گرئی قربان کی تھی، یونہی بے گور و کفن رکھے گی۔"

اور آؤں محل دار جگر انگار سر سے چادریں پٹک مدینے کی طرف پکار پکار یہ شعر

تصدق اپنے نواسوں کا یا رسول اللہ کہو یہ حل کریں مشکل ہماری حضرت شاہ
ایک طرف مغلائیاں، غم کی ماریاں، دم گرم آہ سرد بھرتی تھیں۔ ایک سمت امیں
جلیسیں، بجھت کی طرف بال کھول کر التجا سے، گریہ و بکا سے، یہ عرض کرتی تھیں شعر
تم نے مدد کی نوح کی طوفان سے کشتی پار کی یا مرتضیٰ مشکل کشا کیوں بار میری بار کی
کوئی کتنی تھی "ہمارا لشکر اس بلا سے جو نکلے گا، تو مشکل کشا کا کھڑا دونادوں گی۔"
کوئی بولی "میں سہ ماہی کے روزے رکھوں گی، کوندے بھروں گی، صمنک کھلاؤں گی،
دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی۔"

کسی نے کہا "میں اگر جیتی تھی، جناب عباس کی درگاہ جاؤں گی، سقائے سکینہ کا علم
چڑھاؤں گی، چہل منبری کر کے نذر حسین سبیل پلاؤں گی۔"
غرض کہ لشکر سے زیادہ خیموں میں تلاطم پڑا تھا۔ صدائے حزیں نالہ ہر غمگین سے ہنگامہ
مشر بیتھا۔ اتفاقاً ایک شارد ملک کے باپ کا رشید فن سحر میں دیدہ شنیدہ، اس مرد بزرگ
کی ملاقات کو بروئے ہوا اڑا جاتا تھا۔ یہ نالہ بلند صدائے ہر درد مند اس کے کان میں جو پہنچی،
زمین کا متوجہ ہوا دیکھا تو ایک لشکر عظیم بہ حال سقیم سحر کا مبتلا ہے، شور و غل ہو رہا ہے۔ جب
قریب آیا طرفہ ماجرا نظر آیا کہ انسان سے تاجانور سب آدھے پتھر ہیں، سمجھا کہ سحر شہیاں میں خراب حال
ہیں۔ لوگوں سے پوچھا "یہ ستم رسیدہ لشکر کس کا ہے، کہاں سے آیا ہے، کس نے یہ حال بنایا ہے؟"
وہ ملک مہرنگار کے ملازم تھے، اپنا حال سب نے بیان کیا جب اسے یہ امر معلوم ہوا کہ
استاد زادی کی خانہ بربادی ہے، درخیمہ ملک پر آیا، سرچٹا چلایا، ملک نے آواز پہچانی کہا بھائی!
اس وقت پردہ کہاں کا، یہاں آکر بالمشافہ ہمارا عذاب اور حال خراب دیکھو۔ وہ اندر آیا۔
ملکہ کو بھی اسی عالم میں پایا۔ اس نے فرمایا "عداوت ساحرہ سے ہمارا قافلہ تباہ ہے۔"

وہ عرض کرنے لگا "فدوی کو اس کی ہمسری کی طاقت نہیں اور وقفہ کم، سچ سب کا رخت
درہم برہم ہو جائیگا، بحر آپ کے والد بزرگوار کے تشریف لائے، یہ بلا ملتی نہیں، لہذا حافظہ
ناصر ہے۔" یہ کہہ کر بھال خسہ و تباہ لب پر نالہ دآہ اس تیز قدم سے چلا کہ ادھم صبا کی
ڈپٹ ہر قدم شمار تھی، ٹھوکر دوں میں سر سر بیقرار تھی۔ پھر بھر میں وارد باغ ہوا، گل سا
چاک گریباں غنچے کی طرح خوش، شبنم نمط اشک رواں۔

بیر مرد نے فرمایا "خیر ہے!"

اس نے شتمہ گرفتاری جانعالم، ملکہ کی بیقراری، انجن آرا کا الم، شکر کا حال ابتر، کہہ کر عرض کی "جلد چلئے اگر شام تک نہ پہنچے، وہاں صبح ہی دم سحر ملک الموت کا بازار گرم ہو گا۔ ارمان سب دل میں رہے گا، کشتوں کو عالم بے دلی وارث کسے گا، کوئی گور و کفن نہ پائے گا، خاتمہ بالآخر ہو جائیگا۔"

بیر مرد نے آہ سرد بھر کر فرمایا "افسوس! شہزادے کو سب کچھ سمجھایا تھا مگر عمل میں نہ لایا۔"

میر سوزے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اسی دم شاہین تیز پرواز پر سوار ہوا، مغرب کی نماز شکر میں داخل ہو کر پڑھتی تھی۔ پہلے جانعالم کے خیمے میں آیا، حال دیکھ کر سخت گھبرایا۔ پھر انجن آرا کی جا کر تسکین کی، وہ رونے لگی۔ وہاں سے ملکہ کے پاس آ کے کہا "تمہاری بد بختی نے ہماری وضع میں فرق ڈالا، برسوں کے بعد باغ سے نکالا۔"

ملکہ نے رو کر عرض کی "یہ وقت تدبیر ہے نہ ہنگام تعزیر، بعد رہائی اس آفت سماوی کے

جو چاہنا فرماتا۔"

القصد مجبور و ناچار وہ عارت با وقار شہزادے کے خیمے کے نزدیک، دور تک حصار کھینچ کر بیٹھا، یہ مرد بزرگ نیک صفات فن سحر کے سوا عامل اسم ذات کا تھا، کچھ پڑھنے لگا، کبھی مناجات بد رگاہ مجیب الدعوات کرتا کہ "اے یاور زبردستان و سرفرو کنندہ گردن کشاں! اس بوڑھے کی شرم تیرے ہاتھ ہے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، اخیر وقت کا تو حافظ و نگبان ہے، مجھ پر جو مشکل ہے، تیرے روبرو آسان ہے، سفید داڑھی کو بدنامی کے دسمے سے نہ رنگنا، تیرہ بختی کا دھبیہ اس ریش سفید پر نہ لگانا۔ شکر

مشکل ز تو جستہ تو آساں آسان ز تخاف ز تو مشکل

جبکہ سجادہ نشین، چرخ اول یا مجمع مریدان، کو اکب حجرہ مغرب میں روپوش ہوا

اور ساحر فلک چہارم پڑ شوکت و با حشم طلسم مشرق سے نمودار، با جوش و خروش ہوا اور وہ

عبادت گزار، پیر جہاں مرد و شب زندہ دار و ظائف صبح سے فرصت پا چکا تھا، یکایک وہ

نا بکار شیطان صفت ناپاک عورت اژدہ ہے پر سوار، بچشم خونخوار، بعزم قتل جانعالم

لشکر میں تنہا آئی۔ پہلے ملکہ کے باپ پاس گئی۔ آنکھیں لال لال، طیش کماں اور بہ آوازِ کرخت پکاری ”اے مردِ پیرست تدبیر! تیری اجل بھی دامنگیر ہو کر کشاں کشاں اس دشتِ جانفشاں میں لائی ہے، مجھے شرم آتی ہے کہ تو پیر نو دو سالہ ہو چکا ہے بے مارے مر رہا ہے، تیرے قتل میں بدنامی چھٹ فائدہ کیا ہے، جدھر سے آیا ہے، سیدھا چلا جا، میں بیک نگاہ کج، نشانِ لشکر اس صفحہ زمین سے مثلِ حرثِ غلط کا ردِ سحر سے مٹائے دیتی ہوں۔“

مرد بزرگ نے آشفۃ ہو کر فرمایا ”اے ننگِ فرقہ نبی آدم، مردودِ عالم! تجھے جوشِ شہوتِ دلولہ مباشرت نے آمادہ قتل ہزار بندہ اللہ بے جرم و گناہ کیا، میں مرگِ عزیزان دیکھوں، مرنے سے ڈروں! بقول تیرے آج نہ مواکل مر جاؤں گا، جیسے جی خلق کو کیا منہ دکھاؤں گا، ہچکچاہٹوں سے ناصق آنکھ چھپانی پڑے گی، تو بدبخت مجھ سے کیا لڑے گی۔“

یہ سن کر وہ فاحشہ جھلا، آستین چڑھا، سحر کی نیرنگیاں دکھانے لگی۔ اُن کی بھی دُعا کی تاثیر پیر بن کر اُس کا سحر اس پر ڈھال رنگ مٹانے لگی۔ صبح سے پردن باقی رہا، کوئی دقیقہ طرفین سے نہ باقی رہا، طول اس مقام کا بیجا تھا۔ اسی کلمے پر تمام کیا کہ جب وہ عاجز ہوئی تب سحر کی طاقت سے شیرنی کی صورت بنائی۔ پیر مرد بھی اسد اللہ الغالب کو یاد کر وہ مہیب شیر بہر بنا اور اس طرح للکار کر گونجا کہ جنگل کے چار پائے نعرے کے غوغا سے دریا میں گرے اور پانی کے جانور خشکی میں چھپتے پھرے۔

کچھ دیر اس ہنیت میں لڑائی زور آزمائی رہی۔ آخر کار وہ رو بہ خصال اس ہنر برنمستانِ شجاعت کی تاب نہ لائی۔ گیدڑ بھلی دکھائی اور عقاب بن کر اڑ چلی۔ وہ شاہین اوجِ دلیری سوچا بے گرفتاری طاؤسِ مطلب اس ڈھنگ کے لشکرِ جنجال سے نہ نکلے گا۔ اسی طرح یہ پھٹکی پھٹکی ٹہنی کے اڑ میں شکار کھیلے گی۔ بلا سے کچھ ہو اسے پھنساؤ، زور میں کم پایا تھا، فوراً باز تیز پرداز ہو کے اس سناٹے سے پنگل آہنی میں اسے دبوچا اور ایسا نوچا کہ اس کی جان سٹمنا گئی۔ بھاگتے وقت رجالِ الغیب سامنے تھا، موت پہنچے جھاڑ کر پیچھے پڑی۔ بہت ترپڑی، پنجنہ قضا سے نہ چھٹ سکی۔ اسی کشمکش میں انچا کھینچی میں مرغِ روح اس کا مجروح نفس تن سے اڑ کر آشیانہِ جہنم میں پہنچا۔ غلغلہ حشر و شور نشور اس صحرا میں نزدیک و دور مچا۔ ہر طرف سے دار و گیر کی صدا آئی۔ آسمان چکر میں آیا۔ زمین تھرائی، دشت تیرہ دکنہ ہوا، آندھی چلی سحر کا کارخانہ اُڑ گیا، ابر ہوا۔ قریب شام وہ سیاہی موتوں ہوئی۔ خورشید نے رخ انور دکھایا، اپنا بیگانہ نظر آیا۔

جان عالم گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اہل لشکر نے رہائی، از سر نو زندگی پائی۔ جان عالم خیمہ سے نکل نام
 و خجل بیر مرد کی خدمت میں حاضر ہوا، سب نے دیکھا، دور حصار میں ایک رنڈی، اسی نوے برس کا
 سن، ضعف کا زور و شور، بڑھاپے کے دن، قد کمان مرنے پر لیس، آنکھیں تودہ طوفان جسم کا
 ہر پٹھا در پٹہ زویدگی، گھنی ہوئی رگیں، صاف نظر آتی تھیں۔ ہڈیاں پسلیاں بوسیدہ جلد کے باہر سے گنی
 جاتی تھیں۔ دُرُج دہان بے دُرِ دندان، حقہ خالی کی طرح دا، داڑھ دانت کے نام سے منہ میں تنکا
 نہیں، بھاڑ سا کھلا، بایاں ہاتھ سا کھوکا ڈالا اور دہنا برگد کا ٹٹنا، قد کا ڈول نرالا، عوج بن عُنُق
 کی خالہ، ٹانگ ہر ایک تاڑ سے بڑی کھڑی ہو، تو سفت بے ستون کی اڑداڑ ہو، گنبد چرخ کی پاڑ
 ہو، پھیلائے پڑی تھی گو یا پتھورا کے محل کی کڑی تھی، سینہ پُر کینہ تنگ، پھائیوں کے کتے کتے
 کی طرح سیدھے لٹکتے، پیٹ کے پیٹ کی انتہا نہیں۔ بے خاک گور کبھی بھرا نہیں، دل پہاڑ کی سل
 سے سخت تر، گردہ توپ کا، ہمسر ہڈی سے گوشت، گوشت سے کھال جُدا، پیر زال فر بادکش بڑھیا
 چہرے کا یہ رنگ کہ سلٹ کی پیر کا اس کے رو برد منہ سفید ہو جائے، شبِ فرقت کی سیاہی میں
 کالی بلا سی نظر آئے۔ کھونپڑ کا وہ ڈھنگ کہ سب کہتے تھے بیچا ہے، رطکوں کو کاٹ نہ کھائے۔
 ماتھے پر سیتہ دور کا ٹیکا، دور سے نظر پڑتا اور سفید چونڈا، چنور کی طرح لٹکتا، سیاہی کا دھبہ بھر
 تیرہ بختی کہیں نہ دیکھا۔ ایسے سر کی مانگ میں بھی مانگ جا پُنج، سینہ دور بھرا، بالوں میں ناریل کا
 تیل، پھٹے پھٹے دیدوں میں ندیدوں کی طرح کاجل ریل پیل، گننے کے عوض سانپ بچھو لیٹے،
 کھوپڑی اور ہڈیوں کے ہار گلے میں پڑے، سحر کا سنگار کئے، پشت پر بہشتِ رودے ٹخن سوئے جنم
 جت پڑی تھی۔

شہزادہ بیر مرد کو ساتھ لے کر محلہ کے خیمے میں آیا، شہزادیوں نے جان پائی، جلیسوں کے
 منہ پر رونق آئی۔ خواصوں نے شکرِ جناب باری کیا، ماما اسیلوں نے بیر مرد کے قدم پر گر کر عرض کیا۔
 مصرعے - اے آمدت باعث آبادی ما

اس بزرگ نے فرمایا "ابھی اس معرکے سے نجات نہیں ہوئی، آفتِ عظیم کا سامنا باقی ہے۔
 جان عالم نے پوچھا - "قبلہ اودہ کیا ہے؟"

اس نے فرمایا "اس کا باپ شہنشاہ جادوان ہے، کوئی دم میں ضرور آئے گا، بکھیرا
 مچائے گا۔"

ملکہ مہرنگار مضطرب ہوئی، بیر مرد نے فرمایا "اللہ یار ہے وہ کیا نابکار ہے۔ مصرعے

دشمن اگر قویست نگہاں قوی تر است

یہ کہہ کے دو ماش چپ و راست پھینکے، دو جانور نئی صورت کے پیدا ہوئے، ہرن کے چہرے، طاؤس کا دھڑ، یا قوت کے سینگ، الماس کی آنکھیں، زمرد کے پر، اور دو ٹھیکریوں پر کچھ لکھ کے اُن کے سامنے رکھا، وہ ہر ایک چوہے میں اٹھا، اڑ گیا۔ وہ رات بھی بیم و ہراس میں گزری جس وقت ساحر شب بیدار عامل صبح کی آمد کے دب دبے سے بھاگا، ہوا تند چلی، برق چمکی، رعد کی آواز ہوئی۔ اہل لشکر ڈر گئے۔ مثل مشہور ہے۔ مار گزیدہ از ریسان پیچیدہ می ترسد۔

پیر مرد کے گرد سب جمع ہوئے۔ ایک سمت سے غول کے غول، غٹ کے غٹ، جادو گروں کے جھٹ پٹ بازجرے باتے بھینگے پر ننگے دھڑنگے۔ سوار قطار قطار آئے۔ میدان میں مرشد کامل نے ان پر پراجہ پایا۔ دوسری جانب سے جادو گرنیاں طاؤس اور ناگنوں پر سوار آتشباری کے حقے اڑائی، ناریل اچھالتی، اکتارے چھیڑتے، بادے کی جھنڈیاں، ہوا سے اڑتی ہوئیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ سحر آزمائیاں، ہاتھوں کی صفائیاں ہوتی، لڑائی کے عزم پر ہر ہر کرتی، موجود ہوئیں۔ اسی پرے کے مقابل ٹھہریں، انھیں دیکھ کے جالو عالم کا جی کلبلا یا، فوج کے سرداروں کو، فرمایا گو آج دغدغہ کامل ہے، مگر یہ جلسہ اور معرکہ دیکھنے کے قابل ہے۔ زندگی ہے تو ایسا روز کبھی کا ہے کو نظر سے گزرے گا۔ ورنہ مرگ انہوہ جتنے دارد۔ ہماری بھی فوج چمک دمک سے صفت آرا ہو، اسباب سب نیا نکالو۔

یہ خبر سن پہلے بیلدار نکلتے، پست و بلند زمین ہموار کر کنکر پتھر چُن کر جھاڑی جھنڈی کاٹ ڈالی۔ جھاڑی ہوتی زمین صاف برابر نکالی۔ پلیٹوں کی خاطر مورچے درست کئے، توپوں کے لئے مدد سے باندھے، جھانکی لگائی۔ کہیں سرنگ کا رنگ جمایا۔ باروت کو بچھایا۔ میدان جنگی بنایا۔ پھر سے آبپاشی کر گئے۔ تو پچانے والے بالچوں میں پانی بھر گئے، فوج کی آمد ہوئی۔ صفت کارزار آراستہ ہونے لگی۔ راست و چپ پانچ پانچ سو ہاتھی مست، پٹے سونڈوں میں چڑھے، ایک ایک پہلوان قوی، ہیکل زرہ پوش گرز گراں بردوش، ان پر سوار، پھر پلیٹیں اور توپخانہ آیا۔ انھیں قرینے سے جمایا، کیا کیا، توپ فلک شکوہ سورج جھنکار، اور نایک متی کی سی، گردوں گرداں پر چوٹ کرتی۔ مدد کو ہوٹ کو سوں کی چوٹ کی، اور غبارے جس کا گولہ قصر چرخ میں اتارے، پھر سواروں کے پرے میں مینہ و میرہ قلب و جناح ساقہ و کیس گاہ درست کر دیا۔ آگے ہراڈل پیچھے سواروں کے پیدل، فوجوں کے دل۔ نقیب۔ چار سو سے بھلے، بھلے سے کھلے، کنوتی سے

کنوٹی، پٹھے سے پٹھا، دُم سے دُم، سُم سے سُم ملایا۔ نشان برداروں نے علم سبز و سرخ زرافشاں کو جلوہ دیا۔ سر ہر علم ماہی پرچم کی چمک، چشم دلاوران میں بادۂ جرات کا کام کر گئی۔ نامردوں کو ہول ہوئی۔ بھاگنے کی فکر پڑی۔ پیٹ میں کھل بلی مچی۔ کتوں کی چلتے چلتے کانٹا چلی۔ دریا سے فوج نظر موج موجزن تھا۔ غرش کوس حربی صدائے نقار خانہ جنگی چرخ پر بُرج ٹوڑ تک زیر زمین گاؤں ٹری کو پونجی، اور صدمہ دمامہ، تندر نہیب، آواز دہل گوش فریب سے کرہ ارض و سما دہل گیا اور کرناے چینی نے غریب سے صور کی ہمدی کا دم بھرا۔ اِذَا ذُلْزِلَتْ اُكَا دُضْ ذِلْزِلَ السَّيْءُ کا وقت قریب آیا۔

جان عالم بھی بصد چشم اس پری پیکر پر جلوہ گرہ ہوا، پتھر زنگار، بالائے، سرتاج شہریاری کج رکھ کر شمشیر برق دم زیب کمر، فولادی سپر پشت پر، بائیں ہاتھ میں مرکب کی عنان، دہنے میں نیزہ اثر دہا پیکر دو زباں، فتح و نصرت جلو میں، اقبال یا درتگ و دو میں۔ ہمت و غیرت دست بستہ بہم۔ جرات زیر قدم۔ قریبوس زمین میں کمان کیانی، چہرے پر رعب و جلال کشورستانی۔ سمندر صرگام کو گرم عنان کر کے پرے کے برابر باگ لی، چادش طرار، خبردار باش للکارا۔ مرتجح سا خنجر گزار بالائے چرخ، الاماں پکارا، اگر دیکھتوں نے کرہ کا، شروع کیا، نقیبوں نے نہیب دی۔

”دلادر دبا آج عرسہ جنگ، جگہ نام و رنگ کی ہے۔ دنیا میں زندگی چار دن ہے۔ روتے بھڑنے کا، نوجوانوں! یہی سن ہے، کسی کو بقا بجز ذات خدا نہیں، ہمیشہ دنیا میں کوئی رہا نہیں۔“

شعر

رستم رہا زمیں پر نہ سام رہ گیا مردوں کا آسمان کے تلے نام رہ گیا

اس صدا سے جو صدا کے بہادر، صاحب جرات تھے۔ ان کا دریاے شجاعت سینے میں موجزن ہوا، مونچھیں کھڑی، آنکھیں سرخ چہرے بشاش ہو گئے۔ بسان شیر وہ دلیر قبضہ ہائے شمشیر دیکھنے لگے اور چست و چالاک ہو کر مستعد کارزار ہوئے۔ جانفشانی کو تیار ہوئے۔ ہر دم باہم یہ اختلاط تھا، دیکھیں آج تلوار کس کو خوب کاٹتی ہے۔ کس کس کا لہو چاٹتی ہے۔ پہلے نیزہ کس کا سینہ عدد پر چلتا ہے، نیزے کی طعن پر کون چھاتی تانتا ہے، لوہا کون مانتا ہے، کس کے تیر کے نشانے سے خون کا فوارہ اچھلتا ہے۔ آبِ پیکان دشمن کے حلق میں کون اتارتا ہے۔ سر پیکان کس کا تابِ سوفر سرخرو ہوتا ہے۔ کس کو کون للکار کر، ڈانٹ کر مارتا ہے، دُدا کو کون پکارتا ہے۔ عرصہ کارزار میں حق نہک آقا کا ادا کیجئے، دشمنوں کا لہو پیچئے۔ جب بگڑے تو وہ کام بنے، جس سے رستم

کی گور تھرائے، سام و زریان کا رنگ فق ہو جائے، کوہ کو پرکاش کی طرح اکھاڑے۔ دیو سامنے آجائے تو پچھاڑے۔ رئیس قدرداں سر میدان سرگرم نظارہ ہے دیکھنے کون کام آتا ہے، کون ناکارہ ہے، کس کے ہاتھ کھیت رہتا ہے، کون کون کھیت رہتا ہے، من چلا پن کر لو، زر سرخ و سید سے سپریں بھر لو۔ آج ہی تو آن بان ہے یہ گوٹے یہ میدان ہے دہل گنڈوں کا، لاجول ولا، یہ ڈول ہوا کہ ہول سے چہرے زرد لب پر آہ سرد، منہ پر ہوائیاں اڑتی تھیں، ہر بار بھاگنے کو باگیں مرطقی تھیں، کھڑے ہوئے اپنے منہ نوچتے تھے، بھاگنے کی راہ سوچتے تھے، پیٹ پکڑے پھرتے تھے۔ دست سرد دست چلے آتے تھے، ڈر کے مارے بے مارے موٹے جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا — ”میاں جی ہے تو جہان ہے، نوکری نہ ملے گی، بھیک مانگ کھائیں گے، جانیں کہاں پائیں گے۔ حرمت گئی تو گئی، جان تو رہے گی، لو کی ندی تو بدن سے نہ بے گی۔ یہی نا کوئی نامرد کہے گا، آبرو جائے گی جی تو رہے گا۔ یہاں کی بگڑی کہیں اور بنالیں گے، تیر تلوار کی گولی، بچا کر گالیاں کھالیں گے، لڑنے کو سپاہیوں نے کھریں باندھی ہیں۔ کو سنے کو ہم موجود ہیں، کوسوں بھاگنے کو آندھی ہیں۔ جونکیں لگانے میں ہمارے ماں باپ بھنگ پلاتے تھے، معجون کھلاتے تھے، کسی کی فصد کھلی دیکھ کر ہمیں غش آتے تھے۔ ہم تو دوست ہو یا دشمن، دونوں کی خیر مانگنے والے ہیں۔ سب سے پہلے معرکے سے بھاگنے والے ہیں۔ ہمیشہ گالی گلوچ کو خانہ جنگی، دھول دھپتے کو میدان داری سمجھے۔ لڑائی بھڑائی سے کبھی پھڑکے نہ نکلے۔ تمام عمر بدن میں سوئی نہ گڑنے دی۔ گالیاں کھا کھا کے زندگی کی۔ بے غیرتی کا بھلا ہو، جس نے آج تک جان سلامت رکھی۔ اس پر بھی قسمت نے یہ دن دکھایا۔ خدا نے ہمیں ہی بھڑا کیوں نہ بنایا۔“

فوج میں تو اس طرح کھلبلی مچی تھی۔ ادھر انجن آرا اور مہرنگار نے ایک ادنیٰ ٹیکرا تجویز کر خیمہ بپا کیا چلن چھوڑا بیٹھیں، سیر دیکھنے لگیں۔ اس عرصے میں لشکر غنیم کی آمد ہوئی۔ یعنی شہپال جادوگر سیاہ رو، نولاکھ ساحر ہمراہ رکاب، شکست انتساب لے کر تخت پر سوار، چالیس اژدر فوٹخواہ تخت اٹھائے۔ بڑے کرد فرسے آیا۔ فوج بے قیاس، وہ خدا نا شناس لایا، اور سامنے جو انان تہمتن و گرداں صف شکن کے اپنا پر اجمایا، پھر علم کالے آگے نکالے اور پرچم سیاہ ہم صورت بخت اس گمراہ کے کھلے، دت و دے دجھا بھجھ بھجنے لگے۔ ادھر کوس و کور گر جھنے لگے۔

وزیر اس کا پیام پیر مرد پاس لایا۔ دستِ ادب باندھ کر عرض کی ”ایلیچی کو نردال نہیں، زیادہ گوئی کی مجال نہیں“ شہپال نے فرمایا ہے، تمہارا جینا مرنا برابر ہے کہ گرم و سرد زمانہ

دیکھ کر عمر طبعی کو پہنچے، مگر ان نوجوانوں پر رحم نہ کیا، ان کے خون کا حساب اپنی اعمال کی کتاب پر لکھوا، بوجھ اپنے ذمے لیا۔

پیر مرد نے جواب دیا "اُس اجل رسیدہ پیر نابالغ سے کہنا، طرفین سے جس کا خون زمین پر بہے گا، اس کا مظلمہ، مواخذہ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی، اس کی گردن پر رہے گا۔ ہم سمجھتے تھے وہی ننگ خاندان تھی، لیکن اب معلوم ہوا، ایسوں کے دیسے ہی ہوتے ہیں۔ تجھے سفید داڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مری، تیرا کھنک کا ٹیکا مٹا، تو تو اس سے بھی زیادہ بے حیا، سیہ قلب نکلا۔ یہ مقام رزم ہے، جائے نیزہ و شمشیر یا بزم ہے، جو محل تقریر ہو، گفتگو بے فائدہ ہے۔ لاطائل باتوں سے کیا حاصل، جو منظور ہو، بسم اللہ۔ اس میں دیر نہ کرو۔ دیکھیں آج کس کے جھٹے میں تخت و تاج ہوتا ہے، اور گور و کفن کو کون محتاج ہوتا ہے؟" وزیر محبوب پھر اٹھ پال سے سب حال کہا، پھر تو وہ کافر غدار، گیر ناہنجار مثل مارِ دم بریدہ، بر خود بیچیدہ ہو، شعلہ غضب سے وہ ناری جل گیا۔ چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ پہلے تو آپ حقہ آتش پر مرد پر مارا، پھر لشکر کے سرداروں کو للکارا، دوپہر تک عجیب و غریب سحر سازی و ہنگامہ پردازی، جادوگر اور جادوگریوں کی لڑائی رہی کہ دیکھی نہ سنی۔ کسی نے کسی کو جلایا، کسی نے بچھایا، کسی سنگدل نے پتھر برسائے، سب کچھ سحر کے نیرنگ دکھائے۔

آخر کار جب جادوگری ختم ہوئی، لڑائی کی نوبت بگمزد و شمشیر و نیزہ و تیرائی۔ پھر تو شہزادہ جان عالم کی بن آئی، باگ اٹھائی، فوج جرّار، غازیانِ نامدار خبردار ہوئے۔ سپاہ مانند ابر چہار سمت گھرائی، برق شمشیر چمکی۔ پہلوانوں کے نعرے نے رعد کا کام کیا۔ خوب لوہا برسا۔ یہ سب تازہ دم، وہ دوپہر کے مثل سیکڑوں ٹاپوں میں کچل گئے۔ گھوڑوں کی جھپٹ میں کھنڈل گئے، شمشیر ساعتہ خصالِ جان عالم کا یہ حال تھا، جس کے سر پر پڑی، خود دوسرا اس خود سر کا کاٹا، حلق میں قطرہ سیلاب کی طرح اتر، سینہ پر کینہ کا لو چاٹا۔ وہی سر جو پناہ خود میں تھا، پلک جھپکی تو گود میں تھا۔ پھر گھوڑے کے تنگ سے چڑھت گذر۔ زخم کشادہ کر خانہ زمین سے زمین میں قرار لیا، سر بالیں اس کی قضا کو روتے دیکھا، اسے خوابِ مرگ میں پاؤں پھیلائے، سوتے دیکھا۔ جس پر لپک کر ایک دار کیا، دو کیا، دو کو چار کیا۔ جو اس نمشہ کسی کے درست نہ تھے ششدر ہو گئے۔ ساتویں طبق زمین کے تھراے، آسمان کو چکر ہوا، مردے قبروں سے چونک کر باہر نکل آئے، جو اٹکا اسے مار لیا، بھاگتے کا بیچیانہ کیا۔ گھڑی بھر میں خون کا دریا بہہ

گیا۔ لاشوں کا انبار رہ گیا۔ کاسہ سر جاب دریا کی طرح بہتے نظر آتے تھے۔ موجِ خون میں دھڑ دھڑا دھڑا غوطے کھاتے تھے۔ دشمنوں کی کشتی، زیت طوفانی تھی، آبِ تیغ کی طغیانی تھی۔ فوجِ عدو کا زندگی سے دل سیراب اور اچاٹ تھا، لو لہان ہر تلوار کا گھاٹ تھا۔ کوسوں تک لاشے پٹے تھے۔ یہ پاٹ تھا۔

آخر کار فوج کی شکست ہوئی۔ شہپال کو مار سراسر خود سر کا مثل خیار تر، اتارا گیا۔ سپاہ باقی ماندہ اس تیرہ بختِ نگوں سار کی فرار ہوئی، زندگی دشوار ہوئی۔ پھر تو غازیان فتح نصیب و جادواں مہیب لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ سب کچھ لوٹا، ساز و سامان ان کا ذرا نہ چھوٹا۔ ادھر نشان کھلے، شادیاں بکے، وہ سب چادر پھراتے، ماتم کرتے، اگر بیان چاک سرور د آغشہ، بخاک دم بھرتے۔ جن کا منہ جدھر اٹھا، بھاگ نکلے۔ میدان کشتوں سے اٹ گیا جنگل لاشوں سے پٹ گیا، آج تک طعمہ زارغ و زغن اسی بن سے ہے۔ صحرائی درندوں کے خوب پیٹ بھرے، بلکہ جانوروں کی دھوئوں کو گوشت کے چمچے قیمے کئے اٹھا رکھے۔ بہت ہیضہ کر کے مرے۔ وہ سر زمینِ قلعہ خزانہ جان عالم کے قبضے میں آیا۔ بڑی جستجو اور تنگاپو سے وہ لوح اور نقش پایا۔ پیر مردِ نخت ہوا اور جتنے مدارج پند و نصیحت تھے، مکرر سمجھائے راہ کا خطر، مصیبت سفر ہر منزل و مقام کا نفع و ضرر کہہ کر کہا "میری جان! اب ایسی حرکت اور سامان نہ کرنا جو پھر کوئی روزِ سیاہ دشمنوں کے سامنے آئے۔ دوستوں سے دیکھا نہ جائے ہم سے باغ چھوڑائے، لو اللہ حافظ دنا صر ہے رسول اس کا اور تمہارا مددگار دیار ہے۔"

نزولِ موکبِ شوکت و جلال بعد فتح جادو شہپال

ساحلِ دریاے شور پر، جہاز کا آنا، شہزادے کی طبیعت کا لہرنا، پھر سوار ہونا،

اور جہاز کی تباہی باہم کی جدائی، انجمنِ آرا کی بے سرو پائی، جوگی کی ملاقات

آشیانِ بحرِ تقریر و غواصانِ محیطِ تحریر، شناسا درانِ شطِ الفت، غرقِ لجنہِ محبت نے گوہرِ آبِ دارِ سخن کو سلکِ گفتار میں منسلک کر کے، زیبِ گوشِ سامعانِ ذی ہوش اس طرح کیا ہے، کہ بعد فتحِ جنگِ جادو شہپال اور ہاتھ آنے خزانہٴ مالا مال کے دو مہینے تک عساکرِ نصرت اثر، شب و روز اس دشت میں جلوہ افروز رہا۔

جب پیر مردِ باغ کو تشریف فرما ہوا، جانِ عالم نے کوچ کیا۔ چند مدت کے بعد ایک روز خیمہٴ دریاے شور ہوا۔ شہزادہٴ مستوقوں سے باہم تماشاے بحرِ زخار و امواجِ پچیدار اور سیرِ دریاے ناپیدا کنار کی۔ پانی کا زور ہوا سے دریاے شور کا شور کیفیتِ لطمہ و گرداب دیکھتا تھا۔ نظم ۵

آب کیسا کہ بحر تھا زخار	تند و موج و تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کناہ طوفان پر	مارے چشمکِ حبابِ عُمان پر
گذرِ موج جب نہ تب دیکھا	ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

ناگاہ ایک جہاز پر تکلف، بالِ نقش و نگارِ بسیار، صبا دار نمودار ہوا۔ شاہزادہ سمجھا کوئی سوداگر کہیں جاتا ہے۔ جب قریب آیا، جہاز کو لنگر کیا اور ناخدا درِ دولت پر شرفِ اندوز ہو کر

عرض کرنے لگا۔ ”ہم لوگ ملاح ہیں۔ یہاں جو شاہ و شہریار رونق افروز ہوتا ہے ہم اسے دریا کی سیر و شکار بحری جانور آبی دکھاتے ہیں۔ موافق قدر جو قسمت میں ہوتا ہے، انعام پاتے ہیں۔“

یہ سن کر خواہش سیر دریا شہزادے کے سفینہ دل میں موجزن لطمہ پیرا ہوئی۔ ملکہ سے کہا ”چلتی ہو؟“

اُس نے عرض کی ”ہنوز گرداب غم تلاطم اندوہ دالم سے ساحل فرحت و طرب کی ہلکاری میسر نہیں ہوئی، آپ کو اور لہر آئی، نیا ڈھکوسلا سوچھا۔“

جان عالم نے کہا: ”دریا کی سیر جی مسرور کرتی ہے، خفقان دور کرتی ہے، طبیعت بہل جاتی ہے۔ تم نے سنا نہیں قول سعدی مصرعہ بدریا در منافع بشمار است — چار گھڑی دل بہلا چلے آئیں گے۔ ملاح محروم نہ رہ جائیں گے۔“

ملکہ مہرنگار نے متردد ہو کر کہا: ”یہ سب سچ ہے جو آپ نے فرمایا۔ خفقان کیسا، تمہارے دشمنوں کو مایہ خویا ہے۔ میں نے بارہا انجن آرا سے کہا، سو یہ مرض لاددا ہے، پانی سے دونا ہوتا ہے، اس کے سوا میرے دماغ میں بھی کیا خلل ہے، میرا دوسرے مصرعہ پر عمل ہے۔ سعدی کا — اگر خواہی سلامت برکنار است۔“

شہزادے نے فرمایا ”خیر ہم تو سڑی ہیں، تنہا جائیں گے، تم نہ چلی بیٹھی رہو، آرام کرو، جذائی کی تاب، محبت کے مبتلا کو کہاں ہے، الفت کا یہی بڑا امتحان ہے۔“

ناچار اسی دم ملکہ مہرنگار اٹھی اور انجن آرا مع چند خواص ہمراہ ہوئی۔ جہاز پر پہنچے بادبان کھینچے۔ پالیں چڑھیں، مہرنگار مضطرب دار یہ شعر پڑھنے لگی۔ حافظ سے

دریں دریا بے پایاں دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مچر بہا دم رہا

لوگ مصروف تماشا، ملکہ غریق بحر تفکر، غوطہ زن گرداب تخر لطمہ اندوہ الم کی آتش، بار بار انجن آرا سے کہتی تھی ”خدا خیر کرے۔ دشمن نہ ایسی سیر کرے، بے طور موج الم سر سے گذرتی ہے، خود بخود پانی دیکھ کر جان ڈرتی ہے، اللہ حافظ و نگبان ہے، سراسر سامان بد نظر آتے ہیں، کلیجہ

خوت سے لرزاں ہے۔“

القصہ چار گھڑی جہاز نے بادِ مراد پائی۔ سیر دکھائی پھر آفت آئی، ناخدا چلایا، ملاح حراساں ہوئے۔ شہزادے نے پوچھا ”کیا ہے؟“

عرض کی کہ "طوفانِ عظیم اٹھا ہے"

ابھی یہ ذکر تھا کہ ہوا عالمگیر ہوئی، جہاز تباہی میں آیا، بادبان ٹوٹ گئے، مسؤل گرا، ملاؤں کے چھکے چھوٹ گئے، سنبھالنے کا مقدور نہیں رہا۔ آخرش تلاطمِ آب، صدمہ پیچ و تاب موج سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی۔ کون ڈوب گیا، کون جیتا رہا۔ ایک سے دوسرا جدا ہو گیا۔ جانعالم تختے کے سہارے سے ڈوبتا رہتا چار پانچ دن میں کنارے لگا۔ جب مکانِ پانی کی موقوف ہوئی غش سے آنکھ کھلی، دیکھا کنارے کیا ہوں بلکہ گور کے کنارے لگ رہا ہوں۔ بڑی جدو کد سے اتر۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا ایک طرف چلا۔ ایک بستی میں پہونچا، وہاں کے باشندے اس کا چہرہ اور جمال یہ خراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے، 'قرب آئے، کوئی بولا "یہ پریرا دہے" مثل سرود آزا دہے، چمن حسن و خوبی کا شمشاد ہے"

کسی نے کہا "ابھی تو دن ہے۔ یہ از قلم جن ہے"

عرض کہ جن جن نے اُسے جن کہا تھا، پاس آپکھ خوف ساکھا۔ اس طرح بولے۔ استاد

کون ہو کیا ہو سچ کہو، حور ہو یا پری ہو تم

مصرعہ

جانعالم نے دمِ سرورِ دل اندوہیں سے بھر چشمِ تہ کر ان لوگوں سے کہا۔ لا اعلم

حالے دارم چناں کہ دشمن خواہد جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد

ناکامی خویش را اگر شرح دہم دشمن بخدا زندگی من خواہد

ایٹھا الناس میں گم کردہ کاروان جس کی طرح نالاں ہوں، دل گرفتہ نقشِ پائے

یارانِ رفتہ ہوں، محنت میں گرفتار ہوں، پچھڑوں کا طالبِ دیدار ہوں۔ غریبِ دیار بیتاب دانہ

نصیب ہوا نہ آب۔ مفارقتِ یارانِ چند سے خستہ و خراب حیران ہوں۔ ہوش و حواس یک لخت

زائل، ضعفِ سدا راہ۔ نا طاقتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آئی نہیں۔ دیدہ دیدار طلب میں

مینائی نہیں، نہ تابِ رفتار نہ طاقتِ گفتار۔ مولف سے

ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

کیسے مذکور جب ہوتا ہے کچھ گزرے فساؤں کا

کہ باعثِ فتح کا ہوتا ہے کھل جاننا شاؤں کا

مٹے گا داغِ کب دل سے مرے ان نوجوانوں کا

بھلا دیواں ہو کیونکر جمع ہم آتشِ سیاہوں کا

یہ

لسانِ نقشِ پا بیٹھے جہاں وہاں سے نہ پھر سر کے

بیاوردستانِ پھروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے

علم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظفر ہم کو

چھڑائے جبر سے بیرفلک نے دوست سب میرے

شرِ منہ سے بھلنے میں سرورِ دل حسیں ہر دم

اس حکایتِ جانسوز، شکایتِ چرخِ بے مہر غم اندوز سے سب رونے لگے کہا "یہ

شہزادہ عالی تبار ہے، 'الادل از دست دادہ' محبوبوں سے دور افتادہ، اس سبب سے دل افکار ہے، 'منت و سماجت سے مکان پر لے گئے، ہاتھ منہ دھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ شہزادہ جانعام آب و طعام دیکھ کر رو دیا۔ یہ کہا۔ استاد سے

ہو خاک بھوک کی اس فاقہ مست کو پھر جھانجھ جو اپنا خون جگر روزِ ناشتہ سمجھے
خدا جانے میرے پچھڑوں کا کیا حال ہوا! کسی کو دانا پانی میسر آیا یا کچھ نہیں پایا۔ میں
بھی نہ کھاؤں گا۔ بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔"

وہ بولے "حضرت سلامت کھانے پینے سے انکار نادانی ہے، اسی سے بشر کی زندگانی ہے
جو جیتے ہو تو کسی روز پچھڑوں سے مل جاؤ گے، وگرنہ غربت کے مرجانے میں، گور و کفن بھی
نہ پاؤ گے۔"

ناچار سب کے سمجھانے سے دو ایک نوالے بجز حلق سے اُتارے، پانی جو پیا، ہاتھ پاؤں
سنسناٹے، پیہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری۔ سب حال پُر ملال، جہاز کی تباہی، انیسان ہمارا
کی جدائی، اپنا ڈوبتے اچھلتے، وہاں تک آنا، اوروں کا پتہ نہ پانا بیان کر کے بقول مرزا حین بیگ
صاحب یہ کہا ہے

ہمربان رفتند و ما ماندیم و دزدان در کیس خانہ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ
سب تاسف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا "یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے، کوہ مطلب کہ
نام ہے اس پر جوگی کا مقام ہے۔ مرد بالکمال، شیریں مقال، ہزاروں کوس سے حاجت مند،
اُس کے پاس جاتے ہیں، سب کے مطلب بر آتے ہیں۔ بسکہ اس پر عنایت باری ہے، چشمہ فیض
اس سے جاری ہے، مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم ناکام، اس مقام سے نہیں پھرا۔"
یہ مرزدہ سُن کر چہرہ پر بشارت چھا گئی۔ گئی ہوئی جان اسی آن بدن میں آگئی۔ گھبرا کر
یہ شعر پڑھا ہے

آنانکہ خاک را بنظر کیسا کنند آیا بود کہ گوشہ چشمتے بما کنند

اسی دم چلنے کا عزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے، کہا "ابھی جانے کی طاقت آپ میں
آئی نہیں، پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کر دو، قوت آجائے
تو مختار ہو۔"

غرض کہ جانعام نے ان لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مقام کیا، عجب پریشانی میں

میں صبح کو شام کیا، گرد وہ سب حلقہ زن، یہ بہ اندوہ معشوقان گرفتار رنج و مہن کبھی تو محزون
چپ رہتا، گاہ مثل مجنوں خود بخود بکنے لگتا، اور جب اس خمہ درست ہوتے یہ خمہ پڑھتا
استادہ

ہر سو خبر الفت کی کیا آپ سے پہونچائی
کیوں مجھ سے بگڑتا ہے او کافر ترسائی
آگے بھی مرے لب پر فریاد کبھی آئی
تا داشت دلم طاقت بودم بہ شکیبائی
چو کار بجا آمد زیں پس من و رسوائی

گاہے مرے لب پر ہے فریاد گئے انہاں
یہ جائے ترحم ہے کہ رحم ذرا جاناں
پیارے غم دوری سے میں سخت ہوں ابناں
در زانوئے الفت دوران تو چو مہجوراں
تنہا منم و آہ از غم تنہائی

ہے دن کو تو یہ عالم ظالم ترے مجنوں پر
سونے کی کسے فرصت اے یار اے باد کر
ہیں گرد کھڑے لڑکے جھولی میں بھرے پتھر
شبہا منم و اشکے و زخون ہمہ بالیں تر
عشق این ہزم فرمودار عیب نفرمائی

اعضا شکنی گاہے کہ درد جگر دیکھو
گردن زدنی ہوں میں شکوہ کردوں تیرا گو
رد مال بھگوتا ہوں لاکھوں ہی کبھی درد
صد رنج ہی بینم اے راحت جاں از تو
از دیدہ تو اں دیدن چیزیکہ تو بنمائی

تھاتا ب دتھل میں یکتا جگر خسرو
تم اب تو نوازش لو چل کہ خبر خسرو
آگے تو نہ بہتے تھے سلک گہر خسرو
بس دُر کہ ہی ریزد از چشم تر خسرو
کہ دست بردوں رفتت سر رشته دانائی

آخرش وہ رات کی رات، ہزار عقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی، نماز صبح کے بعد پہاڑ کی
راہ لی۔ چار دن میں ناچار وہ راہ طے کی، پہاڑ پر پہونچا، سنگ سفید کا پہاڑ بہت آبدار مانند ہت
جو انمردان صاف باطن، سر بلند اور مثال طبع سخن دوران فرح افزا و دل پسند، درہ ہائے فراخ
کشادہ، روشن جوش نباتات رویدگی، ریاحین و لالہ زار سے اور خروش مرغان خوش الحان
سے رشک صد گلشن چشمائے سر و شیریں جا بجا فرہاد کی روح کا ٹھیکا، ہر قسم کا میوہ دار درخت
قدرت حق سے اُگا، پھولا پھولا۔ پتھر ہر ایک معدن لال، پرند چرند صاحب حسن و جمال۔

یہ سیر دیکھتا چلا، ایک طرف درخت گنجان، گھنے پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے اور

منڈھی کا گنبد بسان گنبد گردان بے ستون کا جواب بنا، ترسول گڑا، کھاروے کی جھنڈی،
 پھر پھر اڑتی۔ کلمہ شہادت بخط جلی اس پر لکھا۔ جب اس کے نزدیک آیا، دور دور تک مکان صاف
 صحن شفات پایا، منڈھے کے روبرو درخت کے تلے، چوڑے کے اوپر ایک جوگی ستو سوا سے
 برس کا سن و سال، مگر ٹانھا کمال، داڑھی نان سے بڑھی، گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راگھ سے بھری،
 قد بوس ہو رہی۔ پاؤں پر پڑی، پلکیں دیدہ ہیں کا اسرار چھپانے کو، چشم حاسد کی گزند بچانے
 کو، مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موج دریا کی طرح جھریاں پڑیں، کمر میں کر دھنی موٹی سی، مہین
 بان کی، عجب آن بان کی، کھاروے کا لنگوٹ، ستر عورتیں کی اوٹ، گلے میں محمودی کی کفنی،
 حقہ چوگان منڈ سے لگائے۔ ایونی کی شکل بنائے، شیر کی کھال بچھائے، بھبھوت رماٹے
 دید وادید سے بظاہر آنکھیں بند، مگر دیدہ دل کھلا، خموشی پسند قلب گویا بولتا، سوتا نہ جاگتا،
 آسن مارے، دنیا سے کنارے بیٹھا، پیٹ سے بیٹھ لگا۔ تیر سا قد راست مثل کمان خمیدہ گویا چلے
 کھینچ چکا ہے۔ زنار آسار گیں عیاں، کھال سے ہڈیوں کے جوڑ، شمع فانوس منط نمایاں، تسبیح
 سلیمانی، ایمان کی نشانی، ہاتھ میں ہر بھجو ہر بھجو، تکیہ کلام بات بات میں۔ قشقہ ٹیکا، ماتھے پر ہندوں
 کا سا، سجدے کا گھٹا بدر کمال کی صورت چمکتا، زرد مٹی بدن میں، ذکر حق دل و دہن میں،
 کہیں مصلے پر سجدہ سجدہ گاہ رکھی۔ کپڑے کی جانماز بچھی، کسی جا پوکتی کھلی، دھونی رمی، دونوں
 سے راہ رکھی، عجب رنگ کا انسان، خلاصہ یہ کہ ہندو نہ مسلمان۔ بقول مرزا سودا سے

کس کی ملت میں گنو آپ کو بتلا اے شیخ تو کہے گبر مجھے، گبر مسلمان مجھ کو
 ایک طرف تکلے میں دو چار کیاریاں، سیلے چیلی کی، بہار گلکاریاں، کہیں مرشدوں کے
 ڈھیر، گرد کی چھتری، بزرگوں کے مزاروں پر، مولسری درخت سایہ دار، قطار قطار، درختوں کی
 ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے باہم بحث کرتے، اٹکتے، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہ کو کلمہ کے دم
 سناتے کا عالم، کہیں مرگ چھالا بچھا، شیر چو کی دتیا، دھونی لگی، لکڑ سلگتا، کسی جابہر کی کھال کا
 بستر، آہوئے صحرائی اس پر بیٹھا، اودا سا تو بنا، ہیمنتا دھرا۔ ایک سمت بھوانی کا منڈھ، تلسی کا بیڑ،
 ہرا بھرا گرد چشمہ پانی کا بھرا جائے۔ جائے دلچپ، مکان رعب دار گل خود رو کی جڈا بہار، ایک
 طرف بھنڈارا جاری کڑھاؤ چڑھا، موہن بھوگ ملتا، کہیں پلاؤ قیلے کی تیاری، چھاندا بٹ رہا
 تھا۔ کچھ مہنت بالکے، کچھ مرید حال قال کے کوئی چلتے میں بیٹھا، کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے کھڑا
 کسی کے خرقہ و تاج سرد تن میں کوئی چواگن میں، کہیں کتھا ہوتی کوئی وعظ کہہ رہا۔ ایک طرف

خنجر ہی سجتی، طنبورا چھڑاتا، بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقہ مراتب کا بندھا، نوحہ پڑھ رہے لوگ روتے، عجیب وہ گرد، مرشد غریب یہ مرید چلیے روز ایک دو کو مونڈتا تیسرے چوتھے دن عرس، ہر ہفتے میں میلے۔

حاصل کلام یہ کہ وہ عجیب جلسہ تھا کہ دیکھنا نہ سنا۔ یہ اجتماع نقیضین، آرام و چین سے، شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی۔ مرد آگاہِ دل، روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اٹھائی، آنکھ ملائی، دیدے لال لال، چہرے پر رعب و جلال جاننا لم کو بنور دیکھا۔ اس نے جھک کر مودب سلام کیا۔ اس خوش تقریب شیریں مقال نے کہا "بھلا ہو بچہ، بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک آئی، آؤ بیٹھو گرد بھلا کرے، مرشد کی دعا سے حق حاجت روا کرے، ہم تمہارے امانت دار ہیں، سواری کھڑی ہے، چلنے کو تیار ہیں۔"

جاننا لم تو متحیر ہو رہا تھا، زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے، پائیں جا بیٹھا جو گی اٹھا۔ چشمہ میں جا کر بیٹھا نہایا۔ گہرا چادر پھینک سفید اوڑھ، عطر لگا، جاننا لم کے نزدیک آ، یہ نکتہ زبان پر لایا۔ "بابا! ایک دن ذوق و شوق کے عالم میں، ہمارے مرشد گرد نے تیرے حال سے خبر دی تھی کہ ایک شہزادے کا جہاز تباہ ہو جائیگا۔ وہ بہ سراغِ مطلب یہاں آئے گا، اس کا کام تجھ سے اور تیرا کام اس کے سامنے پورا ہو جائیگا۔"

اس بات کے سننے سے شہزادے کو نہایت مسرت ہوئی۔ کہا "جو گی جی! تمہارے نام سے میری زندگی ہوئی وگرنہ دو چار دن میں گریبانِ صبر چاک ہو جاتا۔ میں سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا۔ خوبصورتی کا بھی عجب مزا ہے، جہاں اس کا شیدا ہے، عالم کو مرغوب ہے، طرحدار سب کا محبوب ہے، پیر فقیر غریب امیر سب کو عزیز ہے، اس کا خواہشمند ہر باتمیز ہے۔"

جو گی سمجھانے لگا کہ "یہ اضطراب بے جا ہے۔ دیر آید درست آید، بابا! دنیا کا یہ نقشہ ہے، گاہ خوشی کبھی رنج۔ یہ دونوں امر باہم ہیں۔ کبھی دھل کی شام کو دلِ بکاش ہوتا ہے، کبھی ہجر کی صبح کو کلیجہ پاش پاش ہوتا ہے۔ ایک شب ہمکناری ہے۔ ایک روز پہلو تہی گر یہ دزاری ہے، کبھی شبِ وصل کیا کیا اختلاط ہوتے ہیں گاہ فصل کے دن سر پیٹتے ہیں، روتے ہیں۔ آدمی جب رنج سے گھبرائے اور غمِ مفارقتِ دوست جان ہونٹوں پر لائے، دل کو یہ تسکین دے کر سمجھائے مصرع چناں نہاند چنیں نیز ہم نخواہ ماند۔

ظہ در پس ہر گرہ یہ آخر خندہ ایست

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن
 فصل گل جیتوں کو پھر اگلے برس آئے گی
 جو وصل میں راحت و آرام پاتا ہے، وہی ہجر کے دکھ قلق اٹھاتا ہے۔ تو نے ان دونوں
 بھائی جو توام پیدا ہوئے تھے، اُن کا قصہ سنا نہیں کہ پہلے اُنھوں نے کیا کیا صعوبت اٹھائی،
 پھر ایک نے سلطنت پائی دوسرے کے ہاتھ شہزادی آئی۔
 جان عالم نے کہا "ارشاد ہو کیوں کر ہے؟"

قصہ برادرانِ توام کا، شکار کو جانا

پھر شب کو اندھیرے میں دونوں جانوروں کا پھنس جانا، ان کا کھانا،
ایک نے سلطنت پائی، دوسرے پر خرابی آئی، پھر شہزادی پا کر بھائی سے ملا۔
جوگی نے کہا —

ایک شہر میں دو بھائی تھے، توام۔ پرورش یافتہ، ناز و نعم روزگار پیشہ، نیک اندیشہ سوائے
رشتہ برادری کے سر رشتہ دوستی باہم مستحکم، مگر دونوں کی طبیعت متوجہ سیر و شکار، ہمت مصروف
سیاحی دیار، دیار تھی۔ ایک روز شکار کھیلنے جنگل میں جاتے تھے، ہرن سامنے آیا، چھوٹے بھائی نے
تیر لگایا، کاری نہ لگا، ہرن کنوئیاں اٹھا، بھاگا۔ دونوں نے تعاقب کیا، تمام دن رداں رداں آقاں
دخیزاں چلے گئے۔ قریب شام بڑے بھائی نے جو تیر مارا ہرن ڈنگا کر گرا۔ یہ گھوڑوں سے اترے، ذبح
کیا۔ دن بھر کی دوڑ سے گھوڑے شل، خود مضمل ہو گئے تھے۔ تمام روز کے بے دانہ و آب بھوک پیاس
سے بیتاب تھے۔ لکڑیاں چن کر پانی بہم پہنچا، کباب لگائے۔ بخوبی تمام دونوں نے کھائے، مگر اس
روز جو کیفیت اور لذت خشک کباب میں پائی، مرغ کی زیر بریانی تو تراتی، کبھی ایسی نہ کھائی تھی۔
پانی پیتے ہی سستی معلوم ہوئی، رات بھی ہو گئی تھی۔ لیکن شب ماہ پور نماشی کا چاند، اللہ اللہ جنگل کی
فضا، سبزہ نورستہ جا بجا۔ انھوں نے کہا "آج کی شب اس صحرا میں سحر کیجئے، چاندنی کی بہار صنعت
پروردگار، دیکھ لیجئے، پھر دل میں سوچے کہ تنہائی کی چاندنی گور کے اندھیرے سے بدتر ہے۔ سچ ہے

جب ماہر و بر میں نہ ہو تو نور نظر میں نہ ہو، اندھیرا اجالا آنکھ میں برابر ہے۔ شیخ ناسخ سے
دھوپ بہتر پر شبِ فرقت کی بدتر چاندنی صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی
خیر یہ دونوں ایک درخت سایہ دار چشے کے قریب دیکھ، شطرنجی چاندنی تو ہمراہ نہ تھی، زین پوش
چاندنی کی عوض بچھا، چاندنی کی سیر کرنے لگے، باگ ڈور سے گھوڑے اٹکا دیئے۔ چھوٹا بھائی بڑا متین
ذی شعور نکتہ بین دور بین تھا۔

بڑے بھائی نے کہا "آج ہم تمہاری عقل کا امتحان کرتے ہیں۔ بتاؤ تو اس وقت ہمارے
شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے اور سمت کون سی ہے؟ تیسرے کباب کی لذت، پانی کا مزا آج بہت ملا،
اس کا سبب کیا تھا؟"

اس نے جواب دیا "یہ باتیں سہل ہیں۔ شہر ہمارا یہاں سے سو کوس ہے اور دلیل یہ کہ بارہا
تجربہ کیا ہے۔ میرا گھوڑا تمام دن سو کوس اسی چال سے پہنچتا ہے اور سمت ستاروں سے ثابت ہے کہ
شمال ہے۔ رہا کھانے، پانی کا لطف، خلافِ وقت سے تھا۔ الا نیا مقدمہ یہ سنئے یقین کامل ہے کہ
صبح کو عنایت خالق، اور مددِ طالع سے وہ سامان مہیا ہو، جو کہ درتِ سابق دور ہو، آئندہ آسائش
رہے، طبیعت مسرور ہو۔"

بڑے بھائی نے اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا۔ "آج سو کوس کی مسافت بعدِ آفت طے کی
بھوکے پیاسے رہے، لیکن دل بشارت ہے۔"

وہ سن کے چپ ہو رہا۔ یہ قصہ رقت و گزشت۔ پھر مشورہ ہوا کہ "یہ جنگل سنان، ہو کا مکان
ہے۔ یہاں درندہ و گزندہ، سانپ بچھو، شیر، بھیڑیے کے سوا پرندہ و دندہ نظر نہیں آتا جو ہم تم دونوں
سورہ النوم اخو الموت۔ خدا جانے کیا ہو۔ تین پہرات باقی ہے۔ ڈیڑھ پہر ہم جاگیں، پھر
تم ہوشیار ہو۔"

یہ صلاح پسند خاطر طرفین ہوئی۔ پہلے بڑے بھائی نے آرام کیا۔ چھوٹے نے جاگنے کا
سرا انجام کیا، تیرکمان ہاتھ میں اٹھاٹھلنے لگا۔ جب زلفِ بیلے شبِ کمر تک آئی۔ اسی درخت پر دو جانور
آپس میں اپنی اپنی توصیف و تعریف زبان بے زبانی میں کرنے لگے، اور یہ شخص بہت جانوروں کی بولی
سمجھتا تھا، آواز پر کان لگاٹے ایک بولا "میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے، جو کھائے ایک محلِ تو
پہلے دوپہر کے بعد اگلے، پھر ہر مہینے منہ سے نکلے۔"

دوسرا بولا "جو شخص میرا گوشت کھائے، اسی روز بادشاہ ہو جائے۔"

یہ باتیں سمجھ دل میں نہایت خوش ہوا، تیر و کمان تو موجود تھا۔ "الا اللہ" کہہ کر تیر بے تامل چلے سے جوڑ کر کھینچا، لبِ سوفار کان کے پاس آ بوعده نشانہ سرکوشی کر کے روانہ ہوا۔ قضا نے ہر چند اُن کے سر پر خبردار پکارا کمان کڑکڑا کر چلائی کہ وہ مارا، رات کا تیر سراسری اڈکر لیس، مگر مرگ جو درپے ہو گئی، جان نہ بچی۔ پیکان سے تا سوفار دوسرا ہوا۔ زمین پر چھد کر وہ دونوں ایک تیر میں گر پڑے۔ اس نے تجسیر کہہ کر ذبح کیا، طاثر روح ان کا اُٹ گیا۔ دن کی لکڑیاں بچی سلگا، کباب لگائے جس کے گوشت میں سلطنت کا ذائقہ سمجھا تھا، اُسے خود کھایا۔ دوسرا بھائی کے واسطے اٹھا رکھا اور ایسا خوش ہوا کہ تمام شب آپ پاسبانی کی، بڑے بھائی کو تکلیف نہ دی، مگر معاملات قضا و قدر سے مجبور بشر ہے۔ انسان کے قبضہ قدرت میں نفع ہے نہ ضرر۔ مصرعہ

تقدیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

شعرہ انچہ نصیب است ہم می رسد ورنہ ستانی بستم می رسد
جس وقت زاغِ شب نے بیض ہائے انجم آشیانہ مغرب میں چھپائے، اور صیادانِ سحر خیز دام بہر دوش آئے اور سیمرغِ زریں جناح طلا، بالِ غیرتِ لعلِ نفس، مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گزری روز ہوا، بڑا بھائی اٹھا، چھوٹے نے وہ کباب پس ماندہ شب یعنی رات کے بچے رد برد رکھے، وہ نوش کر گیا اور حال کچھ نہ کہا۔

دو گھنٹی دن چڑھے جب لعلِ اکلا، تب سمجھا، ہم نے بہت تدبیر کی، مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی۔ پھر وہ لعلِ بطریقِ نذر رد برد لایا، اور رات کا فسانہ مفصل سب کہہ سنایا، کہا "اللہ کی عنایت سے جلد آپ کو سلطنت حصول ہو، یہ نذر غلام کی قبول ہو، اس کو اس کی سعادت مندی سے خرسندی حاصل ہوئی۔ پھر کہا "سامنے آبادی معلوم ہوتی ہے، ہم جا کر اس لعل کو کسی دلال کے ہاتھ بیچ آئیں، تم گھوڑوں کے پاس رہو، اگر اپنے شہر چل کر یہ امر کریں گے، حاکم کا خوف مانع کار ہوگا، کس کو ہمارا اعتبار ہوگا۔"

یہ کہہ کر ادھر چلا۔ جس دم شہر کے دروازے پر پہنچا۔ خلعت کا انبوہ نظر پڑا۔ اس ملک

کا یہ معمول تھا، جب وہاں کا بادشاہ دارالسلطنت عدم کا تخت نشین ہوتا، دضیع و شریف، شہر کے، سوم کی رسم کے بعد وزیر اعظم کے ہمراہ، صبح دم تخت لے کے، دروازے پر آتے۔ جو اس روز پہلے مسافر باہر سے آتا، اسے بادشاہ بناتے تھے۔ قضا را وہاں کا بادشاہ قضا کر گیا تھا، لوگ تخت لے منتظر تھے، یہ داخل ہوا۔ سب نے تخت پر بٹھاندریں دیں، نوبت و نشان و جلوس کا

سب سامان موجود تھا، دھوم دھڑکے سے دیوان خاص میں داخل کیا۔ منادی ہوئی، 'بقول مشہور ان کی رائی دہائی نزدیک و دور ہو گئی۔ اس کو سرورِ سلطنت اور احکامِ مملکت کے باعث اس دن بھائی کا خیال نہ آیا۔

دوسرے روز جب تخت پر رونق افروز ہوا اور سامنے لال آیا تب بھائی کا خیال آیا، فوراً جاسوس ہرکارے درخت کا پتہ بتا روانہ کئے، کہا "اس صورت کا جوان اور دو گھوڑے دہان ہیں، جلد حضور میں حاضر کرو۔"

وہ سب دوپہر تک تمام جنگل کی خاک چھان، حیران و پریشان پھر آئے۔ غرض کہ تمام دشت میں پھر کر پاؤں توڑے۔ نہ آدمی ملا نہ گھوڑے۔ وہ کچھ رنجیدہ ہو، سلطنت کے شغل میں مشغول ہوا۔ بھائی بیچارے کو بھولے سے بھی کبھی یاد نہ کیا۔ مگر وہ لعل جسے بچنے کو لایا تھا، جس کے بیچانے میں تخت و تاج میسر آیا تھا، فال مبارک اور بے نشان بھائی کی نشانی سمجھ اور ہر روز سر دربار لاتا، ملازموں کو دکھاتا، وہ سب بہ خاطر شاہ تعریف کرتے، اس کو خوشی حاصل ہوتی۔

مذکور اس گرفتار پنجہ اہل کا، جانور کا اٹھالے جا کر کنویں

میں گرانا، قافلے کا آنا، پھر بہ علت لعل شہزادی تک پہنچنا،

اور بہ حیلہ ایلچی بھائی کی ملاقات

صیادان طائر معانی ذی ہوش، و دام داران بلبل خوش بیانی، خانہ بدوش نے حال
اس منتظر زیر درخت کا یہ لکھا ہے کہ ہمہ تن چشم محو انتظارِ برادرِ بزرگ تھا، ناگہاں ایک
جانور مہیب شکل عجیب آیا اور پنجہ میں دبا کر اڑا۔ گھوڑوں نے ڈر سے باگ ڈور تڑا کر جنگل کا
رستہ لیا، کود بھاگے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے۔ بڑا بھائی سلطنت کا مالک ہوا، چھوٹا بیچارہ
موزی کے جنگل میں پھنسا، واللہ اعلم بالصواب۔ وہ جانور وہاں سے کتنی دور اڑا۔ آخر کار
تھک کر ایک درخت کنویں کی جگت پر بٹھا، اس پر جو بیٹھا، یہ چھٹ کر کنویں میں گرا۔ جاتی ہے
فغاں میں چرخِ دولابی کہ ہر روز بچا ہے افگند ماہی دل افروز
الآن سن حیات مضبوط تھی، نہ گزند پنجے کی پہنچی، نہ چوٹ چھیٹ کرنے کی لگی۔

میر حسن ۵

کنواں وہ جو اندھا تھا روشن ہوا جوان اس میں وہ سانپ کا من ہوا
وہ جانور تو اڑا گیا۔ یہ بے پر کنویں میں پڑا رہا۔ اتفاقاً اسی روز ایک قافلہ گم گشتہ
راہ وہاں آ نکلا۔ آدمی پانی بھرنے کنویں پر آئے۔ یہ رستی کے سہارے سے باہر آئے جس نے
اس کا جمال دیکھا یا بشریٰ ہذا اُعلام کا غل برپا کیا۔ دنیا کے عجب معاملے ہیں۔ شعر ۵

روزے نگر کہ طوطی جانم سوے لبش ہر بوسے پستہ آمد و بر مشر افتاد
 جب لوگ حال پوچھنے لگے۔ اس نے جیسا موقع دیکھا، ویسا بیان کیا۔ غرض کہ میر قافلہ
 کی خدمت میں رہنے لگا۔ چند روز میں قافلہ منزل مقصود کو پہنچا اور مہینہ بھی تمام ہوا، جو ان
 نے دوسرا لعل اُگلا۔ رئیس قافلہ نے لعل جو دیکھا، تمام ملال بھولا۔ باخود سوچا ایسی گراں بہا
 شے کا سہل لینا مشکل ہے۔ مبادا کچھ فساد اٹھے، تدبیر شرط ہے، جو ان کو قید کر کوٹوال پاس بھیجا۔
 کہا ”یہ میرا غلام ہے۔ آج اس نے لعل چرایا، کچھ ایسا دسومڑ شیطانی دل میں آیا۔ میں نے
 آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، اسے سزا ملے، تا لوگ ڈریں، عبرت سے ایسی حرکت نہ کریں۔
 کوٹوال نے قاضی سے مسئلہ پوچھا، اس نے بے تحقیق ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دیا، مگر اس کا
 یہ دستور تھا، جب کسی شخص پر گناہ ثابت ہوتا تو مدعی اور مدعا علیہ بادشاہ کی بیٹی کے رو برد حاضر
 ہوتے۔ اظہار حال کے بعد مرافعہ ثانی میں، جو اس کی رائے معدلت پیرائی میں آتا، وہ ہوتا۔ اس
 واسطے کہ بادشاہ مسن تھا، بیٹی کے صوا اور کوئی تخت و سلطنت کا وارث نہ تھا۔ اللہ رے اسکے
 جمال کا جلوہ، اور حسن کا غوغا پیری کو ہزار جان سے اس کی پردا، جو اس کی شیدا خلق خدا،
 اس میں سیما پر شمار آفت روزگار تھی۔ حسن عالم فریب کے علاوہ طبع حلیم، رائے سلیم نکتہ فہم
 دقیقہ رس، اپنے عصر کی حکیم، حقیقتاً قابل ریاست و صاحب فراست تھی۔ غنچہ خاطر اس گل
 اندام یاسین پیکر کا رؤنا دیدہ صبا تھا۔ دہن صدف مراد تمنائے قطرہ نیاں میں بند۔ کوچہ
 عصمت و عفت میں اس درنا سفتہ، درج شہر باری کے دہم و فکر تاجدارانِ دہر کا گذر نہ ہوا
 تھا۔ اُس دم تک ناکتخدا تھی جس وقت وہ دونوں رو برد ہوئے، پہلے شہزادی نے میر قافلہ
 سے پوچھا۔ اس نے جو کچھ کوٹوال سے کہا تھا، وہی بے کم و کاست پھر عرض کیا۔ شہزادی بونی
 سعدی سے باطل است انچہ مدعی گوید۔ پھر جو ان کی طرف مخاطب ہوئی۔ بلکہ یہ مذیت سے
 تنگ آمادہ مرگ تھا، بے تامل بولا۔

”شہزادی آپ روشن ضمیر ہیں، ہم مصیبت زدوں کی طرح سلسلہ بے جرمی میں اسیر
 ہیں۔ یہ شخص سچا ہے۔“ وہ تو عقیلہ تھی، زیادہ شک ہوا، دل سے کہا، آج تک کسی چور نے حاکم
 کے رو برد و بجز انکار دست بردی دفتہ اقرار دزدی کیا نہیں، یہ بے گناہ ہے، تقریر اس شاہد
 کی شاہد ہے، خدا گواہ ہے کچھ اس میں بھیید ہے قافلہ باشی سے فرمایا ”کل تو محکمہ میں
 حاضر ہونا۔“

جوان کو ڈیوڑھی پر قید کیا۔ یہ توحسین بلکہ سرطلعت ماہ جبین تھا، طالع کا ستارہ جو چمکا، شہزادی کا میلان خاطر، جوان کی جانب ہوا۔ شب کو تنہا کلا کے بدلداری و تاسف استفسار حال فرمایا۔ اس وقت جوان نا کردہ گناہ نے دل سے آہ سرور بھر مشروحاً، از آغاز تا انجام عرض کیا۔ شہزادی کا دل یہ نیا قصہ سن کر پھر تبہ ام سرور ہوا۔ چورنی کا شک اس دزدِ دل کی جانب سے دور ہوا، صبح کو بادشاہ کے حضور میں لاخود دست ادب باندھ کر عرض کی "قبلہ عالم و عالمیان کی عمر دراز ہو، قیصر و فقور کی اس در پر جبین بہ نیلہ ہو۔ شہر کا قاضی اور کو تو ال بے دریافت، حقیقت حال حکم سزا، بندہ ہائے خدا کو کہتا ہے۔ روز جزا کی جواب دہی سے کوئی نہیں ڈرتا ہے، غضب کی جا ہے، عجب ماجرا ہے۔ واجب التعمیر صاحب تقصیر کو لال ملے، بیگناہ کا ہاتھ کٹے۔"

بادشاہ نے پھر دونوں کی زبان سے حال سنا، بسبب کثرت سن کے عقل کو زوال ہوتا ہے۔ یہ وہ دن ہیں کہ نسیاں کمال ہوتا ہے، ذہن نہ رہا، تامل کیا۔

شہزادی نے التماس کیا، "حضور! یہ امتحان بہت آسان ہے۔ ایک مہینہ اس جوان کو اور قید رکھئے، اگر دوسرا لعل اگلا تو سچا ہے پھر ایسے درمتم صدف راستی کو کیوں بے آب و تاب کیجئے، آبرو لیجئے، ورنہ ہماہ آئندہ یہ بدکردار دار کا سزاوار ہے۔ ہاتھ کاٹنے سے کیا ہاتھ آئیگا؟" بادشاہ کو سر دست جواب باصواب بیٹی کا بہت پسند آیا۔ حاضرین نے تحسین و آفریں کی بادشاہ نے جوان کو اپنی آنکھوں کے سامنے نظر بند کیا۔ میر قافلہ کو شہزادی نے مجس بھیجا۔ قصہ کو تاہ وہ مہینہ بھی تمام ہوا اور اتنے دنوں میں شعلہ محبت مجھ سینے سے بھر کئے لگا۔ دم شہزادی کا پھر کئے لگا۔ حال طشت از بام افتادہ ہوا۔ جوان نے عرض کی "کل لعل اگلوں گا۔" پھر صبح کو سر دربار روئے حضار، لعل بے بہا ڈرج دہاں سے نکالا۔ سب کو حیرت شہزادی کو فرحت و مسرت حاصل ہوئی، اسی دم مال و اسباب قافلہ باشی کا جوان کو ملا۔ اسے تشہیر کر شہر بدر کیا۔ جوان کی صورت دل پذیر، فصاحت تقریر، پسند خاطر صغیر و کبیر تھی۔ باپاٹے شہزادی سب نے متفق اللفظ بادشاہ سے عرض کی کہ "یہ شخص حضور کی عنایت کے لائق ہے، تمنا ہے ملازمت رکھتا ہے، کفش برداری کا شائق ہے۔" بادشاہ بھی اس کی راستبازی سے خوش تھا، راضی ہوا سعدی سے

راستی موجب رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

چند عرصے میں مقرب بارگاہ سلطانی، مورد عنایات جہانبانی ہوا، ہر مہینہ محل اگلا حضور میں لانے لگا۔ روز بروز ہمچشموں میں سرخروئی حاصل کر، آبرو پانے لگا۔ آخر کار مشورہ ملازمان قدیم و بہتریک حکما و ندیم بادشاہ نے اس گہر مسلم سلک تاجداری کو برشتہ عقد اس محل بے ہما کے منعقد کیا۔ یہ دونوں مشتاق بصد اشتیاق، باہم لطف کے ساتھ بے اندیشہ و غم ایام گزاری، بڑی دھوم اور تیاری سے کرنے لگے، مگر ہر روز بلا نامہ جوان بادشاہ کے حضور میں حاضر رہتا تھا۔ ایک دن ایلچی اس کے بھائی کا، کسی تقریب میں وارد ہوا اور جواہر کا ذکر نکلا۔ ایلچی نے عرض کیا کہ ”ہمارے بادشاہ کے پاس ایک محل اس رنگ و رنگ سنگ کا ہے کہ آج تک جوہری چرخ نے باوجود عینک مہر و مادہ گردشِ شام و بگاہ، سال و ماہ میں اس کے سنگ کا کیا پانگ کے برابر نہیں دیکھا ہے۔“

یہ کلمہ سن کر بادشاہ نے دہی محل، جو سینہ بے کینہ جوان سے نکلے تھے، دس بارہ ایلچی کو دکھائے وہ بھی جواہر شناس تھا، سخت حیران تا دیر سر بہ گریبان رہا، پھر عرض کی ”قبلہ عالم بعجب کی جا ہے کہ رنگ و روپ نقشہ ان کا ایک سا ہے، اتنا فرق مقرر ہے کہ وہاں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔“

بادشاہ نے جوان کی طرف اشارہ کیا کہ ”یہ میرا فرزند ہر مہینے ایک محل تھوکتا ہے۔“ ایلچی نے غور سے جو دیکھا، اپنے بادشاہ سے مشابہ کیا، بعینہ پایا۔ خیر رخصت ہوا، جب اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کا تو معمول تھا، جب تخت پر آکر جلوہ گر ہوتا، وہ محل پیش نظر ہوتا۔ ایلچی کو وہ سانحہ یاد آیا، عرض کی ”قبلہ عالم اس محل کو جدا کرتے نہیں۔ بے اس کے قدم مبارک تخت پر دھرتے نہیں، ان روزوں خانہ زاد جس بادشاہ کے پاس گیا تھا، نیا ماجرا دیکھا، معدن جواہر اور محل کی کان، کہ وہ امکان نہیں، لیکن وہ محل کا پتلا، زندہ اپنے پاس رکھتا ہے۔“

بادشاہ نے اس کا حال مفصل پوچھا، اس نے سب بیان کیا کہ داماد اس شاہِ خجستہ نہاد کا، ہر مہینے محل اگلتا ہے، اور کیا گزارش کروں، جیسی حضور کی صورت ملتی ہے، حقیقی بھائی ایسے دکھائی نہیں دیتے۔“

یہ سنتے ہی یقین ہوا کہ اب پتہ ملا، مقرر وہ بھائی میرا ہے۔ اسی وقت نامہ شوقیہ، اس کان گہر کے اشتیاق دید میں بادشاہ کو لکھا کہ براے چندے اگر اس فرزند ارجمند کو ادھر روانہ

کرد، محبت دیرینہ سے بعید نہ ہو، ہمیں شوق دیدار از حد تحریر و اظہار افزوں ہے اور پوشیدہ خط مٹا بھائی کو رقم کیا کہ۔

”آج تک تیری مفارقت سے تخت شاہی بدتر از بویائے گدائی تھا، اب المچی سے یہ خبر فرحت اثر سن کر، دل کو سرور، آنکھوں میں نور آیا“ لازم کہ بھرد و رود رقیہ و داد ادھر کو روانہ ہو اور کچھ پتے حسب و نسب کے ساچھ شکار تفصیل وار، قلم بند کر دیئے، المچی سے فرمایا کہ ”نامہ علی رؤس الاشہاد بادشاہ کو، اور یہ خط خفیہ اس غیرت ماہ کو دینا۔“

قاصد صبا دم، ہر صر قدم جلد تر اس شہر میں وارد ہوا۔ بادشاہ کو نامہ دیا اور خط پوشیدہ جوان کو حوالے کیا۔ وہ مکتوب محبت دیکھ کر ایسا گھبرایا، یہ ہونے بوش کھایا کہ اسی دن رخصت کا ذکر بادشاہ سے لایا۔

آخر وہ عاشقِ برادر، معشوقہ روح پرورد کو لے کر جہاز پر چڑھ رہا تھا۔ راہ میں المچی سے شہر کا نقشہ، راہ کا پتہ، سب پوچھ لیا۔ فطر شوق سے دن رات سرگرم رفتار تھا۔ ساعت بھر مقام کسی منزل کا ناگوار تھا کہ جلد پہنچیں کہیں نہ ٹھہریں۔ نیرنگ زمانہ کج سرشت، بوقلموں کہ ہر دم دہر ساعت دگرگوں ہے، کیا کہوں جب دس بارہ کوس وہ شہر نہا، جہاز تباہ ہو کے بہا۔ جس کی قضا تھی تہ آب و گرداب رہا، جس کی بقا تھی، بہہ نکلا۔

یہ قصہ جانگداز، دور دراز پہونچا۔ اس کے بھائی نے سنا، فوراً ہزار سواہ تیز رفتار دوڑائے کہ جس ڈوبتے اچھلتے کا پتہ پاؤ، جلد حضور میں لے آؤ۔“

آخر کار ہزار جستجو و تگاپو شہزادی ہاتھ آئی، اُن کی خبر نہ پائی۔ اسے بادشاہ پاس حاضر کیا۔ جوان کے ڈوبنے کا حال کہہ دیا۔ بادشاہ بحال تباہ گرداب فراق میں پھنسا۔ شہزادی صفت نشین ماتم لجہ، لطمہ و غم میں الجھی، جوان کا حال یہ ہوا کہ تختے کے سہارے سے ہٹا ہٹا، پیاس کے حد سے، بھوک کی موجیں سہتا سہتا، کٹی دن میں کنارے پہ پہونچا۔ فی الجملہ جب تاب و طاقت آئی، پوچھتا پوچھتا اس شہر میں داخل ہوا، بادشاہ کو خبر پہونچی، رو برد لایا، بسبب طولِ ایام مہاجرت دمازی زمانہ مصوبت نہ پہچانا۔ استاد

اتنی مدت میں ملا مجھ سے وہ دھوکا دے کر یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی ہئیت تبدیل قرار و ذلیل تھا، اس اختلاف کو دیکھتے، یہاں صحرا نوردی، بھوک پیاس، مصیبت، وہاں حکمرانی و عیش و آرام و تخت سلطنت، ناچار شہزادی کو طلب کیا، اسے بھی تامل

ہوا وہ شخص بولا "پھر بھر کا عرصہ باقی ہے، آج نعل اگلنے کا دن ہے، پھر تم سب پہچانو گے۔"
 بادشاہ کو یقین ہوا کہا "اگر یہ جھوٹا ہوتا، تو ایک پھر کا وعدہ نہ کرتا۔"
 شہزادی نے کہا "تیری طبیعت کی جودت مشہور ہے، ایک مہما پوچھتی ہوں، اگر یہ یہی جواب
 دیا تو بیشک شک رفع ہوا۔ بھلا وہ کیا شے ہے جسے گبر و مسلمان و یہود و نصاریٰ سب انسان کا
 فرقہ آشکارا کھاتا ہے، مگر جب اس کا سر کاٹ ڈالو، تو زہر ہو جائے۔ کوئی نہ کھائے اور جو کھائے
 تو فوراً مر جائے۔"

جوان نے ہنس کر کہا "شہزادی قسم ہے، یہ کیا مہما پوچھا ہے!"
 وہ پھر ک گئی وحشت مٹی، دل کی بھڑک گئی، مہما کا نہ چلین اٹھا، پر وائے کی طرح، اس
 شمع بزم فرقت کے گرد پھری۔ بادشاہ متعجب ہوا کہ ہم تو کچھ نہ سمجھے، شہزادی کیا سمجھ کر سامنے ہوئی۔
 جوان نے عرض کی کہ "قبلہ وہ چیز قسم ہے، تمام عالم کھاتا ہے سر اس کا قاف ہے، اسے
 کاٹو تو سُم صاف ہے، سُم، زہر کو کہتے ہیں۔ کون کھاتا ہے، کھانے والا مر جاتا ہے۔"
 بادشاہ یہ سُن کر بغلیگر ہوا، اُس نے نعل اگلا، شادیا نے بجے، پھڑپھڑے ملے۔ اسی طرح
 جامع المتفرقین سب مہجوردوں کی دوری کا بکھیرا مٹائے۔ جو جس کا مشتاق ہو، جس کی جدائی
 جسے شاق ہو وہ اس سے مل جائے۔

جوگی نے یہ قصہ تمام کر کے جان عالم سے کہا۔ بابا۔ شرے

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود مرد باید کہ ہراساں نہ شود

جو بندہ یا بندہ ہے۔ یہاں سے منزلِ دوست قریب ہے، سب کچھ معلوم ہے۔ آنا کنا منع
 ہے، بُرا ہے، دُنیا مقام چپ رہنے کا ہے۔ آنا اس جگہ وقفہ کر کہ میری زیست کا ساغر
 بادہ اجل سے لبریز ہے، سمند جان کو نفسِ سرد مہینز ہے۔ مجھے زیرِ زمین سوئپ تشریف لے جانا
 اور چند دھیتیں کیں۔

جان عالم نے کہا "یہ رنج و قلق کس سے دیکھا جائے گا، پتھر کا کلیجہ کہاں سے ہاتھ اُٹے گا! کہ
 ایسے دوست غمخوار کو، اپنے جیسے جی، زیرِ خاک کیجئے۔ اس کے ماتم میں گریبانِ صبر چاک کیجئے۔"
 یہ کہہ کر رونے لگا۔ گریبانِ تادامن بارشِ اشک سے بھگو نے لگا، جوگی اس کی محبت کا بردگی
 ہوا کہا "افسوس! دمِ دایس کا عرصہ بہت کم، دم نہیں مار سکتے ہم۔ وگرنہ تیرے ہمراہ شریک
 درد و غم ہوتا۔ بھلا آخری فقیری کا ایک شکا سیکھ لے۔ سائیں چاہے تو کہیں اٹکا نہ رہے گا۔"

قبر میں لے جا کر کیا کروں گا۔

پھر چند کلمے وہ بتائے کہ جس صورت کا دھیان لائے فوراً ہو جائے۔ یہ مقدمہ بتایا، ہر ہر گرد کا نام لیا، پھر کلمہ جو پڑھا، دنیا سے چل بسا، دم نکل گیا۔ جوگی مسافر عدم، بکینٹھ بانی دم گیا۔ جان عالم کا روتے روتے دم گیا، بیتا بانہ نعرہ الفراق مارے۔ مرید چیلے جمع ہو کر گرد گرد یا ہادی کہہ کر بہت پکارے۔ بوتا نکل گیا جوگی نے صدا نہ دی، منزل مقصود کی راہ لی۔

شہزادے نے بموجب وصیت غسل دیا، کفایا، قبر تک اتارتے آتے کچھ نہ پایا۔ آخر کار برابر کفن پھاڑ دیا۔ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مریدوں نے منڈھی میں گاڑ دیا۔ ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی، مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اڑھائی۔ وہ سنت مندرا، سمجھ و مصلے، خرّہ وجہ اس کے منظور نظر کو دے کر، جانشین کیا۔ مرید چیلوں کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں سونپا۔ اسے ایک دلولہ آیا۔ اندر سر نو اُن سب کو یہ تلقین کیا کہ "سنو بچا اگو جوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے، مگر مرشد کامل کا جلوہ، سائیں کا ظہور" ہر برگ و بار، بولے پتے، گل و خار، بلکہ در مسجد و دیوار کُنشت سے دیدہ دور میں میں عیساں ہے، عارف کا یہ کلام ہے بعدی ۵۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر درختے دفنیت معرفت کر دگار دیدہ بینا گوش شنوا، اس رمز کو درکار ہے، ہر ذرے میں اسی کا جھکڑا ہے، نو ذہن قدرت نشان وحدت دنیا کا نقش و نگار ہے، ببل کے پردے میں تیرا نہ سخی ہوتی ہے۔ قمری کی کو کو متلاشی کی جان کھوتی ہے۔ اسی کے ذکر میں سرگرم ہے، جس کی زبان و مقار ہے، کسی کو حرم محرم میں نامحرم رکھا، بھٹکایا۔ کسی کو بیت الصنم میں بلا کر جلوہ دکھایا۔ کعبے کا دھوکا دیدہ کا بہانا ہے، دوڑا کر تھکانا ہے اور جسے حق یشتا، کو رہبر کر کے ڈھونڈا، اس نے گھر بیٹھے پایا ہے۔ امیر خسرو ۵

جن ڈھونڈا تین پائیاں گھرے پانی بیٹھ ہوں بوری ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ دنیا کا معاملہ، مذہب و ملت کا جھکڑا، یہ اچھا دہ پڑا، پڑ زبان و بے سود ہے، حق بیشک داتا، ہر آن موجود ہے۔ ربخ میں دل کو خوش، الم میں طبیعت کو شاد رکھو۔ وحدۃ لا شریک لہ نہ نکار ہے۔ شرکت کرنے والا مشرک حماقت شعار ہے۔ مرسلوں کو رستگار جانو مرید، یار سمجھ کر مانو۔ مرشد کی ذات گرد کی صفات ہر جلسے میں یاد رکھو۔ بود و نابد کا غم نہ ہو۔ اور اجاب کا دل کہ حجاب سے نازک تر ہے خدا کا گھر ہے، آشفقہ و مریم نہ ہو۔ اللہ بس

باقی ہوں۔“

یہ کہہ قہقہہ ممتھر کیا بے خبروں کو باخبر کیا۔ جب اس صحبت سے جان عالم کو فرصت ملی، چلنے کا عزم کیا۔ اس جانشینِ منت نے روکا اور دو چار دن خاطر سے مقام کیا۔ پھر جس طرف جوگی نے بتایا تھا، چل نکلا۔ پہاڑ سے جس دم آگے بڑھا دریا ملا، ہر چند ڈھونڈا، ناڈ بیڑے کا تھل بیڑا نہ لگا، مگر ایک لعل درخشاں بردے آبِ رواں سامنے آیا۔ قریب اس کے دوسرا نظر پڑا۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بہت سے لعل بہتے دیکھے۔ تازہ فکر ہوئی کہ اس حال کو کیوں کر دریافت کیجئے۔ کنارے کنارے سیر دیکھتا چلا، دو کوس جب راہ طے کی، عمارتِ عالیشان دیکھی اور اس چٹنے کو اس کے اندر سے رواں پایا، دروازہ اور در کی بہت تلاش کی تا اندر جانے کا باب مفتوح ہو نہ ہوا، سوائے دیوار در نہ تھا۔ اس وقت بلبل بن کر دیوار پر جا بیٹھا، مکانِ رفیع آستانِ باغ بھی بہار کا، مگر سنان، انسان نہ حیوان۔ فقط ایک ہنگامہ نہایت نقش و نگار کا، وہ نہر اسی ہنگامہ کے اندر سے جاری تھی۔ چمن خالی اور بادِ بہاری تھی، آدمی یا جانور مطلق و مطلق نہ تھا، باغ میں اُتر، صورتِ قدیم بدل کر ہنگامے میں آیا۔ منقش و مطلقاً، سجا سجا یا پایا۔ لیکن طرفہ حال یہ دیکھا۔ ایک پلنگ، زمر کے پایوں کا بچھا ہے۔ اس پر کوئی دوشالہ تانے سوتا ہے۔ برابر یا قوت کی تپائی پر پھولوں کا دستہ، آدھا سرخ، نصف سفید۔ جان عالم نے قدم بڑھا، دوشالہ سر کا یا، وہ تن پری پیکر بے سر نظر آیا۔ حسرت سے کہا: کس ظالم ستم شمار، بے رحم جفا کار نے اس سرِ دفترِ خوبی، سرِ سرِ دلبری و محبوبی کا سر کاٹا ہے! ہیرت ہر طرف دیکھتا تھا، چھت پر آنکھ پڑی، چھینکا بندھا، سر بھی دھرا دیکھا۔ سر کے نیچے نہر جاری ہے۔ جو خون کا قطرہ اس حلقِ بریدہ سے پانی میں گرتا ہے، اللہ کی قدرت کاملہ سے، وہ لعل ہو کر ترستا ہے۔

اس نے کہا سبحان اللہ مقرر یہ سحر کا کارخانہ ہے، قریب جا کر غور سے جو دیکھا۔ انجنِ آرا کا چہرہ تھا، پہچانتے ہی سر و تن کا ہوش نہ رہا، چاہا کہ سر سے سر ٹکرا کر ہمسر ہو، کسی کو نہ خبر ہو۔ بسکہ تجربہ کار ہو چکا تھا، سوچا مرنا ہر وقت ممکن ہے۔ پہلے حالِ مفصل معلوم کر دے، کہیں عوض کا سادھو کا نہ ہو۔ ہر چند غواصِ عقل رسا محیطِ فکر میں غوطہ زن و آشنا ہوا، گوہرِ مقصدِ صدقِ مراد سے ہاتھ نہ لگا، معاملہ سے نا آشنا رہا۔

اس عرصے میں شامِ نزدیک ہوئی، تند ہوا چلی، شور و غل مچا، یہ سمجھا۔ اب کسی دیو یا

ساحر کی آمد ہے چھپا چاہئے، سرگلدستہ گلبنِ محبت کے روبرو، بھونکا بن کر بیٹھ رہا۔ دفعہ دیا
 آپہنچا، قوی ہیکل، زبوں شمائل، مگر وحشی سا ہر سمت بوسوٹکھنے لگا۔ پھر اسی گلدستے سے سفید پھول
 توڑا، اس یاسین پیکر کو سونگھایا، سراپھل کر بدن سے ملا۔ انجن آرا اٹھ بیٹھی۔ دیو نے میوہ تر و خشک
 روبرو رکھا، مگر پریشان، ہر سو متحیر نگراں۔
 شہزادی نے کہا "خیر ہے؟"

اس نے کہا "آج غیر انسان کی بو آتی ہے، خون سے جان جاتی ہے۔"
 وہ کہنے لگی "ہمیں آج تک جلاؤ کی پرچھائیں نہ نظر آئی تو نے آدمی کی بو پائی! طرفہ خط
 ہے، یہ جملہ بے ربط ہے؟"

غرضکہ صبح تک مذکور ہر شہر و دیار، عجائباتِ روزگار کا بیان رہا۔ سحر دم اسی دتے سے سُرخ پھول
 اس خون آشام نے توڑ کر، اس لالہ فام کو سونگھایا۔ سر تو جھینکے پر سر بلند ہوا، تن نے پلنگ پر آرام
 فرمایا۔ دیو دو سالہ اڑھا راہی ہوا۔

جان عالم نے چار گھڑی بھر صبر کیا۔ پھر اپنی صورتِ اصلی بن کر وہی سفید پھول توڑ کر سونگھایا۔
 انجن آرا بدستور آدل اٹھی۔ شہزادہ چیخ مار کر لپٹ گیا۔ دونوں مجبور اس زور و شور سے روئے کہ تمام
 باغ ہل گیا۔ زمین و آسمان دہل گیا۔

جان عالم اپنے مصائب، وہاں تک آنے کا حال، فرقت کا درد و ملال، کہنے نہ پایا تھا کہ انجن آرا
 نے کہا۔ لا اعلم

تجھ بن مری ادقات جو اکثر گزری
 تو تو کسے سرگزشتِ اپنی ظالم
 وہ حالتِ نزع سے بھی بدتر گزری
 میں کس سے کہوں جو کچھ کہ مجھ پر گزری
 یہ کہہ کر دونوں چلا چلا، آہ دہکا سے رونے لگے۔ دنیا کے معاملے میں ہمیشہ سے کسی کی عقل
 نہیں رہی، شکست ہوئی۔ شعر ہے

بیک لحظہ بیک ساعت بیکدم
 مولف ایک دفع پر نہیں ہے زمانے کا طور آہ
 دگرگوں می شود احوالِ عالم
 معلوم ہو گیا ہمیں یس دن ہمارے

ہر عقدہ مالا نخل، ناگزیر کے واسطے، ناخن تدبیر خلق میں خلق کیا ہے اور جہاں میں جہان تدبیر
 کا دخل نہ ہو، اسے تقدیر کے حوالے کر دیا ہے، اکثر جس بات میں عقل عاجز آتی ہے، وہی طرفہ بعین
 میں ہو جاتی ہے، ناگہاں ایک سفید دیو، زبردست، زور کے نشہ سے سرشار، مست بڑا طاقت دار

رستم کا یادگار، ادھر سے گذرا، نالہ حزین، صدائے غلیں کان میں آئی۔ بسکہ بایں زور و طاقت،
 خداداد وہ دیونیک نہاد رحم دل، غم رسیدوں کے ریخ کا شامل تھا، گر یہ وزاری سن کر، دل کو
 بیقاری ہوئی، سمجھا کوئی انسان نالاں ہے، مگر اس صحرائے پر خار دادی ہمہ تن آزار ہیں، آدمی
 کا ہونا محال ہے۔ اگر ہے تو حقیقت میں مبتلائے الم، اسیرِ پنجہ ستم خراب حال ہے۔ یہ سوچ کر
 باغ میں آیا، یہاں روتے روتے دونوں کو غش آگیا تھا۔ دیو ڈھونڈتا ہوا بٹنگے میں آیا، دیکھا
 مہر و ماہ گردش بہر بے ہر سے برج زمردیں میں بے ہوش ہیں۔ پترے کے رنگ اڑے ہوئے۔
 سکتہ کی حالت میں ہم آغوش ہیں۔ روئے یار آئینہ دار درمیان ہے۔ فلک بر سر امتحان ہے۔
 سمجھا مدت کے بعد دونوں کا مقابلہ ہوا ہے۔ اس سے کسوت و خسوف کا رنگ ڈھنگ پیدا ہے۔
 سیر بالیں بیمار ان محبت بیٹھ کر ہنر سے پانی لیا۔ دونوں کے منہ پر چھڑکا، آنکھیں کھولیں، ہوش دوا
 درست ہوئے۔ دیکھا کہ ایک دیو سر ہانے موجود ہے۔ دیو سفید نے اٹھ کر سلام کیا۔ تسلی کا کلام کیا،
 کہا "تشویش نہ فرمائیے، بندہ دوستدار جاں نثار ہے"

پہلے جاں عالم اٹھا، بغلیں ہوا۔ وہ حال پوچھنے لگا۔ بسکہ شہزادہ جاں عالم سان و خوش
 بیان تھا، اپنی رام کہانی، چرب زبانی سے کہہ سنا۔

دیو ماجراٹے گزشتہ سن کر بیقار اٹکبار ہوا، عرض کی "آپ بدلیبی تمام آرام کیجئے، اب
 وہ قرم ساق آئے تو عمل بد کی سزا پائے"

جاں عالم بشت لگا ڈٹ باز تھا، اس سے بھاٹی چارہ کیا، صیفہ اخوت پڑھا۔ وہ بیچارہ
 بندہ بے دام، حلقہ بگوش غلام ہوا۔ وہاں سے اٹھ کر باغ کی سیر کرتے تھے کہ وہ جفاکار بھی آپہنچا۔
 یہاں اور رنگ دیکھا کہ شہزادی آدی زاد کے ہمراہ پھرتی ہے۔ سفید دیو کا ہاتھ میں ہاتھ ہے،
 مصاحبت کرتا ساتھ ہے۔ جل کر جاں عالم پر جھپٹا، دیو سفید نے بجلد ہی تمام اس نطفہ حرام کا ہاتھ
 پکڑا۔ وہ کافرا سی رحم دل سے پٹا، باہم کشتی ہونے لگی، یہ کشمکش ہوئی کہ زمین جا بجا شق ہوئی، انرض
 بددگوار و قوت پروردگار، سفید دیو نے زمین سے نگر اکھاڑ سر سے اونچا کیا زمین پر پٹکتی
 پر چڑھ بیٹھا۔ جاں عالم قریب آیا، زور و طاقت کی تعریف کرنے لگا، کہا "کیا جناب باری نے مجھ
 مددگار بکیاں کی یاری کی، جو ایسے مردود پر ایک دم میں مجھے فتح و ظفر حاصل ہوئی! اگر ناگوار معن
 نہ ہو، میں بھی ایک زور کروں"

وہ بولا "بسم اللہ"

شہزادے نے ایک ہاتھ شانے پر دھر، دوسرے سے گردن، اس سرکش کی مضبوط پکڑ دھڑ سے کھینچ کر، زمین پر دھڑ سے پھینک دی۔ دیہ سفید یہ طاقت دیکھ کر، سفید ہو گیا۔ شہزادے کا چہرہ سُرخ ہوا، وہ دروازے دین اسفل اتنا فلین کو پہنچا۔ اس عرصہ میں سفید دیو کے ملازم حاضر ہوئے۔ دعوت کی تیاری ضیافت کی اضافت لگی۔ ایک ہفتہ اکل و شرب گانا ناچ رہا۔ آٹھویں روز اس ماہ دو ہفتہ یعنی انجن آرانے ربخ جدائی، ملکہ مہنگار مردمان لشکر کالب دریا، انتظار بیان کر کے کہا، ”بغدا مفارقت ملکہ میں خواب و غور حرام ہے، تمہارے احسان سے دب کر، کبھی پھنسی لب پر آگئی، دگر نہ دورِ شراب و کبابِ نِ دلِ لخت جگر تھا، ہر گلاس برادہ الماس تھا، فقط تمہارا پاس تھا“

اس نے عرض کی ”میرے آدمی جائیں، پتہ لگا آئیں“

انجن آرانے کہا ”اپنے تجسس میں زیادہ مزا ہے، اپنا کام آپ خوب ہوتا ہے“ ناچار رخصت ہو کر چلے اور آنے جانے کے باہم، وعدہ ہائے مستحکم ہو گئے، مگر ہر دم ملکہ کا خیال، ہر گام دل پر فرقت کا ملال تھا کہ خدا جانے ڈب گئی یا ہماری طرح کسی آفت میں پھنسی! کبھی دو کوس کبھی چار کوس ہزار دقت چلے، دو تین دن میں پاؤں سوج گئے، چھالے پڑے، قدم اٹھانے کے لالے پڑے۔ وہ سفر سخت یہ نازک مسافر، وہ کالے کوس مالوے کی طرح کافر۔ انجن آرا بھلا کر بولی۔ میرے

کب تھا یہ شور و نوہ ترا عشق جب نہ تھا دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سدا نہ تھا آپ کی بدولت، یہ ذلت و رسوائی، پیادہ پائی، صحرانوردی، عزیزوں کی جدائی نظر آئی، آفت اٹھائی! میرے سوز

چھڑا کر مجھ سے میرے خائناں کو خدا جاتے چلا ہے اب کہاں کو

شہزادہ ہنس کر چپ ہو رہا۔ پھر وہ عمل جو جوگی سے سیکھا تھا، انجن آرا کو بتایا، دونوں نے توتے کی ہیئت بنائی اور توکل علی اللہ کہہ کر نظر بخدا، ایک سمت سرگرم پیداز ہوئے۔ پہر دو پہر اڑنا، پھر کسی درخت پر بسیرا، خیمہ نہ ڈیرا، اس روپ میں قاصد سیر ہوئے۔ سابق مصائب انسان تھے، اب ہمیشہ طر ہوئے، دریا پانی نیادانہ، بت نیا آستیانہ، کبھی بستی، گاہ دیرانہ، کسی کو اگر پہنتے دیکھ لیا تو رو دیا، یاد کر کے اپنا زمانہ اور اکثر یہ شعر پڑھ دینا۔ لا اعلم

شب عشرت غنیمت داں دوداد خوشدلی بتاں کہ در عالم کے احوالِ فردا رانہ می دانہ

مذکور ملکہ مہر نگار تختے پر بہتے جانا، بادشاہ کا جہاز

پر سیر کرتے ہوئے آنا، رحم کھا جہاز پر منگانا، شہر میں داخل ہو کر مکان

دینا، پھر تو تے کا اڑ کر پہونچنا اور نامہ لے کر روانہ ہونا

اے جنوں تو دلِ شوریدہ کی امداد کو آ
چین دنیا میں نہیں عشق کے بیماروں کو
بارِ فرقت کبھی معشوق جو دھڑکتے ہیں
زلزلت بے لطف گزر جاتی ہے بیچاروں کی
نگارندہ حالِ غریقِ شطِ فرقت و کشتیِ شکستہ
بریدہ کا ردِ مہجوری طوفانِ رسیدہ کنارِ کامیابی ندیدہ
کرتا ہے کہ جب جہاز تباہ ہوا تھا، یہ بھی ایک تختے کے ٹکڑے پر دل ٹکڑے ٹکڑے ڈوبتی تھی
جاتی تھی۔ ادھر سے کوئی بادشاہ عالیجاہ جہاز پر سوار اس پر دیکھتا آتا تھا، دور سے تختہ ہستا
دیکھا۔ جب قریب تر آیا، آدمی اس پر نظر آیا، خوفِ خدا سے جلد ہنسوی دوڑا، جہاز پر منگوا لیا۔
ملکہ کو تلاطمِ آب نے بیتاب کیا تھا اور جانِ عالم و انجمنِ آرا کے صدمہ جدائی سے جی ڈوب گیا تھا
یعنی غش تھا، لیکن صورتِ رعنا چہرہ زیبا میں فرق نہ ہوا تھا۔ بادشاہ بیک بنگاہِ دالہ و شیدا
ہو گیا۔ جلد جلد عطر سونگھایا، بازو باندھا اور تہسیریں کیں۔ دو تین گھڑی میں غش سے آنکھ کھلی،
دیکھا کہ تنگِ اجل کے منہ سے تو بچی، آفتِ لطمہ و لطمہ سے برکنار، جہاز پر سوار ہوں۔ مگر شخص

غیر سے دو چار ہوں۔ شرم سے سر جھکایا۔ تمام جسم میں پسینہ آیا۔

بادشاہ نے پوچھا "اسم شریف؟"

گو باعث حجاب بولنا گوارا نہ تھا لیکن بے جواب دیے چارہ نہ تھا۔ آہستہ سے کہا۔ "مردم ناکام آفت کی مبتلا، ذلیل و خوار فلک درپے آوار، پرے آلام، جگر خون دل خستہ و محزون کشتی تباہ، گم کردہ راہ ناخدا گم فتادہ تلاطم" اس کی فصاحت و بلاغت، چہرے کی شان و شوکت سے ثابت ہوا کہ یہ شہزادی ہے اور کلام دردناک نے گریبان صبر و طاقت چاک کیا۔ بادشاہ نے رد دیا۔ پھر خاصہ طلب کیا۔ ملکہ نے انکار کیا، نہ کھایا۔ اس نے بہت اصرار کیا، لجاجت سے کہا۔ "آپ کھانا نوش فرمائیں، وطن کا پتہ بتائیں۔ جب تاب و توانائی تم میں آئے گی، وہاں بھجوا دیں گے۔" ملکہ نے کہا۔ "ہم جن کے دامن دولت سے اُلجھے تھے، وہ تو گردِ راہ کی صورت خار صحران کی طرح جھاڑ، اس دریاے ناپیدا کنار میں ڈوبے، خدا جانے کیا ہوئے۔ اگر سوئے عدم ہمیں روانہ کرو، بکھیرا چھٹے غم و الم سے نجات ملے، بڑا احسان ہو، اس نے کہا۔ مولفت۔

تم سلامت رہو زمانے میں ایسی باتیں زبان سے نہ کہو

غرض کہ مجبوراً کچھ کھایا، دو چار دن میں طاقت گونہ آئی اور جہاز دار السلطنت میں پہنچا۔ ملکہ کے واسطے مکان عالی شان خالی ہوا، لونڈیاں، پیش خدمت، آتون محلدار، جو کہ قرنیہ شاہ اور شہزیادوں کا ہوتا ہے اور جس طرح شہزادیاں رہتی ہیں، سب سامان مہیا کر دیا۔ ایک روز بادشاہ آیا کہنے لگا "تم اپنا حسب و نسب پھپھاتی ہو، مگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم شہزادی ہو، ہماری تمھاری ملاقات اس جیلے سے ہونی تھی، امیدوار ہوں۔ یہ خوشی مجھے اپنے فرمانبرداروں میں قبول فرماؤ۔"

ملکہ نے کہا: میں نے تمام عمر سلطنت کا نام نہیں سنا، الا آپ کو خالق نے بادشاہ کیا ہے۔ انصاف شرط فرمانروائی ہے۔ میں ظلم رسیدہ، آفت کشیدہ، فلک کی ستائی ہوں اور کس طرح یہاں تک آئی ہوں۔ بقول استاد سے

دیکھتے آنکھوں کے کیا کیا لوگ اٹھے پیش چشم ہوں لب حیرت بدنداں رنگ دنیا دیکھ کر

اگر بگیناہ کا خون گردن پر لینا گوارا ہے، مختار ہے، مجھے کیا چارہ ہے، اور جو میری خوشی منظور ہے تو برسِ روز کی ملت دے۔ اس عرصے میں کوئی ڈوبا ترا، میرے وارثوں کا بتا ملا۔ کوئی مواجبتا پھرا، تو غیر۔ نہیں میں تیرے قبضہ اختیار میں ہوں، جبر کرنا کیا ضرور ہے

عدالت سے دور ہے۔ بادشاہ دل میں سوچا آج تک ایسے غرقی ابھرتے نہیں، وہاں کے گئے پھر ادھر قدم دھرتے نہیں، اتنے دنوں کی فرصت دو۔ حکومت نہ کرو، آنکھ بند کر لے میں سال تمام ہو جائیگا۔ پھر کون ساحلہ پیش آئے گا، کہا، بہت خوب، لیکن جو تمہیں ناگوار نہ ہو تو جی چاہتا ہے گاہ گاہ آنے کو، تمہارے دیکھ جانے کو۔

ملکہ نے یہ امر مغتنم جانا کہ حاکم و محکوم کا فرق سب کو معلوم ہے، اب یہ انداز ٹھہرا۔ پانچویں چھٹے روز پہلے خواجہ سرا اطلاع کرتا، پھر بادشاہ قدم دھرتا، دو چار گھڑی نشست ہوتی، ہر شہر و دیار کا تازہ اخبار بیان کر، اٹھ جاتا۔ یہاں سے دو کلمے یہ سننے، مسبب الاسباب کی کار سازی کے سامان دیکھئے۔ وہ محل جو ملکہ کے رہنے کو ملا تھا، اس میں مختصر سا پائیں باغ بہت کیفیت کا تھا، طرح طرح کے میوہ دار درخت، باغ و بہار کا یہ لخت، نئے نئے ڈھنگ کے وہ گل بوٹے، جو باد خزاں سے جھڑے، نہ ٹوٹے، پھل قصہ سے منہ میں آجائے، ہاتھ بڑھانے کی بار نہ آئے۔ روشنی صورت کی صورت کی سالم، آب رواں میں پری کا عالم، بھدے سے نہ بد قوارے سڈول سا پنچے کے ڈھلے نازک، سبک نوارے، کیاریاں پیچھاڑان میں ابشار، پختہ ہر ایک کیاری، سراسر گلکاری، چمن بندی قطعدار، جا بجا چوڑے معقول، گل پیادہ دسوار پر بہار چوکور، عرض و طول باغبانیاں خوبصورت نوجوان، تکلف کے سامان، طلائی نقرئی کھرپیاں مرصع کار، بیچے ہاتھوں میں، غمزہ چال میں، ادا دیکھ بھال میں، لگاوٹ باتوں میں۔ کسی طرف کنویں کی جگت پر، کیلے دالے لال بے ربغ و ملال ہو رہا۔ کوئی کچھ اکھاڑتی، کوئی کچھ ٹوڑتی، کوئی پھول چنتی، پھل اٹھاتی، گھاس کھری سے جھیل ڈالتی، کوئی ٹوٹا جھڑا پتا گرا پڑا کاٹا کیاری سے نکالتی، سر شاخ ہر گل رعنا، بلبلوں کا غنچہ، سرو شمشاد پر جو بن، صدائے قمری طوق در گردن، ایک طرف طاؤس کا رقص پر نماز، ہر ایک خوش آواز۔ باغ کے گرد ملب جھیل، غنچوں کا چٹکنا، کوس رحیل کہیں لالہ پیالہ در دست، کسی جگہ زرگس شہلا با چشم مست، تاک انگور پر میخواروں کی تاک، عنبر بیز صحن گلشن کی خاک، ملکہ گہہ دگاہ، شام دپگاہ، رنج پریشانی و دفع سرگردانی کو وہاں آنظارہ صحبت گل دلبیل سے رشک کھا، بصد حسرت یہ غزل پڑھتی۔ میر سوز سے

وہ دن خدا کرے کہ خدا بھی جہاں نہ ہو
گل ہو شگفتہ خاطر و گلزار خندہ رود
گلشن ہو اور یار دلا کرام اور میں
میں ہوں صنم ہو اور کوئی درمیاں نہ ہو
باد صبا بھی ہو دے دے باغبان نہ ہو
اپنا ہو قصہ غیر کی داں داستاں نہ ہو

کبھی پیچ دتاب زلف اور گیسوئے معنبر کی پریشان حالی، جھسبیل کو دکھاتی۔ گاہ
سیاہی داغ جگر لالے کی لالی سے لڑاتی، غنچہٴ انسرہ سے جو کچھ دل گرفتگی کی تسکین ہوتی
تو گل کی ہنسی پر پھوٹ پھوٹ کر خوب روتی اور اس غزل سے ہل کو سمجھاتی۔ مولف

لازم ہے سوزِ عشق کا شعلہ عیاں نہ ہو
زخمِ جگر کا داکسی صورتِ دیاں نہ ہو
اندھری بے حسی کہ جو دریا میں غرق ہوں
گلِ خندہ زن ہے چہچہ کرتی ہے عندلیب
بھاگو یہاں سے یہ دلِ نالاں کی ہے صدا
ہستی عدم سے ہے مری دشت کی اک مثلک
لینا بجائے فاتحہٴ تربت پہ نامِ یار
ناقہ چلا ہے نجد میں لیلے کا بے مہار

چالوں سے چرخ کی یہ مرا عزم ہے سرور
گاہ لب جو کسی سرور کے پاس یادِ قامتِ جان عالم میں مثلِ فاختہ کو کو کرتی، دلِ بیتاب
کو سڑپا کر لو کرتی، غور کرو دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں، اس کا سب کارخانہ پیدا ہے کہ پائدار
نہیں۔ کبھی تو روزِ روشن ہے۔ گاہ اندھیری رات ہے، یہ کائنات کی کائنات بے ثبات ہے،
گلشن میں اگر بہار ہے، تو خزاں درپے آزار ہے۔ بلبل کو ہزار چہچہ یاد ہیں، پر باغبان
آشیاں اجاڑنے کی فکر میں ہے۔ دام لئے لاکھ صیاد ہیں، نوش کے ساتھ گزندیش ہے،
کوئی دل شاد، کسی کا سینہ بریش ہے، عاشقِ ازل سے غم کا مبتلا ہے، مثلِ مشہور ہے کہ معشوق
کی ذات یوفا ہے اور جو کبھی کسی قسمت کے زبردست کو دفا دار ہاتھ آتا ہے تو برکت کسی نہ کسی پیچ
سے فلک تفرقہ پسند رشک کھا کے پھڑکتا ہے۔ اسی سہارے پر لوگ جان دیتے ہیں،
جی۔ پیچ کر یہ روگ مول لیتے ہیں، یہ نہیں معلوم اَلْقَلِيلُ کَالْمَحْدُوْمِ، یہ جملہ تو معترضہ تھا۔ پھر
وہی قصہ شروع ہوا۔

ایک روز فرح اندوز ملکہ بدستورِ قدیم بے یار و ندیم باغ میں گئی۔ شاہزادے کی
صحبت کا خیال، انجنِ آرا کی گرمبوشی کا ملال، تنہائی میں اپنا خراب حال دیکھ کر یہ شعر مولف
کا پڑھا۔ مولف سے

اک انقلاب چرخ سے افسوس دیکھنا وہ مجتنب رہیں نہ تو وہ ہمیشہ رہے
پھر ایسا روٹی کہ ہچکی لگی، شام کا وقت تھا، جانور درختوں پر بسرا لیتے تھے۔ جس درخت
کے تلے ملکہ گھڑی تھی، اک کوتا اس پر آ بیٹھا۔ گریہ و زاری اس غم کی ماری کی دیکھ کر، بچپن
ہوا، پوچھا ”شہزادی حال کیا ہے، کون سا صدمہ ایسا جانکاہ ہے، جو اس طرح لب پر
نالہ دآہ ہے۔“

ملکہ نے کہا ”سبحان اللہ قسمت کی گردش سے یہ حال ہم پہنچا کہ جانور مجھ پر رحم
کھاتے ہیں، احوال پوچھنے کو اڑ کر آتے ہیں، زیادہ بیقرار و اشکبار سوگوار ہوئی، یہ قاعدہ
کلیہ ہے کہ جب کسی دل شکستہ کی کوئی دلداری کرتا ہے، بندھی بات ہے دل امنڈ آئے۔ ملکہ
نے بے اختیار ہو کر کہا۔ آصف الدولہ سے

جو دو شخص خنداں ہم دیکھتے ہیں فلک کی طرف رو کے ہم دیکھتے ہیں
”اے جانور خوش بیاں، سخن بسخ، مہرباں کیا بتاؤں، گھر بار سے جدا بیکسی میں مبتلا
ہوں۔ بان آئینہ حیراں مثل زلف یہ بخت پریشاں نے کی طرح تالاں مورِ صدا اندوہ بلا
ہوں! شعر سے

بے کسی سوخت کسے می خواہم نفے ہم نفے می خواہم
شامِ تیرہ بختی کی سیاہی میں بیقرار، صبح قیامت کی صورت، دامن چاک گریباں
تار تار اشعر سے

کس کو اب زیر فلک طاقت رسوائی ہے کاش شقی ہو دے زمین اور سما جاؤں میں
دل میں الم سے خار خار، غیر جنوں کے دام میں گرفتار، سخت مجبور و ناچار ہوں۔
طار رنگ پریدہ، ہزاروں جور و ستم میں جریدہ، ردے راحت کوٹے آئیاں ندیدہ، شب
فرقت کے اندھیرے میں سو جھٹتا ہین، خونبار ہوں، آنا سے

صبح سے کرتے ہیں معمار مرے گھر کو سفید شام سے کرتی ہے فرقت کی شب تار سیاہ
توتے نے کہا ”مجھے تم سے بونے محبت آتی ہے، تمہاری باتوں سے چھائی بھٹی جاتی ہے،
برائے خدا اپنے رازِ مرستہ سے مجھے آگاہ کر، اللہ جلد مفصل حال کہو۔“

ملکہ نے قصہ عشقِ جان عالم، انجن آرا کا آنا، وزیرِ نادے کی بُرائی، جادوگرئی کی کج ادائی،
جہاز کی سیاہی، اپنا دہاں آنا، اوروں کا پتہ نہ پانا، جان عالم کا چھٹ جانا، سب بیان کر کے

کہا۔ "وہ شاہ گردون بارگاہ ہمیں منجھدھار میں ڈوبتا پھوٹا، اپنا بیڑا پار لگا، منہ موڑ خدا جانے کیا ہوا، ہم ہیں اور ربخ تنہائی میں بیتابی، انیس ہے، پریشانی میں ہمد، خانہ دیرانی جلیں ہے، جو دم ہے دم شمشیر ہے، سانس ناوک کا تیر ہے، تو تائیہ باتیں سن کر زمین پر گر پڑا۔ پر نہ چنے لگا۔ ملکہ مہرنگار گھبرائی کہ یہ کیا ماجرا ہوا۔ افسوس سے

دیکھ کر مجھ کو وہ حاضر ہوا مر جانے کو وہی غمخوار جو یاں بیٹھا تھا سمجھانے کو گھڑی بھر میں جب تو تاسنبھلا، بولا کہ "اے ملکہ مہرنگاریا میں وہی تو تا کم بخت، جفا شعار ہوں جس نے اُس رشک قمر کو در بدر کیا۔ مجھ سے انجن آرا کا ذکر سن کر آوارہ ہوا تھا۔ باقی حال تو آپ نے سب سنا ہوگا۔" پھر تو ملکہ اسے گود میں اٹھا، یہاں تک روٹی کہ بیہوش ہو گئی۔ شہزادے کے بیان کئے باغیاں دوڑیں، خدمت گزار جھپٹیں کہ آج ملکہ پر کیا حادثہ پڑا۔ جب دونوں کے ہوش و حواس درست ہوئے تو تے نے کہا۔ "آپ دل کو تسکین دیں، خاطر مبارک جمع رکھیں، جان عالم اور انجن آرا دونوں خیریت سے زندہ ہیں۔ میں نے یہ مقدمہ منجھوں سے دریافت کیا تھا۔ بالاتفاق اس پر ہیں کہ ربخ مفارقت کے سوا جان کی خیر ہے، سب آملیں گے۔ اب مجھے رخصت کرو۔ صبح کو خدا جانے کس وقت بیدار ہو۔"

ملکہ نے کہا "واہ! بعد مدت محسوس راز ملا، وہ بھی اتنا جلد چلا، فلک بر سر کچی ہے، بے لطف زندگی ہے، دیکھیں یہ برے دن کب جاتے ہیں اور اچھے کیونکر آتے ہیں؟" اساد سے

ایک عالم کو آزما دیکھا	جس کو دیکھا صوبے وفا دیکھا
حال بد کا شریک دنیا میں	نہ برادر نہ آشنا دیکھا
کیوں دلا ہم نہ تجھ سے کہتے تھے	جی لگانے کا کچھ مزا دیکھا
سچ ہے دنیا مریض خانہ ہے	ربخ میں سب کو مبتلا دیکھا
کیف میں کم بہت نوازش ہے	عشق خواں میں جوش دیکھا

آخرش رات کی رات تو تارہا، صبح کو رخصت ہوا، چلتے وقت ملکہ نے تھوڑا حال اپنا پرچہ پر تحریر کر دیا، کہا "جہاں شہزادے سے ملاقات ہو، یہ خط نشانی دے کر جو کچھ دیکھا ہے، زبانی بیان کرنا۔" وہ رقمیہ شوق لے کر راہی ہوا۔ شہر بہ شہر خستہ جگر ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ ایک روز قریب شام، بادلِ ناکام تھک کر، لبِ چشمہ کچھ درخت تھے ان پر بیٹھ کر سیلِ سرشک چشم پر نم سے بہاتا تھا، اسی دن جان عالم اور انجن آرا تو تے کی صورت بنائے، اسی درخت پر آ بیٹھے۔

یہ تو تاہمجنس سمجھ دیکھنے لگا۔ وہ دونوں مضطرب الحال ایک ٹہنی پر بیٹھ رہے۔ تو تاہمکھا کہ یہ منقارہ میری طرح سے دل خستہ ہیں، پھر رونے لگا۔

انجن آرانے کہا "جان عالم! دیکھنا، یہ تو تاہمکھا ہے۔ شاید ہماری صورت مصیبت دیدہ مصائب کشیدہ ہے۔"

تو تاہمکھا تو سمجھتا تھا، پھر بیٹھا اور بولا "خداے رحیم تمہیں وہ ربخ نہ دے، عدد بھی تمہارا، یہ ستم نہ دیکھے، مجھے وہ غم ہے اور دل پر ایسا الم ہے کہ ہر دم یہ دُعا ہے۔ دشمن کا دشمن، یہ صدمہ۔ جانکاہ اور ایسے روزِ سیاہ نہ دیکھے۔ میر سوز سے

جو دم لیتا ہوں تو شعلہ جگر کا جی جلاتا ہے
جو کچھ احوال کتا ہوں تو سننے والے روتے ہیں
جو جنگل میں نکل جاتا ہوں تو ب دشت پھینکتا ہے
پہاڑوں میں اگر پھرتا ہوں ٹکڑے ہو کے اڑتے ہیں
جو چپ رہتا ہوں تو اندر ہی اندر جان کھاتا ہے
ہنیں کتا ہوں تو کوہ الم سینہ دباتا ہے
کبھی جو شہر میں آتا ہوں تو گھر بھول جاتا ہے
جو دریا پر کبھی جاتا ہوں سر پر خاک اڑاتا ہے

جمع ربخ و محن، غریب شیط خفت، اہمہ تن ہوں، محن میرا خانان آدارہ ہوا، یہ ندامت ہے، مفارقت اس کی ظلم ہے، قیامت ہے اس کے درائے تازہ حال یہ دیکھا ہے کہ ایک عاشقِ صادق اپنے معشوق سے جدا، غیر جنسوں میں ایسر بلا ہے، اس کے نادک آہ سے چھائی سوراخ دار ہے، سنانِ نالہ کلیجے کے پار ہے۔ اگر گریہ دزاری یا مڑپ اور بیقراری اس کی بیان کردوں، پتھر پانی ہو کر بہہ جائے، سیلاب کی چھائی، نخلت سے پارہ پارہ ہو، راہ چلتے انجنان کو رحم آئے۔"

جان عالم یہ سن کر پھر بیٹھا کہا "وہ کون تھا جو سرگشتہ و آدارہ دشت ادبار ہوا، اور وہ کون ہے جو نا جنسوں میں گرفتار ہوا۔"

تو نے ان کی داستانِ گزشتہ اور ملکہ کا حال بیان کیا۔ انجن آرا ملکہ کا نام سن کر شگفتہ خاطر ہوئی، دونوں نے صورت بدلی، تو تاہمکھا کہ پاؤں پر گر پڑا، شہزادہ گلے سے لگا کر خوب رو دیا۔ کہا "اے ہمد! تم سے جو ہم جدا ہوئے، کس کس ربخ و مصیبت میں مبتلا ہوئے، دشت بدشت کوہ بکوہ خراب و خستہ در بدر محتاج پھرے۔ تم اس دن کے گئے، آج پھرے۔" پھر ملکہ کا حال پوچھا۔ اس نے خط حوالے کیا۔ پہلے انجن آرانے آنکھوں سے لگایا، دن نے قرار پایا۔ مضمون اضطراب بدحواسی کا مطالب سرتا سے کھلا کہ "جان عالم کی جگہ ملکہ اور ملکہ مہرنگار کی جا، رقیہ۔"

شوقِ جانِ عالم لکھ دیا تھا، اس انتشار کو سوچ، شہزادے کے ہوش گم ہوئے، بسکہ نامہ شوقیہ
بیچ و تابِ دل اور اشتیاقِ ملاقات میں تحریر تھا۔ جانِ عالم جب کھولتا تھا، اثرِ شوق ہم آغوشی سے
ہر بار خطِ ہاتھ میں پٹا جاتا تھا، مضمون مکرر سو سو حسنِ طلب دکھاتا تھا۔ مولف سے

نامہ شوقیہ جب میں نے رقم اسس کو کیا سو جگہ مضمون تب اس میں مکرر ہو گیا
آنسو دمِ تحریر یعنی لکھنے کے وقت، جو خط پر ٹپکے تھے، دیکھتے اور نشان اس کے دیدہ منتظر
چشمِ حیرت زدہ کی طرح ہر سطر پر کھلے تھے اور سرخ ہالہ ہر حرف نے نکالا تھا، ایک جہدِ دلِ خونی ہویدا
تھی۔ لہروں نے کی کیفیت پیدا تھی لکھا تھا۔ حافظ

از فون دل نوشتم نزدیک دوست نامہ
سوا دیدہ حل کردم نوشتم نامہ سوئے تو
اے یارِ وفادار، صادقِ الاقرار، اللہ تجھے سلامت رکھے، شرحِ اشتیاقِ داستانِ
فراق، قصہ طول و طویل ہے، زندگی کا بکھیرا قلیل ہے۔ اگر ہماری زلیت منظور
ہے، جلد آؤ صورت دکھاؤ، نہیں تو تاسف کرو گے، پچھتاؤ گے، تم نے آنے میں
اگر دیر کی تو ہم نے صدمہ ہجر سے تڑپ کر جان دی، مٹی کے ڈھیر پر رو در خاک
اڑاؤ گے۔ مولف

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے اجی آؤ خدا کے واسطے
کوئی دم کا سینے میں دم مہمان ہے، نام کو جسم میں جان ہے، فلک نے ہماری صحبت کا
رشتک کھایا۔ بے تفرقہ پردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنجِ جدائی سے جان کھوتے ہیں،
اتنا کبھی کا ہے کو کسی دن ہنسے تھے، جیسا بِلک بِلک کہ فرقت کی راتوں میں روتے ہیں میر سے
بیباںِ دل کسے سنائیں یہ دیدہ تر کسے دکھائیں

تمھاری تقریرِ شیریں ہر دم بزمِ زبان ہے، بے تصور سے باتیں کئے، چین کہاں ہے۔ استاد سے
یہ جانتے تو نہ باتوں کی سمجھ سے غور کرتے
ہمارے تڑپنے سے ہمسایہ سخت تنگ ہے، دولترا زنداں سے، تیرہ و تنگ ہے،

گر یونہی رہے گی بیقراری تو ہو چکی زندگی ہماری
دشتِ پیرامونِ حال ہے، ہر گھڑی فرقت کی ماہ ہے، جو پہر ہے وہ سال ہے۔ میر سے

دل کوئی دم میں خون ہو دے گا آج کل میں جنون ہو دے گا
 تمہاری صورت ہر پہ رو بہ رو ہے، جس طرف دیکھا تو ہی تو ہے، چشم
 فرقت دیدہ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں چشمہ آبشار ہے، جن آنکھوں کو تم
 پر تم نہ دیکھ سکتے تھے، ان سے خون کے دریا بہہ گئے۔ مولف

تم نے نہ ہماری پر خبر لی چھاتی پتھر کی کیوں جی کر لی
 دن رات کی دھیمت، تمہارے ساتھ کی، جب یاد آتی ہے، نیند اچھٹی ہے،
 بھینسی کی رات پہاڑ ہو جاتی ہے۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ چار پائی تنہائی میں
 پلنگ بن کر کاٹے کھاتی ہے۔ خواب میں نیند کا خیال نہیں۔ کھانا پانی ہجر
 میں حرام ہے، حلال نہیں۔ وہ سرجو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے۔ اس کو
 سو سو بار بالٹ دیا لیں پر دے پٹکا ہے۔ مولف

جس میں باہیں تری حائل تھیں طوقِ حسرت میں اب وہ گردن ہے
 میرے جاگنے کے، اسے پیارے! ستارے شاہد ہیں، گواہ شرعی زاہد ہیں،
 مرغِ سحر کو بقیہ رہی سے چونکاتی ہوں۔ موزن کی نیند آہ و زاری سے اڑاتی
 ہوں۔ شبِ وصل یہ ہمیں جگاتے تھے، ستاتے تھے۔ اب ہجر کی رات ہم انہیں
 سونے نہیں دیتے ہیں۔ من مانے بدلے لیتے ہیں۔ دل ہر ساعت گھڑی
 سے زیادہ نالاں ہے۔ ہر پیر گھر سے فزوں شور و فغاں ہے۔ چشم ہر اختر
 مسائنہ حال زار سے بھرت دیا ہے۔ چرخِ گرداں میری گردش دیکھ کر چکر
 کر رہا ہے۔ استاد

کھالیجے تھوڑا زہر منگا ہم اور کہیں تم اور کہیں کیا لطف ہے ایسے جینے کا ہم اور کہیں تم اور کہیں
 افشائے حال باعثِ ندامت، موجبِ دشمنوں کی خوشی کا، بربد دوستوں
 کے ممال کا ہے لا اعلم مصرعہ

دلِ من داند منِ دامنِ داند دلِ من
 اگر جیتے جی کبھی مل جائیں گے، رنجِ فرقت کے ڈکھڑے مفصلِ زبانی کہہ
 سنائیں گے اور جو فلک کو نہیں منظور ہے تو انسان مجبور ہے۔ اس حسرت
 کو بھی درگور لے جائیں گے۔ سعدی

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بجدا نماز پنجگانہ میں یہ دعا ہے۔ جامع المتفرقین سے یہی التجا ہے، کہ تم سے
جلد ملاقات ہو جائے۔ جانِ زار دلِ بیقرار کو چین آئے۔ زیادہ ملاقات کا
اشتیاق ہے، اشتیاق اور جدائی کا صدمہ جائگاہ سخت شاق ہے، شاق
خوگر وصل ہجر کے الم کا مبتدی ہے نہ مشاق“

یہ خط کا مضمون جو پڑھا، دونوں نے رو دیا اور سرِ نوح سرِ نامہ سراسر وہ نامہ بھگو دیا۔
اس رات کو تو چار دنا چار وہاں مقام کیا، صبح ہوتے ہی صورت بدلی، کوچ کا سرانجام کیا، آگے
آگے تو تارہاں پیچھے پیچھے وہ دونوں تیز پر —

پہنچنا جان عالم اور انجمن آرا کا مع توتے ملکہ مہزنگا کے پاس پھر ملاقات ہمد گرنوج بھیجنا، وہاں کے بادشاہ کا لوگوں بل جانا، بادشاہ کا آنا پھر اس کی گرفتاری اور جان عالم کی سیر چٹھی

پلا دے تو ساقی مے لالہ فام
دہ مے دے کہ ہوں دور دل سے الم
جدائی کے ایام طے ہو چکے
مچا دوں کوئی دم بھلا چھپے
مثل ہے یہ مشور اے ذی شعور
کہ ہے رنج کے بعد راحت ضرور

محررانِ حال، طالب و مطلوب، و حاکیانِ حکایاتِ خوب و مرغوب لکھتے ہیں کہ وہ
پرندہ ہوا سے شوق یعنی جان عالم مع انجمن آرا، توتے کے ساتھ، آٹھویں روز ملکہ کے پاس پہونچا۔
یہاں جس دن سے توتا رخصت ہوا تھا، ملکہ مہزنگار دونوں وقت بلا ناغہ، اس درخت کے تلے،
جہاں توتا ملا تھا، آکر یہ کہتی تھی میر سوز سے

مانند جرس پھٹ گئی چھائی تو نغاں سے
فریاد کو پہونچا نہ کوئی راہِ رواں سے
اس طرح اس روز موافق معمول، وہ دلِ ملول، قریبِ شام درخت کے نیچے حزیں دزار
توتے کے انتظار میں کھڑی تھی اور آنکھ ٹپنی سے لڑی تھی اور دیدہ خوبار سے تا دامنِ یاقوت
اور موتیوں کی لڑی تھی، جب دلِ سوختہ گھبراتا تو آہ سوزِ درد، مثلِ دغان لب پر آتا،

جی بہلانے کو یہ غزل پڑھتی۔ مولف سے

آتشِ فرقت سے سینہ جب سے مجھ ہو گیا
باعثِ افشائے ذلت دم نہ مارا میں نے گاہ
نزع تک تو آمدِ جانان کا کھینچا انتظار
کیا ڈراتا ہے ہیں داعظ سنا ستورِ نشور
اب جو ہنستا ہوں تو ہنستے ہنستے بھی گرتے ہیں شک
فکر پھر کس کو ہے دیواں جمع کرنے کی سرور

بھن کے لختِ دل مرا ہر ایک اگلے ہو گیا
ورنہ زیرِ آسماں کیا کیا نہ مجھ پر ہو گیا
وہ نہ آیا وعدہ اپنا یاں برابر ہو گیا
شامِ فرقت یاں عذابِ روزِ محشر ہو گیا
روتے روتے آخرش رونے کا خوگر ہو گیا
جب کہ مجموعہِ خاطر ہی ابتر ہو گیا

دفعۃً تو نے نے سلام کیا۔ وہ خوش ہو کر بولی "اے قاصدِ نیک صدا دہد ہر شہر سبا!"

میرے سلیمانِ حسن و خوبی کا پتہ پایا، اس بلقیسِ محبوبی کا سراغ ہاتھ آیا؟

تو نے کہا "اے ملکہِ عالم! قدر داں، خبرداروں کو خلعت و انعام دیتے ہیں، جب
دوست کا پیغام پوچھتے ہیں، علی الخصوص یہ خبرِ فرحت اثرِ پہلے یہ ارشاد ہو کہ اگر پتہ بتاؤں گا، اس
کی اجرت کیا پاؤں گا؟"

یہ سن کے ملکہ کی جانِ رفتہ بدن میں آئی یقین ہوا اس نے خبر پائی۔ یہ کہا۔ استاد سے
پیغامِ دوست جلد تو پیغامِ سر سنا گھبرا کے دم ہی جاٹے نہ میرا یہی اکٹ
تو تا عرض کرنے لگا، "حضور کا فرمانا بجا ہے، مگر ایسی خبر کا جلد کہنا حق کا مقنا ہے۔

استاد سے

دفعۃً خوگرِ فرقت کو نہ دے مرندہ وصل خبر خوش نہیں اچھی جو یکایک ہو دے
تو تا بات کو طول دیتا تھا کبھی خوش گاہ ملول کر دیتا تھا، ملکہ بے چین ہوئی جاتی تھی۔
ادھر شہزادے سے زیادہ انجن آرا گھبراتی تھی۔ غرض نہ رہ سکی صورت بدی۔ جانِ عالم مجسم
ہوا۔ آپس میں عاشق و معشوق و عاشقِ خوب کئے بل بل کر روئے، غبارِ کلفت پارینہ،
داغِ مہاجرتِ دیرینہ دل کھول کر، صفحہِ سینہ سے دھوئے۔ رونے کی آواز سے مغلانیاں،
خواریں جمع ہوئیں، جس کی آنکھ ان دونوں پر پڑی، دوڑ کر صدقے ہوئی اور پاؤں پر گر پڑی۔
جَلّ جلالہ، "حسبِ خوب سے کوئی چیز زیادہ دلکش اور محبوب نہیں، دوست تو دوست ہے دشمنِ عشق
کر جاتا ہے، رطکا ہو یا بوڑھا، شیدا نظر آتا ہے۔ ماں کو کیا مال ہے، موت کی انٹی بھی اگر
پاس ہو تو انٹی ماری سے خریدار بن جاتا ہے۔ جانِ عزیز نہیں، حرمت کچھ چیز نہیں، غلام کی

غلامی پر آقا فخر کرتا ہے، جان تازہ پاتا ہے، جو کوئی کہتا ہے کہ یہ اس پر مرتا ہے، عیاذ باللہ یہ امر محمود نہیں، اس میں غیر ضرر کچھ سود نہیں۔ غرض کہ خرم و خنداں بارہ درہی میں آئے۔ انجن آرا سے ملکہ نے حال پوچھا۔ اُس نے دیو کا اٹھالے جانا، باغ کی بے سرو پائی، پھر جان عالم کی رسائی اور سفید دیو کا آنا، باہم کی لڑائی، آفت سے چھڑانا، اپنی پیادہ پائی، صحرا نوردی، ہوا گرم، پانوں کا درم، پھر وہ عمل جوگی کا بتایا ہوا، شہزادے کا سکھانا، توڑنے سے درخت پر مل جانا، سنا دیا۔ پھر اُس نے جان عالم سے گزشتہ پوچھی، اپنی صعوبت کہی، گزشتہ کا حال میں ذکر کر کے جو کچھ دھیان بندھا، پھر سب رونے لگے۔ تو تا بد مزہ ہوا کہا ”صاحبو! اب یہ قصہ بکھیرا دور کرو، ہنسی خوشی کا مذکور کرو۔ یاد رکھو یہ بات گزشتہ راصلوات“ مصحفی سے

جز حسرت و افسوس نہیں ہاتھ کچھ آتا ایام گزشتہ کو کبھی یاد نہ کیجئے
ملکہ بولی ”اے شیریں مقال، مبارک قدم خستہ فال! شہزادہ ساعقل کا دشمن دیکھا
نہ سنا۔ سوز سے

معلوم ہم کو دل کے سلوکوں سے یہ ہوا نادان ہے جو دوست وہ دشمن ہے جان کا
اس نے جتنی محنت و مشقت اٹھائی، اپنی بد عقلی کی سزا پائی، بھلا عالم تنہائی میں جو کچھ
کیا، سو کیا، ددین بار اپنے ساتھ ہم دونوں کو خراب آفت کا مبتلا کر چکا ہے، آگے دیکھئے
کیا ہوتا ہے یہ کہ کر دربروئے دشمنان بند، دوست بادل خرسند باہم بیٹھے اور دور ساغر،
بے دغدغہ فلک تفرقہ پسند و سفلہ پر در شروع ہوا، مطرب نے ساز کی ناسازی پر گوشمالی
دی، صدائے عیش و طرب بلند ہوئی۔ یہ خبر بارہ درہی میں مشہر ہوئی، اور وہاں کے بادشاہ
کو پہونچی کہ ایک مرد صاحب جہاں، دوسری عورت پر ہی تمثال، ملکہ کے پاس تازہ دار دم ہوئے،
کہنے لگا ”الحمد للہ ایک موجود تھی دو اور آئے، پھر دو ہزار سو ابڑا کر اور دو پہ سالار تجربہ کار
نگہبانی کو بھیجے۔ جان عالم نے یہ ماجرا سنا کہا ”فضل الہی چاہئے، بعد مدت یہ صحبت ہمہ گیر میسر ہے،
صبح سمجھ لیں گے۔“

سوار تو باغ گھیرے رہے۔ یہ تمام شب جلے کٹے گئے، جس وقت خسرو خادہ، آرام گاہ شریقی
سے برآمد ہو جلوہ گر تخت زندگاری ہوا اور سپہ سالار انجم، معہ سواران سیارہ کوہ مغرب کی طرف
فراری ہوا، جان عالم حمام سے غسل کر کے نکلا، اُس لوح سے اسم تسخیر پڑھتا، باغ کے دروازے پر
آیا، اس کی نگاہ پڑی، اسم کی برکت سے آداب بجالایا، دست بستہ رو برد آیا۔ وہ دو ہزار سوار

معہ سپہ سالار فرمانبردار ہوئے، پھر تو دروازہ بہ کشادہ پیشانی کھولا۔ یہ خبر وحشت اثر اس بادشاہ کو پہونچی اور سوار پیادے لڑائی کے آمادے بھیجے، وہ بھی جب سامنے آئے، حلقہ غلامی کان میں ڈالا، جنگ کا خیال نہ رہا، پھر تو مشہور ہوا کہ ساحر ہے۔ المنقصر تمام فوج آکر شریک ہوئی۔ اس وقت وہاں کا تاجدار طیش کھا کر سوار ہوا، کہاں یکے سوار، کہاں انہوہ بے شمار تلوار چلی، دس پانچ زخمی ہوئے، کچھ جان سے گئے اور فوج نے نرغہ کر جان سے تو نہ مارا، کمندوں میں پھنسا لیا اور جان عالم کے حوالے کیا۔

شہزادہ عالی حوصلہ خوف خدا سے اور نحوست طالع نارسا، کج ادا سے مثل بید کا نپا اور فرمایا "اللہ وہ وقت کسی کو نہ دکھائے، جو دوست دشمن ہو جائے۔" یہ ارشاد کر اس سے بغلیگر ہوا، برابر بٹھایا، قتل سے ہاتھ اٹھایا۔ وہ بیچارہ نادم و پشیمان، سر در گریبان، گھٹنے پر گردن جھکا، منفعیل خاموش بیٹھا۔

شہزادے نے کہا۔ "مسافر کشتی صفت شاہی سے بید ہے، ہم تمہارے مہمان تھے، تم نے دعوت کے بدلے عداوت کی، اللہ کو یہ بات پسند نہ ہوئی، عبرت کا تماشہ دکھایا، یہ سلطنت آپ کو مبارک رہے۔ بندہ غریب دیار کمر باندھے چلنے کو تیار ہے۔ اس لڑائی کا قصہ فسانہ ہو جائے گا، امر و نہ یا فردا یہ مسافر روانہ ہو جائے گا۔"

وہ اس کی نصاحت و بلاغت اور یہ سیر حشری دیکھ کر حیران ہوا کہ دشمن کو گرفتار کیا، پھر ملک بخش دیا، سر جھکا کر بولا "بخدائے عزوجل لائق حکومت قابل سلطنت آپ کی ذات فرخندہ صفا ہے۔" جان عالم نے کہا "آپ یہ اپنی تعریف کرتے ہیں دگر نہ من آنم کہ خوب می دانم"

القصہ وہ محبوب ہو کر رخصت ہوا، فوج کو صلح جو ثابت ہوئی اپنے بادشاہ کے ہمراہ چلی۔ جب یہ جنگ زرگری ہو گئی مکان پر آکر بہت تیاری سے دعوت کی اور عذر تقصیر کر عفو کا امیدوار ہوا۔ شہر میں یہ چرچا ہوا، اہل شہر مشتاق ہو، غول کے غول آنے لگے، روز باغ کے روہر و میلا ہوتا تھا، کسی وقت شہزادہ نہ اکیلا ہوتا تھا، پھر جاسوس شہر سوار ہر کارے فوج کے تجسس میں بھیجے۔ چالیس منزل پر لشکر ملا۔ جان عالم کی مفارقت سے کسی میں جان نہ تھی، فرمان مہری دیکھ کر جان تازہ پائی، مہر آنکھوں سے لگائی، رات دن کوچ کرتی، بیس پچیس دن میں برہم یلغار فوج داخل ہوئی۔ شاہزادہ لشکر کو ملاحظہ کر کے مسرور ہوا، ملال بھولا، ارکان دولت نے ملازمت حاصل کی، سب نے نذر دی، موافق قدر و منزلت خلعت اور انعام خاص و عوام کو

مرحمت ہوا اور رعایا برایا بازاری اہل حرفہ کو بھی کچھ دیا۔ فوج کے سرداروں کو خلعت جو اہرنکار
 پیر و شمشیر مرصع کا رعنائیت کر، دو ماہہ تمام فوج کو انعام میں دیا، ازسرنو لشکر چکا دیا۔
 پھر وہاں سے کوچ ہوا۔ وہی راہ میں جلسے اختلاط فسانے حکایات عیش و نشاط ! تو تا ہنساتا،
 رمز و کنایہ کرتا، لطیفے سنا دل بہلاتا، ہر صبح باخاطر شکفتہ شبنم گل کوچ، ہر شام بسان فصل
 بہار بہ آسائش مقام، روز و شب براحت و آرام رو بہ راہ ہوئے۔

ورودِ لشکر نصرتِ آمود پر بہارِ جنگل میں جاڑے کی شدت صحبتِ شراب کے نشے کی ترنگ میں خیالاتِ فاسد کا آنا، کج بختیِ باہم کی، پھر توتے کا سمجھانا - شہزادے کا بچھپتا نا۔

ناگاہ ایک روز گذرِ موکبِ حشمت و جلال، با فردِ شوکتِ کمال، ایک صحرائے باغ و بہار،
 دشتِ لالہ نزار، میں ہوا۔ فضائے صحرا قابلِ تحریرِ کیفیتِ دشتِ گلشنِ آسا، لائقِ تقریر، بوباس ہر
 برگِ دگل کی، رشکِ مشکِ اذفرِ صفحہِ یابان، منبرِ دمعطر، چشموں کا پانی، عفا میں آبِ گہر سے ابدارتہ،
 ذائقے میں بہ از شیر و شکر، چلے کے جاڑے، کڑا کے کی سردی تھی، گویا کہ زمین سے آسمان تک ریخ
 بھر دی تھی۔ پرندِ چربند اپنے اپنے اشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے، بھوک اور پیاس
 کے صدمے اٹھاتے تھے، دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے، قصد سے تھر تھراتے تھے، سردی سے
 سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا، آواز کسی کی کان تک
 کسی کے کم جاتی تھی، منہ سے بات باہر آتی اور جم جاتی تھی، مارِ سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی
 کے باعث دمِ دبا کے بانہی میں دبکا جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دستِ درخشاں
 تھا، عاشقِ دمعشوق بھی اگر کھٹکھٹے تھے مگر گھٹنے پیٹ سے جدا نہ ہوتے تھے، اشکِ شمعِ انجمن لگن
 تک گرتے گرتے ادلا تھا، پردانوں نے گردِ پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا، شعلہ کا پیتا تھا، فانوس کے لمحات
 میں منہ ڈھانپتا تھا، شمع کا جسم برف تھا، پگھلنے کا کیا حرف تھا، ہر رنگ کے سینے میں آگ تھی،
 شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جہی پڑی تھیں،
 فولاد سے زیادہ کڑی تھیں، تیزِ نلک چہارم کی چھاتی سرد تھی گلخن میں یہ بردِ دت تھی کہ کثیر

گرد تھی، لبخوں نے بیٹر کچڑے، لوے ٹولوں کے ہاتھ آئے، لنگڑے ہرن باندھ لائے، سر زمین ہند میں مردے نہ جلتے تھے، زندوں کے ہاتھ پاؤں گھٹتے تھے۔ آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔ اس برگ و بار کی، صنعت پروردگار کی دکھائی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ عذار لالہ حمر، رشک زعفران تھا، طلائی درختوں کی ٹہنیاں کمر بائی پتے بہار میں گل خزاں تھا، اس سردی کا کہیں ٹھکانہ تھا، حمام تہہ خلتے کا خستہ نہ تھا، آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے، زردشت کا طریق اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں جاڑے کی یہ ترقی تھی کہ آج تک بتوں کی سرد مہری نہ گئی۔ آفتاب عاذم برج حمل تھا، آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیت سمندر کی عنوان تھی، آگ میں خلعت کی جان تھی، عاشق تو کیا معشوق ٹھنڈی سانس بھرتے تھے، گرمی نہ کرتے تھے، دانت سے دانت بجتا تھا، ہونٹ نیلم کو شرباتے تھے۔ پان کے لاکھے میں مستی کی کیفیت دکھاتے تھے۔ عاشق تن پر یوں کو ساتھ سلاتے تھے۔ اس پر بستر کو گرم نہ پاتے تھے، جاڑے میں ہر ایک المست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اس دشت میں ایسا پالا پڑا، تمام اہل لشکر کو تپ رزے کا عالم تھا۔ بانگے ترچھے خود بخود اینٹھے جاتے تھے، ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ پیچھے چھتیاں پتھر کے لاشی سے بیکار ہو گئے تھے۔ چانپ کے پتھر آگ نہ دیتے تھے اور توڑے دار کا یہ حال تھا کہ بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اٹھانا محال تھا، توڑا ہر ایک گل تھا، توڑے کی جگہ شور بلبل تھا، ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کیچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے، ملام لوگوں کے حواس جم گئے تھے، جگنو کو چنگاری کے دھوکے اٹھانے کو تھم گئے تھے، سردی بسکہ کار فرما تھی، ایک کو دوسرے کی تمنا تھی، یہاں تک جاڑے کا زور و شور عالمگیر ہوا تھا، کہ کرہ ناز زہریہ ہوا تھا۔

جان عالم نے فرمایا "آج خیمہ ہمارا یہیں ہو"۔ بعد درود لشکر خود متوجہ سامان عیش و نشاط ہوا اور ملکہ، انجن آرا سی پیکر محبوب، تواما مصاحب بے بدل، بد دل مرغوب، ددر مشراب گردش میں آیا۔ الاکشتی شراب کی نہ چلتی تھی اور کباب بھوننے کو آگ نہ جلتی تھی۔ گلاس شراب کا، برت کی قفلوں کو شرباتا تھا، قطرہ سے اس میں گرتے ہی جم جاتا تھا، میناٹے بے زبان کے منہ پر ردی تھی، ایسی سردی ہوئی تھی، گلا بیٹھا تھا۔ جب بہت غل کرتی، تب قفل کرتی۔ لب ساغر خشک، جسم پر پسینہ تھا، پانی کا پیالہ فخر آبلینہ تھا، جاڑے کا لشکر میں ہر طرف شور و غل تھا، بازار میں ردی

کالین دین بالکل تھا۔

جب دورِ آفتاب ماہ جینوں میں چمکا، عالم سرور میں جانِ عالم کو خیال نزدیک و دور آیا،
دل میں سوچا کہ اتنے عرصہ دراز، زمانہ دیر باز تک ملکہ اور انجمن آدا کو ہم سے فرقتِ غیروں سے
قربت رہی، رنڈی کا اعتبار کیا، یہ قوم قدیم سے بے وفا ہے۔ فردوسی سے

اگر نیک بودے سر انجام زن زناں را مزن نام بودے نہ زن

یہ نشیب و فراز جو ذہن میں آیا، جلی کٹی پٹا ہونے لگی، کچ بھٹی صحبت کا لطف کھونے لگی۔
وہ سبز پوش خانہ بدوش، موقع شناس، مزاجداں، دلسوز، ادب آموز، بے زبان، بلبلی ہزار داستان
دل کا حال جانتا تھا۔ اڑتی چڑیا پہچانتا تھا، سمجھا جانِ عالم کی طبیعت کبیدہ ہوئی، قریب وہ وقت
آیا چاہتا ہے کہ ایسی گفتگو آغاز ہو، جس کا انجام یہ صحبت درہم برہم کرے، بات کو کاٹ طبیعت کو
اچاٹ کہنے لگا "شہزادہ عالم! نشہ اس کیفیت سے حرام ہے کہ اس کی ترقی میں عقل کو تفریق ہوتا ہے،
خیالِ لاطائل آتے ہیں، احسان بھول جاتے ہیں۔ فقط گمان بے جا اور خیال وہ بھی نشہ کے حال
کا، اس پر حقِ خدمت سہو کرنا، روکھی صورت بنانا، فوراً بگڑ جانا، آدمیت سے بعید ہے۔ ایک
ساعت ادھر مخاطب ہو، اس مدت مفارقت میں بہت سانچے دیکھے، افسانے اپنے بیگانے کے
سنے، اگر بہ گوشِ ہوش انھیں سنئے تو یہ تخیلاتِ فاسد دور ہوں۔"

جانِ عالم نے کہا "ایسی بات اس وقت واجبات سے ہے جلد کہہ"

توتے کا بیان کرنا قصہ شاہ قوم بنی اسرائیل

قاضی کا بھاوج پر فریفتہ ہونا، دین و ایمان کھوٹنا، پھر سنگسار کرنا، عورت

کی بادیہ گردی پھر اسی شہر میں آنا

توتے نے کہا "جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نبی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا متین نیک طبیعت، باصفا، سخی و شجاع، عابد پارسا۔ اس کے عہدِ دولت میں دو بھائی تھے۔ ایک تو شہر کا قاضی، دوسرا مفتی، بظاہر مردِ مسلمان، صاحبِ ایمان، مفتی کی بی بی، نہایت نکلیلہ، بہت جلیلہ تھی۔ اتفاقاً عند الضرورت مفتی کو بادشاہ نے کہیں دو چار منزل بھیجا۔ وہ اپنی عورت دمِ رخصت، بھائی کو سوپ گیا۔ قاضی گاہ گاہ خبر کو اس عورت کے پاس جاتا تھا۔ پردہ اسی واسطے فوب ہوتا ہے، جتنا دنیا کا قصہ کھیرا ہے، سب آنکھوں سے دیکھا سنا ہے، وہ تو بدرجہ حسین تھی، قاضی کی آنکھ پڑی، فریفتہ ہوا۔ چند روز میں دولہہ طبیعت حد سے نزدں، قریب جنوں ہوا۔ مگر وہ عورت جیسی خوبصورت تھی، اس سے زیادہ عصمت و عفت رکھتی تھی۔ ایسا حسنِ اتفاق سے ہوتا ہے۔ قاضی نے ایک روز اس سے سوالِ وصال کیا۔ اس نے اس امر بد سے انکار کر، خوشامد کا کچھ نہ خیال کیا۔ قاضی سمجھا یہ راضی نہ ہوئی اور نہ ہوگی۔ خفت میں دو اندیشے ہوئے۔ ایک تو محرومی وصال، دوسرے افشائے راز کا خیال، گہرا کباد شاہ سے عرض کی کہ "دمِ رخصت میرا بھائی، اپنی جو رو مجھے سوپ گیا تھا، اس فاحشہ نے اس کی غیبت میں زنا کیا۔ مجھے ثبوت کامل ہوا۔"

بادشاہ نے مردِ متشرع سمجھ صاحبِ زہد و درع جان کر اختیار دیا۔ قاضی نے اس کو

”نہالے جا کر سمجھایا کہ ”اب تک خیر ہے، مجھ سے راضی ہو، نہیں تو بڑا شر ہوگا، تیرا ضرر ہوگا۔
دل پر جبر اختیار کر دوں گا، تجھے سنگسار کر دوں گا۔“

وہ عورت شیر صفت اس کی گیدڑ بھلی سے نہ ڈری۔ مرگ پر راضی ہوئی۔ اس کمبخت
شہوت پرست نے شہر کے باہر لے جا اس کو سنگسار کیا، خلق خدا عبرت کناں خائف درزاں
اپنے اپنے گھر پھری، وہاں حافظ حقیقی نے شیشہ حیات اس نیک صفات کا سنگِ ستم قاضی سے
بچا لیا، ٹھیس نہ لگی۔ خواہش بے جا میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ شب کو
عورت پتھر سر کا، ایک سمت پیادہ پا روانہ ہوئی۔ جنگل میں ایک دیرانی تھی، مرد خدا پرست بستی
کو چھوڑ اہل دنیا سے منقطع ہو کر، دشت بسایا تھا۔ یہ جب وہاں پہنچی اس حق پرست نے اس کی
غریب الوطنی پر رحم کھایا۔ لڑکا اس کا خورد سال تھا، اس کی خبر گیری کو اپنے پاس رکھا۔ اس دیرانی
کا ایک غلام سخت لطفہ حرام تھا، بد ذات گیدی۔ مثل مشہور ہے۔ ”کَاخِیْرِ فِی عِبَیْحِی“۔ زندی جو
دیکھ کر عاشق ہوا۔ بہت چالپوسی کی، وہ ڈھب پر نہ چڑھی، اس شقی نے دیرانی کا لڑکا ذبح کر،
”تمت اس عورت پر کی“، اولاد کی محبت مشہور ہے، ”امیر ہو یا فقیر اس میں مجبور ہے۔ دیرانی کو بہ شدت
ربخ ہوا، لیکن وہ صابر و شاکر تھا، عورت سے کچھ نہ کہا بجز کہ ”رَضِیْنَا بِالْقَضَا“۔ اور بیس دینار
دے کر رخصت کیا۔

وہ بے چاری مصیبت کی ماری، پھر چلی نکلی، ایک شہر میں وارد ہوئی، بازار میں بھیر دیکھی۔
شور و غل برپا اور ایک شخص کو زنجیر و طوق میں پھنسا کشاں کشاں لوگ لے جاتے تھے۔

عورت نے پوچھا۔ ”اس سے کون سا جرم قبیح سرزد ہوا، جو ایسی آفت میں مبتلا کیا۔“
لوگوں نے کہا۔ ”یہ بیس دینار کا قرضدار ہے، ادا کی طاقت نہیں، اس کے بدلے یہاں کے
سردار نے دار کا حکم دیا ہے۔“

عورت کو رحم آیا، وہی دیرانی کے دینار دے کر قید سے چھڑا دیا۔ وہ مکار بد باطن عیار تھا،
زندی جو خوبصورت دیکھی، جی بھر بھڑایا کہا ”تو تو میری محسنہ ہے، میں تیرے ہمراہ رہوں گا، خدمت گزاری
کر دوں گا۔“ اس حیلے سے ساتھ ہوا، کچھ دور شہر سے نکلی تھی، راہ میں دریا ملا، یہ مدت سے نہائی
نہ تھی۔ کپڑے بھی کثیف ہو گئے تھے، ایک طرف لباس دھو کر نہا رہی تھی، ناگہاں ایک سمت سے
دو جہاز وہاں آئے، اہل جہاز نے دیکھا، عورت قمر طلعت ہے اسی حرام زادے سے پوچھا
”یہ کون ہے؟“

اس نے اپنی لونڈی بتایا۔ مول تول درمیان آیا۔ غرضکہ مبالغہ خطیر پہنچ کر کسی بہانے سے جہاز پر چڑھا دیا۔ روپیہ لے کر چل نکلا۔ وہ دوسوداگر تھے، دونوں اس پر نائل ہوئے۔ قہقہے فساد حاکم ہوئے۔ پھر یہ صلاح بٹھری کہ بالفعل مال کے جہاز پر یہ رہے۔ جب اسباب یک چکے اس وقت عورت جسے قبول کرے وہ لے جھگڑا مٹایا۔ اسے مال کے جہاز پر بٹھایا۔ ایک روز آندھی چلی، طوفان آیا جس جہاز پر سوداگر تھے وہ تو ڈوب گیا۔ مال کا جہاز اور یہ جانباڑ سلامت رہی۔ چند عرصے میں جہاز اس شہر میں آیا۔ جہاں سے یہ سنگسار ہو کر نکلی تھی، دو کلمہ یہ سنو، جس شخص نے اس کو بیچا تھا، کسی تقریب سے وہ یہاں کے بادشاہ کا بخشی ہوا اور دیرانی کا غلام، بہ مدد ایام پایہ وزارت پا گیا اور مفتی صاحب سفر سے پھر کر مفت جو رو کے الم میں مبتلا تھے۔ جس دن جہاز اس شہر میں پہونچا، وہاں کے پیمبر کو حکم الہی آیا کہ ”ہمارا ایک خاص بندہ جہاز پر آیا ہے۔ یہاں کا بادشاہ، وزیر، بخشی و قاضی و مفتی کو لے کر اس کے پاس جائے اور اس سال میں جو جو گناہ اُن سب سے عمداً اور سہواً سرزد ہوئے ہیں، اس کے رو برو بیان کریں۔ جو وہ خطا معاف کرے تو ہم بھی درگزر کریں۔ وگرنہ بلائے آسمانی، آفت ناگمانی، اس زمین پر نازل کروں گا۔“

پیمبر نے بادشاہ سے کہا وہ سب کو ساتھ لے کر جہاز پر آیا۔ عورت پر وہ چھوڑ کر آ بیٹھی، تقریب شروع ہوئی۔ پہلے بادشاہ نے کہا: ”میں سیہ کار از سر تا پا گناہ گار، مصیبت کا پتلا ہوں، مگر یہ خدشہ تازہ ہوا ہے کہ قاضی کے کہنے سے مفتی کی جو رد کو بے تحقیقات رجم کا حکم دیا ہے۔“

عورت بولی ”غض اللہ لک یعنی بخشے خدا تجھے۔“

پھر مفتی نے کہا ”مجھے جو رو کی طرف سے گمان بد ہے۔“

اس نے کہا ”تو ابھی چپ رہ بیٹھ جا۔“

پھر قاضی نے بیان کیا۔ ”مجھ سے بد دلت نفسِ مادرہ، یہ حرکت ناکارہ ہوئی کہ بے جرم و

خطا ایک بیگناہ کو سنگسار کیا۔“

اس نے کہا ”اللہ تیری مغفرت کرے۔“

بعد اسکے وزیر دیرانی کا غلام آیا، ندامت سے سر جھکایا، پھر کہا ”بندہ سے

تحریکِ شیطان اور جوشِ شہوتِ جرم تبیح ہوا کہ آقا کا لڑکا مار کر صاحبِ عصمت کا قصور ٹھہرایا۔“

وہ بولی "غفور و رحیم تجھ پر رحم کرے"

جب بخشی آیا، وہ بیچنے کا ماجرا زبان پر لایا۔ عورت نے کہا "تو محسن کش ہے، خدا مجھے نہ بخشے گا"

الغرض بخشی کی جان بخشی نہ ہوئی۔ پھر وہ پردہ اٹھا، باہر آئی مفتی سے کہا "تو نے مجھے پہچانایا سب قصہ میری عفت کا ہے، آج تک خدا کی حفظ و عنایت سے عزت و آبرو بچی، اب خلع کی امید وار ہوں۔ یہ مال و متاع اپنے صرٹ میں لا، میں تنہا گوشہ عزت میں عبادت کروں، اسی شغل میں مردوں"

یہ ماجرا دیکھ کر حاضرین صحبت ناظرین جلسہ تھرائے بادشاہ سلامت منفل گھر آئے، وہ عورت تو حجرہ بنا، طاعت یزداں میں مشغول ہوئی، دولت کو نین حصول ہوئی۔
تو تا یہ قصہ تمام کر کے بولا "جان عالم جو ثابت قدم ہیں، ان کا ہر وقت اللہ یار ہے، ہر بحر بے کنار سے ان کا بیڑا پار ہے۔ فرد سے

نہ ہر زن زنت و نہ ہر مرد مرد خدا پنج انگشت یکساں نہ کرو
یہ نقل سن کر شہزادے کا نشہ ہرن ہوا، دونوں کی مشقت اور اینا اکھٹا
خانہ دیرانی یاد آئی، خوف خدا سے مثل بید کا نپا، ندامت سے عذر کیا، کہ حالت نشہ میں جھک مارا، قصور ہوا، پھر سہنی خوشی وہاں سے کوچ ہوا۔

یہ خاتمہ داستان ہے

اور وطن پہنچنا، شہزادہ جان عالم کا زیارت والدین اور نوک جھونک
ماہ طلعت کی توڑے سے، ملکہ اور انجمن آرا کا دل بہلانا، بھروسہ زراے کا قتل،

سلطنت ترک نافیروز بخت کا

چل اے تو سن خامہ منزل رساں	کہ اب گھر پہنچتا ہے یہ کارواں
پھر گھر کو شہزادہ خوش سیر	جھکڑے کا عالم بہت کڑواں
وہ اس طرح پہنچا وطن کی طرف	بہار آئے جیسے چمن کی طرف
بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام	ہوئی فضل حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا	ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جدا
رہی شرح جو رفلک تا تمام	سرورِ حزیں تو سن خامہ بھٹام

غرض کہ شہزادہ جان عالم، منزل بمنزل، مسافت طے کر، مع الخیر وطن پہنچا، دو کوس شہر سے
باہر خیمہ برپا ہوا، شکر ظفر سکپا اتر۔ یہ خبر فحمت آباد میں گھر گھر مشہر ہوئی کہ کوئی غنیم، فوج عظیم لے کر
دارد ہوا ہے، دیکھے ہوتا کیا ہے۔ شہر کا یہ نقشہ تھا، جس روز سے جان عالم مفقود الخیر در بدر ہوا تھا،
دیران پڑا تھا اور بادشاہ گریبان چاک سر پہ خاک، نہ تخت کی خبر، نہ سلطنت سے سروکار، نہ ملک
سے مطلب، نہ دربار سے غرض، دیوانہ دار بادل بقرار، محل میں پڑا رہتا تھا اور شاہزادے کی
ماں بھی غمگین، اندوہناک، بے چین، دن رات غم کی حکایت، اندوہ کے بین، نصیب کی شکایت،

لب پر شورِ شین، خلشِ نشترِ غم سے کوئی ساعت قرار نہ پاتی تھی۔ ہر وقت بلبلاتی تھی۔ یہاں تک دوری و بلندِ مہجوریٰ فرزند میں دونوں روئے تھے کہ آنکھیں ان عزیزوں کی یوسف گم گشتہ کے فراق میں دید کے اشتیاق میں ہم چشم دیدہ یعقوب علیہ السلام ہو گئی تھیں۔ یہ حکم آیہ دانی ہدایتہ و ابیقتہ عیناً کا من الحسن فہو کظیم۔ اور سچ ہے فراقِ نور چشم میں نور چشم کب رہتا ہے، رات دن آنکھوں میں یکساں ہر وقت سراسیمہ و پریشان، مگر ارکانِ سلطنت، نمکِ خواہِ قدیم، کوششِ عظیم سے درپردہ ریاست کا نام سنبھالے تھے۔

جب درودِ لشکر بایں کرد فرسنا، وزیرِ اعظم جانِ عالم کے پاس آیا۔ بسکہ شہزادہ با امتیاز کی مفارقت کو عرصہ دراز ہوا تھا، اس کے سوا وہ سامانِ جاہ و حشم، لشکر کا چم و خم، فوج ہزارہ ہزار، انبوہ ہتھیار، خزانہ لا انتہا دیکھ کر وزیر گھبرایا۔ اپنے شہزادے کا وہم و گمان نہ آیا، دست بستہ عرض کی۔ "قبلہ عالم! گردشِ طالع و اثر و انزلی، نیرنگی گردونِ دوں سے وارثِ تختِ سلطنت یہاں کا دفعہ گم ہو گیا۔ بادشاہ آسمانِ جاہ، ہمارا مصیبت کا مارا، جگر گوشے کی مفارقت میں دامانِ مہر و گریبانِ شکیب پارہ پارہ کر کے، نورِ نظر بھی، اُس اپنے قرۃ العین طاقتِ بصر کے ہجر میں گریہ کی نذر کر چکا ہے۔ ہنوز اُس عین الکمال کے قدم کی خاک، سرمہ چشمِ مشتاقان، کحلِ الجواہر دیدہ منتظران نہیں ہوئی۔ بعد سلام حضور کو یہ پیام دیا ہے کہ اگر خواہشِ تخت یا تمنائے تلجِ منظورِ خاطر ہے۔ بسم اللہ کل نہیں آج حاضر ہے، مگر سامانِ جنگ و جدال، گرم بازاری عرصہ قتال، فوزِ یزی بندہ ہائے خدا، ناحق ناروا ہے۔ مجھے تختِ سلطنت تختہ تابوت سے بدتر ہے۔ الا معاملہ قضا و قدر سے مجبور، فرد بشر ہے۔ ہر چند جینے سختی بیزار ہے، لیکن مرنے کا کسے اختیار ہے!" شعر ہے

مرنے کو میں تو راضی ہوں موت کو موت آگئی زندگی اب گلے پڑی اس کی میں کیا دوا کروں
شرحِ سخت جانی، موجبِ پریشانی، گوشِ حقِ نبوت، جانِ کر طول کو مختصر کیا، جانِ عالم نے یہ سن کر رو دیا۔ وزیر کو گلے سے لگایا۔ خلعتِ فاخرہ عنایت کیا، پھر کہا "اے تم نے گود کے پالے، عرصہ قلیل میں بھلا ڈالے۔ بعد آداب و کورنش عرض کرنا، کہ بدولتِ کشش الفتِ پدری و تاثیرِ دعائے سحری سے خانہ زادِ بامراد، زندہ و سالم، شرفِ آستانِ بوس سے مشرف ہوا۔"

اس وقت وزیر نے پہچانا، قدموں پر گرا پھر سراٹھا کر بے اجازت بھاگا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، پکارا "مبارک ہو" استادِ علی
لوئے یوسف سوئے پیغمبرِ کفایں آئی

”اے بادشاہ با اقبال دے صاحب جاہ و جلال، بہ عنایت جامع المتفرقین، اولیٰ اہل
برکت دعائے مہاجرین دے نیر اوج بختیاری کوکب درخشندہ سپہر شہریاری، با فوج و لشکر اور
جمع حوران پری پیکر یہاں آیا اور اس اجڑے نگر کو آباد کیا۔ مشتاقوں کا دل الم رسیدہ شاد کیا،
شکر صد فکر، مالہ شبگیر با تاثیر تھا۔“

بادشاہ کو تو مرتبہ یاس حاصل تھا، وزیر سے یہ کلمہ فرمایا۔ میر تقی ۵

کوئی اور ہوگی وقت سحر ہو جو مستجاب شرمندہ اثر تو ہماری دعا نہ تھی
وزیر نے مکرر عرض کی ”بہر حضور شب دیگور، ہماری بین قدم سے اس شمع انجن افروز
سلطانی کی روشن ہوئی۔“ اس گفتگو میں وزیر تھا کہ جان عالم تنہا داخل ہوا محل میں محشر کا قیام
ہوا رونا پیٹنا مچا، رنڈیوں کا اثر دہام ہوا، ماں باپ نے گلے سے لگایا۔ شہزادہ بالراس و العین
آداب بجالایا۔

عین عنایت الہی دیکھے، اُسی دم دونوں کی آنکھوں میں بنیائی آئی، جسم میں تاب و
توانائی آئی۔ بادشاہ جلد سوار ہو، بہودوں سے لشکر میں جا کر دو چار ہوا۔ شہر والوں نے یہ ماجرا سنا۔
صغیر دبیر، برنادیر، دوڑے، دونوں لشکر جلو میں ہمراہ آگے آگے جہاں پناہ، روپیہ اشرفی
دو روپیہ تصدق ہوتا، مجلس میں لا کر اتارا۔

جان عالم کی ماں نے انجن آرا اور ملکہ مہر نگار کو دیکھا، جان و دل دونوں پر نثار کیا۔
بہت سا پیار کیا مبارک سلامت کی صدا درو دیوار سے پیدا ہوئی، جس نے دیکھا وہ شیدا ہوئی۔
دوسرے دن ملکہ اور انجن آرا نے شاہ فیروز بخت سے عرض کی کہ اگر حضرت کی اجازت
ہو تو شہزادے کے مجلسِ اُستقامت میں ہم جائیں، ماہ طلعت سے ملاقات کر آئیں۔
بادشاہ نے فرمایا ”وہ عورت بد بخت، سخت منہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے، اسے
شرمندہ کرنے سے کیا حصول ہے۔“

میاں مٹھو بھی حاضر تھے، بول اٹھے ”قبلہ عالم، یگانگت، مقتضی ملاقات ہے، خفت و ذلت
کی کیا بات ہے۔“

بادشاہ چپ ہوا۔ شہزادیوں نے سواری طلب کی۔ ظاہر پرآن نے پیش قدمی کر کے،
ماہ طلعت کو سلام کیا، اس نے سر جھکا لیا۔ یکایک سواریاں آپہنچیں۔ اس وقت وہ خفت کی ماری
اٹھی، استقبال کیا۔ دونوں نے گلے سے لگایا۔ مسند پر جا بیٹھیں۔ ملکہ بڑی مقرر خوش بیاں تھیں۔
انجن آرا اتنی طر آر کہاں تھی، سلسلہ کلام بہ دلداری تمام کھولا کہ ”ہماری جانب اور گمان نہ لانا“

ہم بہر حال شریکِ بشارت رفیقِ ملال ہیں۔“

تو آنجن آرا کے سامنے آیا، ماہِ طلعت سے کہا ”حضرت سلامت! اتنا زبانِ مبارک سے فرماؤ کہ آج سچا کون ہے، جھوٹے کے منہ میں کیا ہے، اور تو کیا کہوں۔ آپ کی کج بکشی کے باعث جانِ عالم کے ہاتھ یہ لوگ مہربان ماہِ صیبا آئے، گو اتنا چکر ہوا۔ میرے سبب آپ کو ندامت ہوئی۔ جھوٹے کے منہ میں گھٹی شکر ہوا۔“ اجن آرا تو سیدھی بھولی تھی۔ تو تے سے بد مزہ ہوئی فرمایا ”دیوانے کیا بیودہ بکتا ہے۔“ پھر ماہِ طلعت سے کہا ”سنو میری جان! یہ جانور بے شعور عقل سے دور حیوانیت سے مجبور ہے، دنیا کا کارخانہِ فساد ہے۔ دبا یہ حسن و خوبی عارضی وہ عارضی ہے، اس پر کیا اترا ہے۔ یہ کیفیت یہ جو بن یہ سن چار دن کا ہے، ناپائدار اس کا کیا اعتبار۔ رنگ چمن دنیا جاوداں نہیں، کون سی بہار ہے جسے خزاں نہیں، حسن پر غرور بے جا ہے۔ سرور یہ کتا ہے۔ شعر ہے

بہتا دریا ہے چمن اس میں ارے دھولے ہاتھ

کَلِّ مِنْ عَيْنَيْهَا فَإِنَّ وَثِيقَةَ وَجْهِ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ - نظم

نظر پڑا چمن دہر میں جو ہم کو مکاں
ہمارے زعم میں اس سا نہیں کوئی ناداں
شکستہ رنگی گل شاید چمن ہے یہاں
گھمنڈ اس پہ حماقت کی بس نشانی ہے

آخر کار دونوں نے ماہِ طلعت کو شیریں زبانی اور اپنی خوش بیانی سے شکستہ خاطر کیا۔ دو چار گھڑی ہنسی خوشی اختلاط رہا، مگر تو تا نوک جھونک چھیڑ چھاڑ کئے گیا۔ پھر رخصت ہوئیں، اس نے حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ واقعی جنہیں اللہ حسن بے مثال مرتبہ جاہ و جلال دیتا ہے ان لوگوں کا دل صفا، منزلِ غبارِ کلفت اور عجب و ندرت سے صاف، اور مرآتِ سینہ زنگِ حدودِ کینہ سے شفاف ہوتا ہے۔

القصہ باہم بے رنج و الم رہنے لگے۔ سب شاد ہر روز خنداں و خرم و فرحان بسر کرنے لگے۔ نئے سرے وہ اجڑا شہر بسا۔ بنائے ظلم و ستم مہدم ہوئی۔ مروجِ عدل و داد ہوا۔ دانا باقی سے حال میں آباد ہوا۔ خزاں چمن سے دور ہوئی، بلبلی نالاں سرور ہوئی۔

ایک روز جانِ عالم نے تمام خلقت کو درِ شہرِ نپاہ پر طلب کر کے وہ بکری کا بچہ دکھا، نمک حرامیاں، اس کی سنا، جلا دے حکم کیا۔ اس کے اعضا اعضا سے جدا بے دست و پا کر زاغ و زغن کو گوشت کی بوٹیاں اڑا کر کھلا دو، شکاری کتوں کو لہو بہا کر چٹا دو۔“

بمجرد ارشاد سر اس بد نہاد کا تیغ جلاد سے جدا ہو گیا۔ خلق خدا یہ حال دیکھ ماجرا اس کے تھرا گئی۔ سب نے اس بے دین پر لعنت و نفریں کی۔ جان عالم نے دولت سرا کی راہ لی۔ اسی روز فیروز شاہ نے تاج و تخت بیٹے کو حوالے کیا، خود گوشہ تنہائی لیا، بادشاہ شب اپنی عبادت اور بیداری میں سحر کرتا تھا۔ وہ تو قائم اللیل صائم النهار مشہور ہوا۔ جان عالم ہر روز تخت پر جلوہ افروز ہو، عدل کی داد دے۔ شب کو پری پکیروں میں بسر کرتا تھا۔ یہ عادل و سخی و رحیم و شجاع یکتائے روزگار مشہور ہوا، ذکر دونوں کا تا قیام قیامت صفحہ روزگار، ورق لیل و نہار پر اور ہر زبان یگانہ و بیگانہ رہا۔ بات باقی دیکھی نہیں تو دور دوراں میں کس کا دور رہا، کس کا زمانہ رہا جس طرح جان عالم کے مطلب ملے، اسی طرح کل عالم کی مراد اور تمنائے دلی اللہ دے۔ علی الخصوص سامعین ناظرین راقم و مولف کی خواہش و آرزو بہ تصدی رسول عربی بر آئے بحسب متہ النبوی و آلہ الامجاد بالنون و الصاد و باسباب ظاہریہ فسانہ نادر زمانہ، مضمون چکیدہ دل و تحریر خامر ہے۔ اگر دیدہ غور و نظر تامل سے ملاحظہ کرو تو حقیقت میں کارنامہ ہے، فقط جس دم نظریض اثر سے جناب قبلہ و کعبہ مخدوم و مکرم آغا نواز شہین خاں صاحب، عرف مرزا خانی صاحب کے یہ گذرا، بعد اصلاح شاگرد نوازی فرما قطعہ تاریخ سے زینت بخشی۔ قطعہ استاد سے

برائے خاطر یاران و احباب

بجسم سال تاریخش نوازش

ایک دوست بندے کے زمانے کے تعلق سے مثل سر و آزاد لالہ درگا پر شاد تھے۔ ہنریں عیب پوش تخلص مدحوش خم محبت سے مئے الفت جوش میں آئی تاریخ مستانہ زیب فسانہ فرمائی۔

مدحوش

کہا فسانہ جو یہ عجائب سرور دل خستہ و حزیں نے
جہاں یہ کچھ گل کی گفتگو ہے وہاں یہ کچھ اور رنگ بو ہے
جہاں کیا غم نے ہے جگر فوں نظر پڑاں شفق کا عالم
کہیں چشمے کا ماجرا ہے دکھائی وہ آب تاب اس نے
کہیں جو دریا کا ذکر آیا تو کشتی دل ہے نذر طوفان
ہوا ہے جس جس جگہ یہ اس میں بیان سحر و طلسم و جادو
جو قید میں دیو کی پھنسا ہے کسی جگہ پر کوئی پیر یو
کہ جس کی تاثیر سے بیان کے ہر ایک دل بیکار دیکھا
جہاں خزاں کی غلش ہے اس میں وہاں کیا کیا نہ خا دیکھا
کہیں جہے داغ دل کا پھولا تو اس جگہ لالہ نار دیکھا
کہ چشمہ چشم سے ہر اک کے رواں ہوا چشمہ سار دیکھا
جو کوہ نے سر کہیں اٹھایا تو جان کو سنگار دیکھا
تو قدرت حق سے اس مکان پر نئی طرح کا حصار دیکھا
تو کیا نہ سامان چھوٹنے کا وہاں پر بر روئے کار دیکھا

کسی جگہ پر جو جگہ سن کا جو گویا کے بیاں ہے اس میں
 کیس جو آمد کی یار کے کچھ خبر کا چرچا کیا ہے اس نے
 جو وصل کی شب کچھ بیاں ہے تو جمع ہے خاطر پریشاں
 جو بزم کا کچھ بیاں کیا ہے تو کوئی مجلس نہ دیکھی ایسی
 کیس کھینچی ہے جو تیغ ابرو تو ہو گئے دل کے ٹکڑے ٹکڑے
 خرابی حال عاشق ایسی کہ جس پر روزِ نافلک کو آئے
 نہ پوچھو حال اس فسانے کا تم کہ ڈھنگ کیا بھرہیں اس میں

تو خوب چھانا پر اس جگہ کچھ نہ غیر مشتِ غبار دیکھا
 تو دیدہ ہر اہل دید کا واں پہ وقف صد انتظار دیکھا
 جو روزِ ہجراں کا غم لکھا ہے تو دل کو کیا انتشار دیکھا
 جہاں پہ کچھ رزم کا بیاں ہے ہر اک اسفند یار دیکھا
 کیس جو تیرنگاہ چھوٹا تو صاف سینے کے پار دیکھا
 کیس یہ معشوق کی ہے خوی کہ ملک تک زنگار دیکھا
 جو حسن دیکھا تو زور دیکھا، جو عشق دیکھا تو زار دیکھا

ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سالِ تاریخ اس کا لکھئے
 تو کھینچ کر آہ دل سے نکلا، خزاں سے رنگ بہار دیکھا

۱۲۴۰ھ

تاریخ از مصنف

جس نے کہ سنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے
 تاریخِ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم

یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بائیں کا
 بے ساختہ جی بولا، نشتر ہے رگِ دل کا

۱۲۴۰ھ

DATE LOANED

Acc. No. _____

[illegible]

تاریخ نسخہ ہذا از منظور علی فاروقی تمنابجوری

سعی مرغوب

۱۳۸۸ھ

کہ از طبع بسیط مشفق و محبی جناب اطر پروردگار صاحب

صاحبِ قال لیکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باسلسلہ مربوط تدوین نو نسخہ فسانہ عجائب

باحسنِ فہیم بلیغ نمود

و در اہل عالم مقبول زمانہ گشت

۱۳۸۸ھ

گلبن و شمع

۱۳۸۸ھ

از فکرِ بلیغ و جہدِ موزوں پر دین بصدِ خلوص یکسر

تدوینِ فسانہ عجائب و اللہ چہ کرد گوہرے سفت

از باقی غیب ہم تمنّا پر سید چو سالِ طبعش

جذباتِ فسانہ عجائب، درنگِ علو - بیداں گفت

۵۷

۵۸۰

۱۳۸۸

۱۹۴۸ء

از فکرِ حقیر تمنّا - بجوری

۱۳۸۸ھ

۲۰۲۵ ہجری

(اس عبادت پر کوئی عنوان نہیں ہے۔ فسانہ عجائب کا جو ایڈیشن مطبع
مصطفائی لکھنؤ میں محرم ۱۲۶۲ھ میں چھپا اس میں سرور کی کسی ہوئی تاریخ
کے بعد مندرجہ ذیل عبارت شروع ہوتی ہے جو بعد کے ایڈیشن میں نہیں ہے)

برسوں یہ فسانہ کساد بازار کی زبانی سے تہہ رہا، مشہور نہ ہوا۔ تیسری برسیع اثنانی
بارہ سے تین ہجری کو نصیر الدین حیدر داخل فردوس بریں ہوئے اور محمد علی شاہ
بادشاہ بعد جنگ مناجان کے تحت نشین ہوئے۔ زمانے کا رنگ بدلا، ہر شخص بدسہر
حساب ہوا، مسودہ فتنہ و فساد کا باب ہوا۔ اہل کمال مالا مال ہوئے۔ غریب و عزیزا نہال
ہوئے۔ بعد انتقال منظم الدولہ مہدی علی خاں نوں شوال سنہ مذکور ظہیر الدولہ غلام محی
خاں کو نیابت ہوئی۔ فلک نے رشک کھایا۔ حافظ حقیقی نے چشم بد کے گزند سے نہ
بچایا، پیما بقاء بادۂ اجل سے لرزہ ہو کر پھلکا، پچیسویں ذی الحجہ کو دل کی تمنا دل میں رہی
نہ کسی کی مٹی نہ اپنی کمی۔ پھر اس عہدہ سے منور الدولہ احمد علی خاں سرفراز ہوئے۔
بادشاہ کے نزدیک ممتاز ہوئے۔ لیکن یہ خدمت نبھ نہ سکی۔ نیابت سست رہی۔ آخر
کو حق بمرکز قرار گرفت اور شرف الدولہ بہادر کو یہ عہدہ ملا۔ پھر تو نیابت یہ چلی کہ
دیکھی نہ مٹی۔ بھئی برکی کا نام اجیا ہوا۔ آصف برخیا دوسرا ہوا۔ اگر کلک قدرت دفتر
روزگار پر صفت اس کی رقم کرے، نہ ہو سکے۔ بشر کی کیا مجال ہے۔ بہت محال ہے۔
شرف پابہ وزارت افتخار مسند حکومت و امارت ہزبرہ معرکہ شجاعت ابراہیم گربار میدان
سناوت دبیر عطار دجاہ وزیر عالم پناہ ماہ کنغاں مہرتاباں، بہت نے اس کی خوان
خلیل صفحہ دوراں پر بچھایا۔ حاتم طائی کو سب کے دل سے بھلایا۔ حوصلہ طلب اس کی بخشش
کے روبرو کوتاہ ہے۔ کوہ زر بدتر از پرکاہ ہے۔ مطلب سائل ہنوز دل سے زبان پر
آنے نہ پایا کہ مدعا برآیا۔ ایدھر محتاج نے لب سوال کھولے، اودھر دامن میں
موتی روئے۔ چارہ ساز در ماندگان ہے۔ خلق خدا کا حافظ و نگہبان ہے۔ پری شمائل

فرشتہ خصال انسان ہے۔ قدرت رب دو جہاں ہے، دم جود و سخاوت گہر بار شمع ابر بہار ہے۔ یہ نامور زمانہ یادگار ہے۔ چرخ مطیع فرمان ہے۔ اس کے دور میں دست بستہ دورہ دوراں ہے۔ عنایت پروردگار شامل ہے۔ از سر تا پا صاحب جمال ہے، حسن خداداد کامل ہے۔ کاسہ سر جس کا ہمسر نہیں، حکمت و عقل سے معمور ہے۔ دماغ میں شوکت فرمانروائی ہواٹے خیر خواہی شائی بلند مرتبہ عالی، عجب و نخوت سے خالی، فہم و فراست کا دھور ہے۔ سر میں سربراہی ہے، اس بھید سے کسے آگاہی ہے۔ اللہ نے اپنی رحمت کو مجسم کر کے بھیجا ہے داد رسی سے پریشان نہیں ہوتا، رستم کا دل اسفندیار کا سا کلیجہ ہے۔ جبین اذکار مطلع نور ہے۔ حاسد نے جبین ثانی ہے۔ مشہور ہے بلند و کشادہ پیشانی ہے، سخاوت کی دلیل، فیاضی کی نشانی ہے۔ مہ نو نجم ابرو ہے، سنبلیں گیسو ہے، مژہ آبدار ہے سنیہ عدد کے پار ہے۔ پشتم وہ کہ جس کا ہم چشم غمقا ہے۔ غزال رغا چکارہ ہے شرم دیا کا اس میں سرور ہے، رحمت کا اثر ہے۔ عیب پوشی عالم کی مد نظر ہے۔ ہوا خواہوں کے دل اس آنکھ کے ندیدے ہیں۔ عین الکمالی میں جرمیدے ہیں۔ الف بینی خط راست ہے، شمیم صفت بھری ہے۔ خود بینی سے بری ہے۔ عارض تاباں کی ضیا سے مہر سوزاں ہے، ماہ کو فروغ نہیں، سخن راست ہے، درد غ نہیں۔ گوش حق نبوش خداٹے درد مندان پرودا ہے۔ فریاد غر با دل کے کاؤں سے سنتا ہے۔ صفت اُن کی امکان بشر سے دور ہے۔ بری کان بکراتی ہے۔ حلقہ بگوش حور ہے۔ لبوں میں مسیحا، زبان شیریں بیان میں عقدہ کشائی ہے۔ دہن والا چشمہ حیوان سے میٹھا۔ ہاتھ شجر سرسبز جو د عطا کی شاخاٹے پر گل و بار ہیں یا لکھ ابر گہر بار ہیں۔ خزانے دے ڈالے ہیں۔ پھر سردست طیار ہیں۔ کیا کہوں صفتیں کیا کیا رکھتے ہیں، بخشش میں کف دست یہ بیضا رکھتے ہیں۔ سینہ بے کینہ گنجینہ علم و حلم معدن اسرار اللہ ہے۔ دل صفا منزل کہ منظور رضاٹے خدا منظور خرسندی پادشاہ ہے۔ رشک و حسد سے پاک و صاف ہے، آئینہ حلب میں

۱۔ [فرمان ردائی کے وزن پر شاہی کے بجائے شائی] نیز

۲۔ بظاہر کتابت کی غلطی ہے اور ہونا چاہئے۔

۳۔ جس ماننا یا چیں بولنا اظہار عجز اور اعتراف شکست کے لئے

آتا ہے۔ نیز

رنگ ہے۔ یہ شفاف ہے، مراّت جہاں نما ہے۔ برت کعبہ خانہ خدا ہے، حلقہ کمر کے
 رو برو کمر بستہ چرخ اختر ہے۔ کترین چاکر ہے۔ پاؤں جو انفرادی و ثابت قدمی کے
 ستون ہیں۔ گردن کُشان دہر زید قدم سرنگوں ہیں، پشت پا پر خلق کی پیشانی ہے، انھیں
 قدموں کی بدولت آبرو ہاتھ آتی ہے۔ طالع یاد و بیدار، بخت رسا مددگار ہے۔ فلک
 محکوم قضا و قدر فرماں بردار ہے، خلق و مروت، جرات و ہمت، شجاعت و سخاوت، حسن و
 صورت، شوکت و ہیبت از سر تا پا قدرت خدا ہے۔ اگر دیدہ و دل بینا، عقل رسا ہو
 تو دیکھے اور سمجھے کہ کیا ہے، رفیق جان نثار عزیز^۱، عزیز از جان جانتے ہیں۔ جانفشانی
 اور اطاعت کو جزو ایمان جانتے ہیں۔ رعبِ عدل یہ ہے کہ کبوتر کی ایذا سے باز باز ہے
 بلکہ سرگرم غمزہ و ناز ہے اور بعض بعض جا دیکھا ہے کہ کبوتر کا بچہ جان بازی کرتا ہے،
 اشیاء شاہین میں بازی کرتا ہے۔ جب چمن میں بے وقت طاؤس جھنکارتا ہے تو تنہا
 سانپ کچھ مارتا ہے۔ یہ رواجِ لطف و کرم ہے کہ بچہ گرگ دریدہ دہن شانہ بوئے برغم
 ہے اور عدلت کا ایسا رنگ و ڈھنگ ہے کہ سینہ پلنگ خونخوار بچہ آہو کا پلنگ ہے۔
 آفتاب اگر نگاہ گرم سے غرض گل تو کو دیکھے تو خط شعاع بسان نشر خار سینہ فگار
 کرے۔ پیر پردانہ اگر دھوکے میں شعلہ شمع سے جل جائے تو سر محفل وہ بھی روتے
 روتے پگھل جائے۔ دزدیدہ نگاہیوں پر معشوق ایسے گنگار ہیں کہ سلسلہ زیب و زینت
 میں ہر دم گرفتار ہیں۔ ایسا سخی مزاج ہے کہ احتیاج لوگوں کی محتاج ہے اور بخشش عام
 اس قدر ہے کہ غنچے کی بھی گرہ میں زر ہے۔ تعریف جو ہر بخشی کی محال ہے۔ زبان تک
 اس بیان میں لال ہے۔ کیونکہ نہ حاجت روائے بشر ہو جس کے فیض نظر سے شعلہ شمع
 طرہ زر ہو۔ ناوک غضب اگر چھوٹے مریخ کے ہاتھ سے خنجر گر پڑے۔ سپر چرخ ٹوٹے،
 شمشیر عتاب عدو کو دو کرے۔ ایسا کاٹے بلکہ گاؤ زمین کا لہو چاٹے۔ سوختہ غضب کا اُس کے
 کبھی نہ بیڑا پار ہوا۔ اگر سمندر میں گرائی آتا ہوا۔ اور بھر رحمت جب اُبلتا ہے، شجر سوختہ
 پھوٹتا پھلتا ہے۔ نخل تنائے خلائی برگ بار لاتا ہے اس گیشن کا سرو ثمر آبدار لاتا ہے۔
 سینہ ننگ میں شر لال ہوتا ہے، پہاڑ بھی اس کی عنایت سے بالامال ہوتا ہے، روشن

۱ عزیز کی سحرار بظاہر کتابت کی غلطی ہے۔

۲ غنم بمعنی بھیڑ یا بکری۔

ہے کہ اس انجن میں جھاڑ جل کے سرسبز ہوتا ہے، کشتِ کار فیض اس کا بھنا چنا
 بوئے نہال ہوتا ہے۔ آتشِ مطہج سے لوگ فیض پاتے ہیں، کلیجہ سینکے پر جی جلاتے ہیں۔
 صفتِ اسپِ صرصر خرام، تیز گام میں کیتِ خامہ لنگ ہے۔ عرصہٴ وسعتِ دنیا زیرِ قدم
 اس کے تنگ ہے۔ بگھی ہر ایک نور کی ہے، بلکہ پتلی دیدہٴ نور کی ہے۔ آنکھوں میں جا دی
 ہے۔ ٹپ پرودہ چشم ہے ہودہ نہیں آنکھ لگا دی ہے۔ فیضانِ پرشکوہ کا وہ جاہ و حشم ہے کہ
 رفتِ فلک ان کے ردِ برد کم ہے۔ اگر سر اٹھائیں ماتھے آسمان سے رگڑ جائیں۔ بک رو بخجول
 ایسے کہ دورانِ ضعیف زیرِ پا آزار نہ پائیں۔ شمشیرِ برق و ش تیغِ قضا ہے۔ دشمن کا دل
 ہیبت سے دو نیم ہو رہا ہے۔ خم اس کا ہلال، دم دم صور ہے، رنگ الماسی ہے بدخواہ
 کے لہو کی پیاسی ہے۔ عدد کے جگر میں اس کے زخم کا ناسور ہے، عجائبِ غرائب کا تحفہ
 ہے کھتی سے پیپے تک اجل کا گھاٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ صدوسی سال با جاہ و اقبال فرق
 ہندگانِ خاص پر سایہ اُن کا رکھے۔ عددِ پامال ہو، ترقی خواہ مالا مال ہو۔

بندہ بھی خوش طامی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا۔ ہر شب شبِ بربات
 ہوئی، روز نور روز ہوا۔ اس کہانی کی بھی آبرو ہوئی، ہر ایک کو خواہش ہوئی، جستجو ہوئی،
 نوبت یہاں تک پہنچی کہ لکھی نہ گئی، چھپنے کی صلاح ٹھہری فقط

ص ۱۹۲ تا ۱۹۷

مندرجہ بالا عبارت مطبعِ مصطفائی لکھنؤ سے منقول ہے جو مجھے ڈاکٹر نیر مسعود
 نے بھجوائی ہے۔ یہ عبارت آزاد لائبریری کے مخطوطے میں بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود
 اپنے ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”اس عبارت کے بعد خاتمہ الطبع ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ
 ’اب کی بار‘ یہ کتاب مطبعِ مصطفائی لکھنؤ میں محمد مصطفیٰ خان ولد
 حاجی محمد روشن خان کے اہتمام اور عبد الغنی کی تصحیح کے ساتھ
 ۲۱ / محرم ۱۲۶۲ھ کو چھپی۔ خاتمہ الطبع کے بعد شیخ کرامت علی اظہر
 میر ناصر علی نصیر، شیخ نواز علی سجاد، عبدالرحمن خان عاصی (ناشر
 کے بھائی) اور عبداللہ خان قمر (ناشر کے بیٹے) کے کہے ہوئے قطعات
 لے بخجول۔ بک قدم جس کے چلنے میں جھٹکے نہ پڑیں

تاریخ طبع ہیں -

بیان لکھنؤ میں میر حسن رضوی اور ان کے مطبع کی جو تحریف ہے اس کو عمومی رنگ دے کر لکھنؤ کے مطبعوں کی تحریف میں بدل دیا گیا ہے اور میر حسن کا نام خارج کر دیا گیا ہے۔

کل صفحات ۱۹۸ کتابت و طباعت کے حسن اور صحت متن کے اعتبار سے یہ ایڈیشن بہت اہم ہے۔ میں نے فائدہ عجائب کی ایڈیشنوں کی بحث میں اس کا جو تعارف کرایا ہے اسے بھی دیکھ لیں۔

نیر مسعود

فسانہ عجائب کے چند اہم خاتمہ الطبع

خاتمہ الطبع فسانہ عجائب طبع اول (مطبوعہ مطبع میر حسن ۱۲۵۹ھ)

للہ الحمد والمنہ کہ نسخہ قصہ جان عالم شاہزادہ بہ زبان اردو مسمی بہ فسانہ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بیک واسطہ سلسلہ تلمذ را بجرأت می رسانند در ماه جمادی الثانی روز شنبہ تاریخ ۱۲۵۹ ہجری در عہد دولت مہد امجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مطبع حسنی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنؤ بجلد محمود نگہ طبع نمود۔ قطع تاریخ از شیخ گرامت علی انظر سے
 این کتاب جان عالم چوں حسن فرمود طبع
 خامہ انظر پئے تاریخ وقت انطباع
 معنی نوراً علی نور از دی آمد در ظهور
 نہ در رقم از طبع باشد جان عالم پیر سرور

۱۲۵۹ھ

خاتمہ الطبع فسانہ عجائب طبع ثانی (مطبوعہ مطبع میر حسن ۱۲۶۲ھ)

للہ الحمد والمنہ کہ یہ فسانہ نگہیں بھد ندیب و تزیین بسان قند مکڑ پسند خاطر سراپا قصور اعنی سرور کے چھپا اور جناب میر حسن نے بفضل رب ذوالمنن کوئی احتیاط کا دقیقہ اڑھانہ رکھا اور ابتدا سے انتہا تک نظر مولف سے گذرا بہت فسانہ سابق اکثر جا راقم نے محل اور موقع جو پایا اس کو بڑھایا ملاحظہ ناظرین پڑ تمکین میں جو آئے گا

یقین ہے کہ لطف دکھائے گا۔ یہ نسخہ اور بزرگواروں نے بھی طبع کیا۔ الا بطرز زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا کم و بیش ہو گیا جو فقرہ نہ پڑھا گیا وہ اپنے طور پر گڑھا گیا اس نشیب و فراز کو امتیاز شرط ہے لہذا بیاس خاطر جناب میر صاحب ممدوح کہ بندے کے محسن ہیں اور صفحہ دہر پر انتخاب ہیں ہر ایک سے میرا سوال ہے کہ لا جواب ہے۔ اس کی صحت و غلطی میں بہت کد ہوئی، کوشش از حد ہوئی اور جو بعض جا سہو بشریت سے ہوا۔ اس کا صحیح نام لکھا غرض کہ اس شفافی سے اکبر علی خاں نے لکھا کہ گو خط سات ہیں ہفت قلم کا ہوں کو کہتے ہیں مگر اس کا حسن خط نو خطوں سے گوئے سبقت لے گیا، دیکھنے والے حیران رہتے ہیں اگر رنگ حد طبیعت سے دور ہو تو آنکھ پڑتے ہی دل مسرور ہو۔ ہر سطر رلف مسلسل عنبریں مویاں ہے اور بین السطور سے صفائی عارض مہر ویاں جلوہ کناں ہے ہر ایک صفحہ آئینہ حلب ہے صاف باطنوں سے داد طلب ہے وگرنہ بمجبوری یہ حرف زبان پر آجائے گا کہ جیسا منہ ہوگا وہی نظر آئے گا گواہ اس فقرے کی مہر فقیر ہے۔ خدا شاہد ہے یہ مطبع بے نظیر ہے۔
[مہر مرزا رجب علی]

خاتمۃ المطبع فسانہ عجائب مطبوعہ مطبع محمدی کانپور۔ (۱۲۶۷ھ)

یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے، محقق کا کلام ہے کہ عجب قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است۔ چنانچہ یہ فسانہ عجائب کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں نظر آتا نہیں کوئی پاتا نہیں کس قصے کو اس سے ہمسری ہے اس کی تمنا آج تک قدردانوں کے سینے میں بھری ہے۔ یہ فقط عنایت پروردگار ہے اس کا رشک و حد بیکار ہے۔ بالفعل اس کے چھاپنے کا خیال دل صفا منزل میں جناب حاجی حرمین مولوی محمد حسین دام اللہ افضالہم کے آیا بسکہ حاجی صاحب موصوف بہ صفات پسندیدہ معروف ہیں تحریر فقیر اس مقدمے میں بیکار ہے۔ کاشمیں نصف النہار عالم میں آشکار ہے جو کتاب اس کا رخانے کی ہے انتخاب ہے۔ ہر کار پر دازہ ہوشیار کا دفرما لا جواب ہے جو جو سرگرم کار و بار ہیں نادر روزگار ہیں انھوں نے مولف فسانہ سے کہ تابع فرماں بہ دل و جان ہے ارشاد کیا، کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جائے خدشہ رہنے نہ پائے۔ حسب ارشاد اس حجتہ نہاد کے نیاز مند قدیم نے کوشش عظیم سے ملاحظہ کر کے جہاں

موقع پایا کچھ اور بڑھایا۔ یقین کامل ہے کہ اب جس کی نظر سے یہ گزر جائے گا تازہ لطف نظر آئے گا۔ اکثر جاوِل کو جو لگایا ہے تازہ فقرہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقات کو بیکار نہیں کھویا ہے، دُر شہوار ملک تقریر میں پر دیا ہے، منصفوں سے داد طلب ہوں کہ کیا کیا خون دل میا، نخت جگر کھایا ہے جب اس طرح کا مضمون ہاتھ آیا ہے، دو فقرے پسندیدہ لکھتا دُشوار ہے۔ یہ تو ایک قصہ طویل بڑا طومار ہے خوشنودی طبع کے بعد امیدوار دعا ہوں کہ اب برسر منزل آہنچا ہوں۔ شائق اس کو جب پڑھیں گے، دنیا میں بڑھیں گے، کم نہ ہوں گے، یہ فسانہ رہ جائے گا۔ بعد چندے مگر ہم نہ ہوں گے جس تکلف سے اب کی بار چھپایا ایسا کبھی نہ تھا جس طرح سے یہ مشہور ہوا سرور کو سرور ہوا فقط۔

خاتمۃ الطبع فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع کانپور (۱۲۷۶ھ)

اگر سو سن بعد زبان حمد سرائے رب دو جہاں نہ ہو تو چین دہر میں سرسبزی نہ پائے اور غنچہ بے ہوائے نسیم نعت سرور کائنات کھل کے گل نہ ہو، مد نظر بلبل نہ ہو اور ایسا جو بن نہ دکھائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کے مُنہ میں زبان ہے اور طلاق لسان ہے فقط فیض حمد خالق جن دبشر ہے ذریعہ نعت شفیع محشر ہے دگر نہ گونگے سے بدتر ہے کون سُنتا ہے لاکھ سر دھنتا ہے شمع ایک پاؤں سے کھڑے ہو کے ہر محفل اشہدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ نہ کہے تو سحر تک اس چمک اور روشنی سے زیب محفل ارباب کامل نہ رہے اور اشہدان محمد الرسول اللہ کا اقرار نہ ہو تو ہر مجلس گل طرہ دستار نہ ہو پروانے کو پروا نہ ہو، پاس نہ جائے بایں بے ثباتی اعتبار نہ پائے۔ لہذا ہر شے کی ابتدا اور انتہا جو اس پر نہ ہو تو زیب دفتر نہ ہو۔ الحاصل فسانہ عجائب کہ اسم بامسمیٰ اور لاجواب ہے کتب خانہ کائنات میں انتخاب ہے دوستوں کی تحریک سے ہاوجود مکروہات زمانہ ناہنجار اور فکر معاش کے انتشار میں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کانپور میں چھاپا اور مصنف سے نظر ثانی کو ارشاد فرمایا، وہ ان کا حکم بجالانا موجب مسرت جانتا ہے پھر اس کی دیکھا بھائی ہوئی، صرف نازک خیالی ہوئی یہ فقط کارخانہ قدرت ہے عقل اس میں عاری ہے بوموں سے اس کے چھپنے کا دور تسلسل جاری ہے۔ دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا

ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرطِ زلیت نیا کر دینے کا آمادہ ہے مگر بہ نظر انصاف اور رشکِ
 حسد سے جی صاف کر کے دیکھو جو چیز نظر سے گزرے اور وہ نادر ہے مگر دیکھنے میں بشرطِ
 دیکھا ہے کہ بارِ خاطر ہے مگر اس فسانہ میں یہ سحر پرداز ہے کہ جب نظر پڑے کیفیتِ
 تازی ہے۔ یہ مصنف کے حال پر عنایتِ پروردگار ہے۔ اس کا رشک و حسد بیکار ہے
 یہ عجب نگار خانہ سحر طراز ہے کہ ہر دم اس کے شوق میں سخنِ ستج کا دیدہ باز ہے کسی طرح
 دل نہیں بھرتا ہے ہر دم شوق اور بھرتا ہے اور جب مصنف کی نظر سے یہ کتاب گزر جاتی ہے
 زیورِ بیان تازہ کی چمک سے دلی رنیت پاتی ہے، سنگ میں نالِ صدف میں در شاہوار
 ہے، نافہ میں مُشک، گل میں رنگ و بو معطر چار سو بے مثل یادگار ہے جب چھپتی ہے
 تیا ناز و انداز پیدا ہوتا ہے دیدہ دل شیدا ہوتا ہے جن کی ناک ٹھوہنی سے بری ہے
 ان کے دماغ میں اس کی بوباس بھری ہے اور جو گوشِ شنوا دیدہ بنیاد رکھتا ہے،
 صاحبِ فہم ذی ہوش ہے انصاف کی راہ سے حلقہ بگوش ہے اور حاسد کی بات نرالی
 ہے، لا ابالی ہے، خدا و رسول کو اُدن کی زبان سے نجات نہ ملی تو دوسرا کب بچتا ہے
 ان لوگوں کو بھونکنے کی عادت ہے لکھی نہیں پچتا ہے۔ دو نسخے اور مصنف نے تازہ لکھے
 ہیں۔ مریضانِ محبت کی دوا ہے، کیا لکھوں کہ کیا لکھا ہے جب وہ دیکھنے میں آئیں گے،
 آنکھیں کھل جائیں گی، مصنف لطف اٹھائیں گے۔ لہذا الحمد کہ یہ صنمِ رعنا محبوبِ زیبا
 تاریخِ بارہویں ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ شہرِ کانپور محلہ پٹکا پور افضل المطابع محمدی میں چھپ کر
 منظورِ نظر ہوا، سخن شناسوں سے یہ التماس ہے کہ کثرتِ سن سے ہوش بجائے ٹھکانے کو اس
 ہے۔ اگر کچھ مزا ملے تو راقم اور چھاپنے والے کو دُعائے خیر سے یاد کریں اپنی طبیعت
 شاد کریں فقط۔

خاتمۃ الطبع، نسخہ ہذا

الحمد للہ فسانہ عجائب موسوم بہ قصہ جان عالم و انجن آرا، بڑے اہتمام سے سنگم پبلشرز، الہ آباد سے چھپ کر منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں مرتب نے بڑی جانفشانی کی، دو سال صرف کئے اور سچ یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا۔ یہ وہ کتاب ہے کہ بقول مصنف ”مکرر دیکھنے میں ہمیشہ دیکھا ہے کہ بار بار خاطر ہے مگر اس فسانے میں یہ سحر پر دازی ہے کہ جب نظر پڑے کیفیت تازی ہے“ مرتب نے اس کی ترتیب میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا، مہینوں اس کی خاطر آرام کا نہ نام لیا۔ کل کو بہتر بنانے کی خاطر جز پر نظر رکھی۔ ہر چند یہ کتاب بار بار چھپی، مگر اس اہتمام کے ساتھ شاید پہلی بار چھپی یہ بھی مرزا رجب علی بیگ سرور کا اعجاز جلیل ہے کہ یہ داستان سرور انگریز ہر لمحہ مائل بہ تکمیل ہے اور جو اسے دیکھتا ہے، خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا ہے۔ مرتب نسخہ ہذا کو یقین ہے کہ بہت جلد اس کے بہتر اور بہتر نسخے شائع ہو کر شائقین سرور کو پڑھ کر دے دیں گے۔ فسانہ عجائب بے مثال ہے، اس کی مزید تعریف کے لئے زبان گویا لال ہے۔ لب کا لب سے جدا ہونا محال ہے۔ لہذا الحمد کہ یہ افق مشرق سے فسانہ جان عالم، انجن آراٹے ہند، مرزا رجب علی بیگ کی سوئیں برسی کی شام کو مطلع ابر آلود سے طلوع ہو کر منظر عام پر ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ شہر الہ آباد سے ہویدا ہو رہا ہے کہ دو دریاؤں کا سنگم ہی نہیں، تہذیبوں

کا سنگم بھی ہے اور مرتب کے لئے قابلِ فخر ہے کہ یہ سرزمین وہ ہے کہ جس نے اس
 دو آبے میں اس کی تعلیم و تربیت کا برسوں خیال رکھا اور آج بھی اپنے دریائے فیض
 سے مرتب کو سیراب کر رہا ہے۔ اگر پڑھنے والے کو اس میں مصنف کے علاوہ مرتب کا
 خیال آئے تو دعائے خیر سے یاد فرمائے۔ بسکہ مرتب کو اچانک سمندر کا سفر درپیش ہے
 اس لئے مہینوں کا کام ہفتوں میں کرنا پڑا۔ اہل نظر پر واضح ہے کہ بشرِ غلطیوں کا پتلا ہے
 اگر اس کی ترتیب و تدوین میں خامیاں نظر آئیں تو نکتہ سنجوں سے درخواست ہے کہ مرتب
 کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں ان کو دور کر دیا جائے۔ فقط

” شادی بیاہ کی رسومات لکھنؤ“

جن کا ذکر فسانہ عجائب میں ہے“

رسیں خوشی کی ہوں یا غم کی، اپنی جڑیں بہت مضبوط رکھتی ہیں اس لئے کہ یہ انسان کی گھٹتی میں پڑی ہوتی ہیں۔ بعض رسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں انسان پسند نہیں کرتا لیکن ان کی پیروی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن وہ غیر شعوری طور پر ہوتی ہیں کہ ہمیں ان کا احساس بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ان رسومات کی این عورتیں ہوتی ہیں اس لئے وہ اس کی پابندی بھی سختی سے کراتی ہیں۔ رسموں کا تعلق ملک اور قوم سے گہرا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دیس کی آب و ہوا میں پرورش پاتی ہیں اس لئے رسموں کو ان کے دیس سے ہٹا کر دیکھنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب لوگ اپنا وطن ترک کر کے کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں تو ان کے لئے اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی رسومات کو برقرار رکھ سکیں۔ مجبوراً وہ اس دیس کی زندہ رسموں سے اپنا ناتا جوڑ لیتے ہیں اور پھر ان کو اپنا کر ان پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔

مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں :-

”اہل ہند کی تمام رسموں اور اکثر عقائد نے مسلمانوں میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اگرچہ علمائے مذہب نے ان رسموں کے اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت

نہیں کیا۔ مگر چونکہ گھر کے اندر کی بلا اور گھٹ میں بیٹھی ہوئی دوا اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ کچھ بھی پیش رفت نہ گئی۔ یہ رسومات ہماری تہذیب میں سرایت کر جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے کیونکہ ادب زندگی سے براہ راست اثر قبول کرتا ہے۔

”فسانہ عجائب“ میں بھی ہمیں رسومات کے پُر تو نظر آتے۔ خاص طور پر انجن آرا سے شادی کے موقع پر جن تقریبات کا ذکر ہے، ان میں ہماری تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تہذیب کی یہ پھاپ اس قدر گہری ہے کہ داستان کے چوکھٹے میں بھی ہمیں ان میں اجنبیت نظر نہیں آتی حالانکہ یہ شک بھی ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان رسموں میں بھی داستان طرازی ہو اور داستان کی طرح یہاں بھی حقیقتوں کی مبالغہ آمیز تصویریں ہوں بلکہ اس کے برعکس ہم کو فسانہ عجائب میں جو رسمیں نظر آتی ہیں ان میں رنگ آمیزی تو ہو سکتی ہے، لیکن تصویریں تقریباً ہو بہو ہیں۔

یوں تو رسموں میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہوتا لیکن ان کی عملی شکل میں غربت اور امارت کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ دولت کی فرادانی رسموں کو متاثر کرتی ہیں۔ فسانہ عجائب کی شادی بادشاہوں کے گھر کی شادیاں ہیں اس لئے یہاں ہر کام اللہ تلے ہوتا ہے اس کا داستان نہیں، بلکہ سماج کے سب سے اونچے طبقے کا معیار زندگی ہے جس میں ہر شے میں فرادانی کا احساس پایا جاتا ہے جہاں خوشی کے موقع پر سوئے اور چاندی کو کوڑیوں کی طرح لٹایا جاتا ہے۔

فسانہ عجائب چونکہ لکھنؤ کی داستان ہے اس لئے یہاں کی تہذیب میں لکھنؤ کی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن شادی بیاہ کی رسموں میں ہمیں عام طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ رسمیں دہلی ہیں جو دہلی کے قلعے میں رائج تھیں۔

غازی الدین حیدر نے دہلی سے آزاد ہو کر اپنی شہنشاہیت کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن دہلی کی رسومات سے آزاد ہونا ان کے بھی بس کی بات نہ تھی۔ یہ رسمیں کم و بیش وہی تھیں جو دہلی میں رائج تھیں۔ لکھنؤ والوں نے ان میں تصنع کی رنگ آمیزی کر کے ان کے اندر چمک دمک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ عمل اس لئے بھی ہوا کہ زندگی سے اس کی حقیقتیں چھن چکی تھیں۔ لکھنؤ میں بادشاہت نام کو تھی، کیونکہ بادشاہ تو ایک

ظاہری شکل کا نام تھا۔ اقتدار اور حکومت کا مرکز تو اور ہی کہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سارا زور باطن سے ہٹ کر ظاہر پر آجاتا ہے۔ اندرونی حسن کی کمی کو ظاہری حسن کے مصنوعی پن سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے لکھنؤ کی تہذیب میں سارا زور بناوٹ اور ظاہری شان و شکوہ پر دیا جانے لگا۔

شادی بیاہ کا ہی ایسا موقع ہوتا ہے کہ جہاں ان ظاہری چیزوں کے اندر مصنوعی حسن پیدا کیا جاسکتا ہے اس لئے لکھنؤ کی رسومات میں یہ تصنع غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ فسانہ عجائب کا دور لکھنؤ کی تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے ہمیں یہاں جو رسومات نظر آتی ہیں وہ بھی اپنے شباب پر ہیں۔

شادی کی رسومات ایک دن کی نہیں ہوتیں۔ ان کا سلسلہ دنوں پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ نکاح سے کبھی گیارہ دن پہلے، کبھی نو یا سات دن پہلے نہلا دھلا سرگوندھ کر دولہن کو مانجھے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اُس روز اُسے زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے اور اُس کا کمرے سے باہر نکلتا بجز خاص ضرورتوں کے پوتوں ہو جاتا ہے اور لڑکی مردوں کے سامنے نہیں آتی اور اس روز سے بلاناغہ ابٹنا ملا جاتا ہے۔ دلہن کے پہلے روز کا جھوٹا ابٹنا، اس کی جھوٹی مہندی، پینڈیوں کے ساتھ دولہا کے یہاں جلوس کی شکل میں بکھی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اور سامان بھی ہوتا ہے جیسے :-

۱۔ مانجھا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ پنجابی میں مانجھا پلنگ یا چار پائی کو کہتے ہیں۔ اسی سے مانجھے بٹھانے کا فقرہ استعمال ہوا۔ اسی رسم کو ”مایدوں بٹھانا“ بھی کہتے ہیں۔

۲۔ ہلدی اور جو کا بھنا ہوا آٹا، کھلی، چھیس چھبیل، ناگر مونتھا، بچ، بالچھر نیزیات اور تیل ڈال کر پانی میں گھولا جانا ہے اور جسم پر صفائی کے واسطے ملا جاتا ہے۔ اس سے رنگ میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ پینڈیاں ایک طرح کے لٹو ہوتے ہیں جو میدے کو گھی میں بھون کے اس میں کھانڈ اور میوہ ملا کر بنائے جاتے ہیں۔

”مانجھے کا زرد جوڑا، ایک رنگی ہوئی منقش چوکی اور لوٹا کٹورا
 بھی ہوتا ہے۔ لوٹا، کٹورا چوکی پر ناڑے سے کس کر باندھ دیئے جاتے
 ہیں اور باجے والوں اور جلوس میں یہ چیزیں اس ترتیب سے ہوتی ہیں
 کہ باجے والوں اور جلوس کے بعد سب سے آگے چوکی ہوتی ہے۔
 اس کے بعد خوانوں میں عام قسم کی بینڈیاں ہوتی ہیں۔ دولہن کی پھوٹی
 بہنیں اور ڈومنیاں فینس اور ڈولیوں پر سوار ہو کے جاتی ہیں جو
 دولہا کے گھر پہنچ کر ایک بینڈی اور مصری کے سات سات ٹکڑے
 کر کے وہ سب ٹکڑے دولہا کو ڈھکا ڈھکا کے کھلاتی ہیں۔ اس رسم کی
 نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے جس کو نہ عرب سے
 تعلق ہے نہ عجم سے۔ اس لئے کہ مانجھے اور اس کے ساتھ کنگنے کی ابتدا
 ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ نہیں ثابت ہوتی۔“

جس روز دلہن مانجھے مٹھتی ہے، عام طور پر اسی روز دولہا کو بھی بٹھایا جاتا ہے
 اور دولہن کا بھوٹا اہٹنا اس کے بھی ملا جاتا ہے۔ اور دولہا کی ہم عمر لڑکیاں، بہنیں وغیرہ
 آپس میں مل کر سہاگ گاتی ہیں۔

مانجھے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں (دولہا اور دولہن) کے دل ایک دوسرے
 کے خیال میں لگ جائیں اور اس طرح تصور میں اجنبیت کا فاصلہ کچھ کم ہو جائے۔ اس
 زمانے میں دولہن کے یہاں بھی خوب گانا بجانا ہوتا ہے اور ان گانوں میں دولہا
 کا ذکر بڑے جذبے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد دوسری قابل ذکر رسم ساچق ہوتی ہے۔
 ”کہتے ہیں یہ رسم ترک دمنل اپنے ساتھ ہندستان لے کر آئے تھے۔ اس میں

۱۔ گزشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔ ص ۲۵۶

۲۔ ساچق ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے مختلف ادا ہیں یعنی ساچاق، سچق، ساچق،
 لیکن ساچق زیادہ صحیح ہے۔ جدید ترکیہ میں اسی لفظ کا تلفظ ساچی اور ساچغ بھی کیا جاتا
 ہے۔ اس کا مشدود ساچاق ہے جس کے لغوی معنی کچھیرنا، پھیلانا، پھار کرنا اور تار کرنا ہیں۔

۳۔ گزشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔ ص ۲۵۷

دولہا کے یہاں سے دولہن کے لئے چڑھا دے کا جوڑا ہوتا ہے جو عموماً بہت بھاری اور کارچوبی ہوتا ہے اس کے ساتھ دولہن کے لئے سنہری بقیش کا سہرا، چاندی کا پھللا سونے کی انگوٹھی، دو ایک چیزیں اور ہوا کرتی ہیں اور وہ زیور ہوتا ہے جو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی اور پھولوں کا گہنا ہوتا ہے۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل، شکر کے قرص اور میوہ جاتا ہے۔ ساپنچ کے لئے خاص اہتمام سے منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے ہیں۔ پھر بانس اور کاغذ کے رنگارنگ تختوں میں چار چار گھڑے لگا کے چو گھڑے بنا دیے جاتے ہیں اور دولہندی اور امارت کی شان کے مناسب ان چو گھڑوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور اکثر سو سو دو سو کے شمار کو پہنچ جاتے ہیں۔

جلوس میں ان سب گھڑوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے جس میں دہی بھرا ہوتا ہے اور اس کے منہ پر بھی سوہا ناٹے سے باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے گلے میں مبارک فانی کے لئے دو ایک مچھلیاں بھی بندھی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں جب دولہن کے گھر پہنچتی ہیں تو اعزاء و اقارب میں تقسیم ہوتی ہیں۔

ساپنچ کے اگلے دن دلہن والے بڑے جلوس کے ساتھ دولہا کے لئے مندی بھیجتے ہیں۔ جو پسپی ہوئی ہوتی ہے گویا یہ ساپنچ کا بدلہ ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل سامان ہوتا ہے :-

دولہا کے لئے جوڑا جو وہ پن کر نکاح کے لئے آتا ہے۔ اس میں درباری قسم کا خلعت، شملہ، جیفہ، سرچج اور مرصع کلنی ہوتی ہے، موتیوں کا ہار، ریشمی پاجامہ، جوتا، طلائی انگوٹھی اور سونے کا سہرا۔

مندى کو طباق میں بھیجتے ہیں اور اس میں ہری اور لال موم بتیاں جلا کر رکھتے ہیں۔ مندی کے طباق کے ساتھ لمبے کے طباق ہوتے ہیں جن کی تعداد حسب حیثیت ہوتی ہے۔ مندی کے اگلے دن برات کی روانگی کا دن ہوتا ہے۔ برات بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوتی ہے۔ اس کا جلوس بڑے اہتمام سے چلتا ہے۔

لہ مچھلی اور وہ میں اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔

۳۴۲ یہ رسم عربوں سے آئی۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ :-

”برات جانے کا اگلا ضروری وقت پہر رات رہے یعنی تین بجے شب کا تھا لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے اور بجائے پہر رات رہے کے، پہروں چڑھتے یعنی نو دس بجے صبح کو براتیں جانے لگی ہیں۔ اس تاخیر کی ابتدا واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی۔ ان کی برات جانے میں اتفاقاً دیر ہو گئی اور دن نکل آیا تھا۔ لوگوں نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تحفیف کے خیال سے اسی وقت کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب عموماً ابتدائے روز میں برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہو جاتا ہے۔“

برات کا جلوس باجے گاجے کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔ — باجوں میں ڈھول، تاشے، جھانجھیں، روشن چوکی اور آرگن باجا ہوتا ہے۔

دولہا حب حیثیت گھوڑے یا ہاتھی پر جاتا ہے۔ — اس وقت دولہا کی حیثیت بادشاہ کی ہوتی ہے اور یہ جلوس شاہانہ انداز سے نکلتا ہے اس لئے اسے ”نوشہ“ کہنے لگے۔

نوشہ بنانے کی بعض خصوصیتیں مسلمانوں میں ہندوؤں سے کسی حد تک مختلف تھیں۔ مولوی عبدالحلیم شرر اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جب دولہا کو بادشاہ بناتے ہیں تو اس کے سر پر شملہ کیوں ہوتا ہے، تاج کیوں نہیں پہناتے ہیں؟ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان سر پر آڑا تاج نہیں پہنتے تھے بلکہ سب کے سروں پر کلنی دار شملے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہان اودھ کو تاج پہنا دیا مگر وطنی سوسائٹی نے اس تاج کو قبول نہیں کیا اور اپنے بادشاہوں کی وضع وہی رکھتی، جو پرانی تھی۔“

غرض اس طرح دولہا کی برات چلتی ہے۔ جب یہ برات دولہن کے یہاں پہنچتی ہے تو وہاں پہلے سے استقبال کی تیاری رہتی ہے۔ وہاں دولہن کو سات دن کے باسی پانی سے سلا کر اس کا نہانے کا پانی محفوظ رکھا جاتا تھا اور جب یہ برات پہنچتی تو یہ

۱۵ گزشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر - ۱۵۹

۱۶ گزشتہ لکھنؤ - عبدالحلیم شرر ص ۲۶

پانی دولہا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں دولہا کو زناخانے میں لے جاتے ہیں وہاں کچھ رسمیں ادا کی جاتی ہیں جو مختلف خاندانوں میں مختلف ہوتی ہیں اور بقول شرر ”یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دولہن نہا چکتی ہے مگر ابھی کپڑے نہیں پہنائے گئے ہوتے اور وہ ایک چادر میں لپیٹی ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ پر مہری رکھ کر دولہا کو کھلائی جاتی ہے جس میں سائیاں زندہ دل عورتیں اور ڈومئیاں قیدیں بڑھا بڑھا کے دولہا کے لئے ہر کام مشکل کر دیتی ہیں“ یہ طریقہ مخصوص لکھنؤی تھا۔ دلی میں دولہا نکاح سے پہلے زناخانے میں قدم نہیں رکھتا جیسا کہ مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں :-

”اب زنائی سواریاں زنان خانے میں اُترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ دولہا اور سب برائی مردانے میں چلے جاتے ہیں۔ دولہا کو صدر میں مست پر بٹھاتے ہیں۔ اس کے ہم عمر بھائی بند اس کے پہلو میں ادھر ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔“ لے

لکھنؤ میں دولہا، زناخانے سے نکل کر مردانے میں آتا ہے اور پھر مذکورہ بالا طریقے پر نکاح کے لئے بٹھایا جاتا ہے۔ جہاں وہ سر جھکائے شربایا ہوا منہ پر رومال لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کا منہ پھولوں سے آئنا چھپا ہوتا ہے کہ بمشکل تمام اس کا چہرہ نظر آتا ہے۔

ذرا سی دیر کے بعد نکاح ہوتا ہے۔ سنی اور شیعہ نکاحوں میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ شیعوں کی شادی میں دو مجتہد آتے ہیں ایک لڑکی کے وکیل بن کر اور دوسرے لڑکے کے وکیل کی حیثیت سے بیٹھتے ہیں۔ لڑکی والے مجتہد لڑکی سے شرعی اجازت حاصل کر لیتے ہیں اور پھر دونوں دولہا کے سامنے بیٹھ کے دولہا دولہن کی جانب سے قرأت و صحت خارج سے ایجاب و قبول کے صیغے ادا کرتے ہیں۔

سنیوں میں لڑکی کے قریبی عزیزوں میں کوئی شخص دو گواہوں کی شہادت پر اس کا وکیل بن جاتا ہے اور قاضی ان گواہوں پر بھر دمنہ کر کے مہر معلوم کر کے دولہا کو کلمہ شہادت میں اور جزدایمان معاملات پر اقرار کروانے کے تین بار تصدیق کر کے نکاح پڑھواتے ہیں اور ایک دعائیہ خطبہ پڑھتے ہیں اور نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس خوشی میں

سنت رسول کے طور پر چھوہارے بانٹے جاتے ہیں۔

اس کے بعد دولہا کو زناخانے میں لے جاتے ہیں جہاں پر بہت سی رسمیں ہوتی ہیں۔ دولہا کو اس کی سائیاں اور نوجوان لڑکیاں طرح طرح سے چھیڑتی اور تنگ کرتی ہیں۔ پھر دولہن کو آرسی مصحف کی رسم کے لئے لا کر بٹھایا جاتا ہے۔

اس موقع کا بیان مولوی عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں سنئے :-

”دولہن اور ڈھ پٹیٹ کے ایک غیر متحرک گھڑی کی طرح اس کے سامنے لا کر رکھ دی جاتی ہے۔ ابھی تک اسے رخصتی کا جوڑا نہیں پہنایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کی جاتی ہے کہ پہلی آمد میں دولہن کی ایک لات دولہا کے پڑ جائے۔ پھر ٹوٹنے کاٹے جاتے ہیں۔ دولہا سے بیوی کی غلامی، ذلیل ترین غلامی اور خدا جانے کیسی کیسی خدمتیں بجالانے کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جس کے لئے دولہا دولہن کے درمیان رحل پر قرآن شریف اور اس پر آئینہ رکھا جاتا ہے اور اس آئینہ میں دولہا کو دولہن کا پہلا جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولہا سورہ اخلاص پڑھ لے۔ اس جلوے میں دولہن آنکھیں بند کئے رہتی ہے۔ عورتیں دولہا سے آنکھیں کھولنے کے لئے طرح طرح کی التجائیں کرتی ہیں اور اسی سلسلے میں ہر قسم کی اطاعت و غلامی کا اس سے اقرار کر لیتی ہیں۔ بڑی مشکوں اور خوشامدوں کے بعد دولہن آنکھیں کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اسی پر رسوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔“

یہاں پر دہلی والے اور خاص قلعہ دہلی کے طور طریقے میں کچھ فرق ہوتے ہیں۔ آرسی مصحف کے وقت قلعہ میں یہ دستور تھا کہ ”ڈھوسنی نے دولہا کے کان میں بیسوا کا ٹکا ہلایا۔ سالی نے کان میں سہاگا چھوایا اور کان پکڑے کھڑی رہی۔ رٹ بھگڑ کر اپنا نیگ

لے گزشتہ لکھنؤ ۴۶۴ - ۴۶۳

۳۵ رسوم دہلی از سید احمد دہلوی ص ۱۲۴

۳۵ یہ خاص قلعہ دہلی کا دستور تھا جس سے غرض یہ ہے کہ جس طرح پاتمہ غیر کو اپنا کر لیتی ہے۔ اسی طرح اس کے نام کا ٹکا نکالنے سے دولہن دولہا کو اپنا کر لے گی۔

۳۵ سہاگہ بھی قلعہ ہی کے دستور میں ہے۔ چونکہ اس میں سہاگ کا لفظ آیا اس خیال سے کہ میاں بیوی میں سہاگ یعنی اخلاص رہے یہ ٹوکا کیا جاتا ہے۔

یا جب جا کر دولہا کا کان چھوڑا۔“

اب دولہن کو سجا بنا کر رخصت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس وقت ڈومنینا بابل یعنی رخصتی کا گیت گاتی ہیں۔ اس درمیان میں جھیز کا سامان باہر لگا دیا جاتا ہے اور رخصت سے پہلے دولہا کو سلامی دی جاتی ہے۔

اس کے بعد برات بڑے شان کے ساتھ دولہا کے گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ جب برات دولہا کے یہاں پہنچتی ہے تو مبارک سلامت کے گیتوں کے شور میں دولہن آمادی جاتی ہے اسے اندر لے جا کر بٹھایا جاتا ہے اور یہاں اس کے دامن پر دولہا شکرانے کی نماز پڑھتا ہے۔

دہلی والے دولہن کے سسرال پہنچنے پر ایک مرغایا بکرا ہلال کر کے اس کا خون دولہن کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے میں مل کر اسے دودھ سے دھو دیتے ہیں۔

جب دولہن کی رونمائی ہوتی ہے تو عزیز و قریب جی کھول کھول کر روپیہ یا زیور دیتے ہیں اور منہ کھول کھول کے اس کی صورت دیکھتے ہیں۔

اس نئے گھر میں دولہن کی پہلی رات اس کی زندگی کی سب سے اہم رات ہوتی ہے۔ دولہا دولہن علیحدہ کمرے میں سلا دیئے جاتے ہیں۔ اس رات کا نام سہاگ کی رات یا تخت کی رات ہوتا ہے۔

اگلے دن دولہن کے بھائی مٹھائی لے کر بہن کو لینے آتے ہیں اور پھر دولہن اپنے سیکے دولہا کے ساتھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ سات قسم کی ترکاریاں اور سات قسم کی مٹھائیاں ہوتی ہیں۔

اسی رات کو دولہن کے گھر میں چوتھی کھلی جاتی ہے۔ دولہن کو وہ برہ کا جوڑا اتار کے چڑھا دے گا جوڑا پہنایا جاتا ہے جو سب جوڑوں سے زیادہ بھاری اور نہایت ہی پر تکلف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پہننا کے اس کا خوب بناؤ چناؤ کیا جاتا ہے دولہا کی طرف سے اس کی بہنیں اور رشتہ دار عورتیں بھی آ جاتی ہیں اور اس مجمع میں دولہا دولہن مٹھائی سے اور دولہا کی ساتھ دایاں اور دولہن دایاں ترکاریوں اور پھولوں کی چھڑیوں سے باہم لڑتی ہیں یعنی مٹھائی اور ترکاریاں ایک دوسرے کے

کھینچ کھینچ مارتی اور چھڑائیوں کے ہاتھ رسید کرتی ہیں کبھی دلگی دلگی میں لڑائی تیز ہو جاتی ہے اور بعض عورتیں خفیف سی چوٹ بھی کھا جاتی ہیں۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دولہا دولہن کے گھر میں آتا ہے اور اس کے بعد بالعموم چار چائے ہوا کرتے ہیں۔ چائے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دولہن اپنی سسرال سے بلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بلانا خود اس کے میکے میں نہیں، بلکہ میکے والیوں میں ہوتا ہے یعنی اس کی خالائیں بھوپھیاں مومائیاں ہمت کر کے باری باری اسے اپنے یہاں بلاتی ہیں جہاں وہ مع دولہا کے جاتی ہے اور اس نئے جوڑے کے رکھ رکھاؤ کے لئے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے فقط ایک رات دن دولہا دولہن مہمان رہتے ہیں اور رخصت کرتے وقت انھیں جوڑا سلام کرائی اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و استطاعت دیئے جاتے ہیں۔“

ہنرمندوں اور فن کاروں کا تذکرہ جن کا ذکر بیان لکھنؤ میں ہے

حافظ ابراہیم

حافظ ابراہیم نام، حافظ نور اللہ کے بیٹے اور شاگرد رشید تھے۔ حافظ ابراہیم
عہد آصفی سے عہد نصیری تک زندہ رہے۔ نستعلیق لکھنے میں لاجواب تھے "انھوں نے
خط نستعلیق کے دائروں میں ترمیم بھی کی ہے یعنی بیضوی دائروں کو کچھ گول کر کے
آفتابی دوائر کے قریب پہنچا دیا مگر آفتابی نہیں ہونے دیا۔ یہ ترمیم عام طور پر بہت پسند
کی گئی اور بیشتر خوشنویان عصر نے اس کا اتباع کیا۔ ان کے شاگردوں میں منشی ہادی علی
باکمال خوش نویس گزرے ہیں۔"

حافظ ابراہیم نے محنت کشی کا مشہور مرثیہ بڑے اہتمام سے لکھ کر آغا میر دزیر اعظم
کی خدمت میں نذر کیا تھا جو خطاطی کا ایک اعلیٰ درجے کا نمونہ ہے۔ حافظ ابراہیم صاحب
کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ حافظ نور اللہ نے نواب مین الدولہ کی فرمائش سے
۱۰ گزشتہ لکھنؤ۔ بحوالہ صحیفہ خوشنویان مصنف احترام الدین شاعلی ص ۷۶

ایک گلستاں لکھی تھی جس کا ایک باب لکھنے سے رہ گیا تھا کہ حافظ نور اللہ کا انتقال ہو گیا۔
نواب یمن الدولہ نے یہ باب اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم کو لکھنے کے لئے دیا۔ انہوں نے
اپنے باپ کے شانِ خط میں لکھ کر ایسا ملا دیا کہ بڑے بڑے ماہرین نہ پہچان سکے۔

سید میر علی

سید میر علی سڑی حیدری خاں کے سوز خوانی میں شاگرد تھے اور انہوں نے
سوز خوانی کو بہت ترقی دی۔ یہ اپنے گھر ہی میں مجلس پڑھتے تھے۔ نواب یمن الدولہ
متوفی ۱۲۲۹ھ نے ان کے شہرہ کمال سے مشتاق ہو کر ان کو طلب کیا انہوں نے
جانے سے انکار کیا اور لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اس واقعہ کا ذکر محمد حسین آزاد
اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:-

”نواب نے ان کے شہرہ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا، انہوں نے انکار کیا
اور کئی بار پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکمِ وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے
اعتبار سے شہزادہ ہوں۔“ نواب نے کہا کہ سید میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ
ہیں۔ میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کہ سید تھے اب ڈوم بھی ہو گئے، اب انھیں
اختیار ہے۔ میر علی نے یہ سن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ یثرب
جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی
صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی اُن کے شاگرد ہیں وہ بھی
استاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو یہ معلوم ہوا۔ اسی
وقت کمر باندھ کر پیچھے۔ سعادت علی خاں نے متحیر ہو کر پوچھا کہ ”خیر باشد پھر کیوں آئے؟“
انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ۵

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا یارب بنا بنی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا ”حضور! غلام اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دلہا
کی دولہن (عروسِ سلطنت) کو ذرا دیکھوں۔ حضور واقعی کہ بارہ ابھرن اور سولہ سنگار سے
سجی تھی۔ سر پر جھومر۔ وہ کون۔ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جھمکے، وہ کون؟

دونوں صاحبزادے۔ گلے میں نو لکھا ہار، وہ کون؟ خان علامہ۔ غرض اس طرح چند زیوروں کے نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں، دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا؟۔۔۔ نواب نے پوچھا ”پھر وہ کون؟“۔
 کہا حضور نتھ! میر علی صاحب! بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دور اندیشیاں بے جا ہیں۔ میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے لئے ترقی کا پردانہ اور ۵۰۰ روپیہ کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔

رنگ نے اس کی تاریخ کسی علی میر علی مرثیہ خواں حیف دے (۱۸۴۱ء)

میرک جان

میرک جان شنادری میں کامل تھے۔ مہاراجہ درگیجے کے استاد تھے۔ میرک جان خواجہ باقی کے شاگرد تھے۔ شاہ دوم اودھ (نصیر الدین حیدر) کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔ آپ کے استاد میر احمد علی صاحب عن میر مچھلی تھے۔ میر مچھلی اس زمانے میں پیراکی کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور شاہ اودھ (نصیر الدین حیدر) بھی ان کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے میرک جان کو اپنے استاد سے مقابلہ کا حکم دے دیا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر میرک جان نے میر مچھلی کو زیر کر کے انھیں اپنے پیروں میں باندھ لیا۔ بادشاہ اپنے دوست بھرے میں سوار تھے۔ دریا کے کنارے دونوں استاد فن میرک جان اور میر مچھلی اور ان کے شاگردوں کا ہجوم تھا۔ بادشاہ نے بھرے کے اندر سے جو نہایت تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا روپوں کا ایک توڑا ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور میرک جان اور میر مچھلی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ”جو ہمارے بھرے کو پیر کر پکڑ لے، اُسے یہ توڑا دیدیا جائیگا“۔ چنانچہ میرک جان نے انتہائی سرعت رفتار کے ساتھ پیر کر بھرے کو پکڑ لیا اور موعودہ انعام حاصل کیا (اکبری یعنی رسالہ پیراکی ص ۲۵)

میر علی (خوشنویس)

اس نام کے دو خوشنویس ہیں (۱) میر علی نقی (۲) علی نقی امامی جو ۱۱۱۹ھ میں زندہ

تھے۔ میر علی نقی کا حال مندرجہ ذیل ہے :-

”میر غلام علی کے برادر زادے اور شاگرد تھے کثرت مشق و ذہانت سے خط میں وہ شان پیدا کر لی تھی کہ استاد کے خط سے اپنا خط بڑھا دیا تھا۔ نستعلیق اور شکستہ دونوں خط پاکیزہ تھے مگر شکستہ کو نستعلیق پر فوقیت حاصل تھی اور اس کی طرز میں انھوں نے کچھ ایجادات بھی کی تھیں۔“

آغا (خوشنویس)

آغا مرزا نام، دہلی وطن، کرمنی النسل تھے اور میر سنجہ کش کے شاگرد رشید تھے۔ پچھن سنگھ بقال خوشنویس شفیعہ انھیں کا شاگرد تھا۔ نستعلیق میں منشی رحیم اللہ، میر مدد علی الوری جیسے استاد ان کے شاگرد تھے۔ دہلی سے قبل از غدر اور آگے تھے مہاراجہ بنے سنگھ دالی اور نے ان سے گلستان لکھوائی جو پندرہ سال میں مکمل ہوئی۔ یہ نسخہ بخط نستعلیق اور مصور ہے۔ اس پر سو لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ آغا نے ۱۷۷۴ھ/۵۸-۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ ”آغا مرگیا“ مادہ تاریخ ہے۔

حیدر علی خاں اور چھو خاں

یہ دونوں بھائی بھائی تھے۔ ان کا نام دھریہ اور خیال کے گانے کے سلسلے میں مشہور ہے۔ ”پری خانہ“ میں مذکور ہے کہ ایک بھوٹا سامکان فن موسیقی کی تعلیم کے لئے واجد علی شاہ نے مخصوص کر دیا تھا۔ جس کی آرائش و زیبائش میں تکلف سے کام لیا گیا اور اس خانہ رشک ارم کو پری خانہ کا نام دیا گیا۔ پری خانہ میں گویے موجود رہتے تھے۔ چھو خاں بھی دو تین پہر تک موجود رہتے۔

شوری

پتہ گانے میں بے مثل تھے۔

بخشواورسلاری

یہ دونوں نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے انھوں نے ایسا طبلہ بجایا کہ پکھاوج کا دم بند کر دیا۔ اور ان دونوں کے مقابلے میں کسی کو طبلہ چھونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

غلام رسول

نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں قوال تھے اور اس فن میں استاد کامل کا درجہ رکھتے تھے۔

مکاخیاط

مکاخیاط نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرا ہے۔ اس کے بارے میں خود رجب علی بیگ سرور "فسانہ عبرت" میں لکھتے ہیں کہ :-
"مکاخیاط کی قطع سب سے نرالی رہی، ہر دم عیش و عشرت لا ابالی رہی۔ ہزار روپیہ روز گرمی کی پوشاک کے مقرر تھے۔ صبح نواب کی خدمت میں آیا۔ صورت دیکھ کے توڑا منگانا اور جاڑے کی پوشاک کے سوا لاکھ ملا کئے۔ اس نے کئی لاکھ روپے کی عمارت اپنی دیران بستی میں بنائی اور لکھنؤ میں گنج، سرا، مسجد، تعمیر کی۔

خیراتی اور چھنگا

نصیرالدین حیدر کے عہد میں یکتائے روزگار تینگ ساز تھے۔

مروان بیگ

نصیرالدین حیدر کے عہد میں مانجھا بنانے یا سوتنے کے استاد تھے۔

مولوی عمدو (کنکوا باز)

نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں۔ ستر بچہ پتر تار ڈور پر لمڈورا لڑاتے تھے۔
مولوی عمدو بہت منحنی اور دُبیلے پتلے تھے۔

بیر علی لکھنوی

نصیر الدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں۔ خورد نوک کا گتھیللا جوتا اس نوک بھونک کا بناتے تھے کہ دنیا میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس قدر پر تکلف بناتے تھے کہ دھنیا مہری افضل النساء خاتم نے پانچ اشرفیوں پر سجوایا۔

خیر اللہ

نصیر الدین حیدر کے عہد میں خصوصیت سے ادراک کا لچھا کاٹنے کے استاد تھے۔

حسینی

عہد نصیر الدین حیدر میں حلوہ سوہن پیٹری حبشی دودھیا کا مشہور قناد تھے۔

نورا

نصیر الدین حیدر کے عہد میں مثل بلور کے صاف بالائی بناتا تھا اور نہایت شیریں۔

ملا احمد انوار الحق فرنگی محلی

ملا احمد انوار الحق ابن ملا احمد عبد الحق ابن ملا محمد سعید بن ملا قطب الدین سہالوی۔ آپ شہر لکھنؤ میں ۱۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے آپ نے شریعت اور طریقت دونوں کی تعلیم حاصل کی۔ صاحب کرامات اور مکاشفات ہوئے۔ آپ کی بہت شہرت ہوئی۔ آپ نے درسی کتابیں مولوی احمد حسین اور ملا محمد حسن سے پڑھیں، علوم ظاہری کی تکمیل مولوی عبد العلی بحر العلوم کی خدمت میں کی۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے والد سے بیعت ہوئے۔ ان کی طبیعت معقولات کی طرف راغب نہ تھی۔ کتب منقولات کی طرف البتہ توجہ کرتے تھے۔ غرض اپنے اوقات عزیز عبادت الہی میں بسر کرتے تھے، ایک سانس بھی ذکر و شغل کے بغیر نہیں گزارتے تھے۔ آپ نے ۲۶ شعبان ۱۲۳۶ھ / ۲۱ اگست ۱۸۲۱ء بروز منگل ایک پھر دن باقی تھا کہ ان کی روح مبارک حجرہ قالب سے نکل کر رفیق اعلیٰ سے جا ملی۔ اپنے باغ واقع لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ کسی شاعر نے ان کے انتقال کا مادہ تاریخ اس مصرع سے نکالا ہے۔ رحمۃ حق بر روح انور باد۔

مولوی ظہور اللہ فرنگی محلی

مولوی ظہور اللہ ابن مولوی محمد دلی بن مفتی غلام مصطفیٰ ۱۱۷۴ھ / ۶۱-۶۱۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد اور اپنے تایا ملا حسن سے تحصیل علم کی۔ آپ کے بہت کثرت سے شاگرد تھے۔ اہل محلہ میں سے بھی بہت سے شاگرد ہوئے۔ آپ کو اپنے معاصرین میں

باعتبار فقہ دانی اور اصول کے امتیاز حاصل تھی اسی وجہ سے لکھنؤ کی عدالت میں مفتی مقرر ہوئے۔ صاحب تذکرہ فرنگی نے ارباب فرنگی محل کے علاوہ ان کے تلامذہ میں اکسٹھ سیردنی علمائے کرام کے نام لکھے ہیں۔

مولوی محمد مبین لکھنوی

مولوی محمد مبین لکھنوی بن ملا محب اللہ بن ملا عبدالحق بن محمد سعید بن ملا قطب الدین شہید ملا حسن، شارح سلم العلوم کے شاگرد رشید تھے علوم عقلی و نقلی کے عالم، رموز حقی و جلی سے واقف اور جوہر ذہن و ذکاوت و طلاقت میں مشہور تھے۔ ان کی تصنیفات میں شرح سلم، شرح مسلم البشوت، حاشیہ میرزا اہد ملا جلال، حاشیہ میرزا اہد شرح مواقف، وسیلۃ النجاة، حالات اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترجمہ حکایات الصالحین، شرح اسماء وحسی، شرح تبصرہ (تصوف) زبدۃ الفوائد، (بیان سحر رمضان) کنز الحنات فی اتیاء الزکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ ۲۲۔ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کا مادہ تاریخ مصرعہ ”ماہ برج علوم نہاں گشت“ ہے۔

مولوی سید عبد الرحمن لکھنوی

مولوی سید عبد الرحمن صوفی عالم تھے چشتیہ سلسلہ میں بیعت و خلافت سے سرفراز تھے۔ کوٹ مخدوم عبدالحکیم تعلقہ مبارکپور شکاپور سندھ کے رہنے والے تھے لکھنؤ کی مسجد نیڈائن میں رہتے تھے۔ انیس سال کی عمر تک اپنے والد سے تحصیل علم کی۔ چار سال تک متوسطات کی تعلیم مولوی محمد فاضل سے خیرپور میں حاصل کی، اس کے بعد قصبہ مہاروں میں مولوی اسد اللہ مرحوم سے تحصیل علم کی پھر دہلی پہنچے اور وہاں سے رام پور آئے، وہاں کچھ بڑھا پھر رام پور سے مولوی بحر العلوم عبدالحی لکھنوی کی خدمت میں ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں ایک سال قیام کر کے تمام علوم کی تکمیل کی۔ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں حج ادا کیا۔ ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء میں لکھنؤ پہنچے۔ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں انتقال ہوا۔ وہ عالم، سادات کے خادم، قانع متوکل اور عزت نشین (صوفی عالم) تھے۔ رسالہ کلمۃ الحق اور سرۃ الانسان، توحید کے بیان میں ان کی تصنیفات میں سرود و غنا کی طرف بہت رغبت تھی۔

سیر محمد شاہ

نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ گومتی کے کنارے آصفی امام ہارے کے نزدیک

شاہ پیر محمد کا ٹیلہ واقع ہے جہاں عالمگیر کی بنوائی ہوئی مسجد بھی ہے جو عرف عام میں ٹیلیہ والی مسجد کہلاتی ہے۔
خواجہ حسین و حسن

مردودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کا مزار درگاہ عباس کے قریب ہے۔

قدسیہ محل

قوم کی ترک، وفابیک خاں کی نو اسی تھی۔ وفابیک کی لڑکی اسی خاندان کے ایک شخص امان اللہ بیک کو منسوب تھی۔ اس سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی بسم اللہ خانم، چھوٹی نازک ادا۔ بسم اللہ خانم کے دو لڑکے ہوئے۔ بسم اللہ خانم نے پہلے بادشاہ خانم کے یہاں ملازمت کر لی پھر تاج محل اور نواب ملکہ زمانہ کی خدمت میں رہیں، بادشاہ کا میلان دیکھ کر منتظم الدولہ نے ایسا انتظام کیا کہ بسم اللہ خانم کا شوہران کو طلاق دے کر کانپور بھاگ گیا۔ بادشاہ نے میعادِ عدت میں ہی ۱۷۰۱-۱۸۲۱ء کو عقد کر کے محدثہ زمانہ مہدی عظمیٰ بختیاری ملکہ آفاق قدسیہ سلطان مریم بانو بیگم کا خطاب دیا۔ مرزا حسین بیک جو سواروں میں نوکر تھے قدسیہ محل کے باپ مشہور ہوئے۔ نواب مظفر الدولہ خطاب پایا۔
 قدسیہ بیگم کی سخاوت نزدیک و دور مشہور ہو گئی۔
 خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی لکھتے ہیں :-

”ایک مرتبہ بادشاہ نے قدسیہ بیگم کو ایک کروڑ روپیہ دیا۔ انھوں نے مشائخوں، آزادوں، مجذوبوں اور صوفیان باصفا کو خوب دھوم دھام سے مدعو کیا۔ چودہ دن میں ایک کروڑ روپیہ خرچ کر ڈالا۔“

شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں :-

”جاڑھے کے موسم میں لاکھ سو لاکھ روپے مہینے کی رضائیاں بنتی تھیں گرمیوں میں ان کی ہوا نظر نہ آتی تھی کہ کدھر اڑ گئیں۔
 قدسیہ محل نے کہا : ”اشرفیوں کا ڈھیر نہیں دیکھا محل میں فوراً انبار ہو گیا۔
 بادشاہ نے کہا اگر لطف دیکھنا چاہو تو لٹا دو اور وہ سب لٹا دی گئیں۔“

ایک روز ایک نو شاہ اپنی نو عروس کو رخصت کرائے لئے جاتا تھا۔ رات دوت سرائے سلطانی کے پاس سے ہو کر گزری جس میں روشن چوکی اور دوسرے باجے بج رہے تھے۔

مگر دلہن کے ساتھ جہیز کا سامان نہ تھا۔ بیگم نے باجے کی آواز سن کر دریافت کیا۔ ”یہ باجا کیسا بج رہا ہے؟“ معلوم ہوا دولہا، اپنی دولہن کو رخصت کرانے لے جاتا ہے۔ حکم ہوا دولہن کو ابھی حاضر کرو۔ چوبدار و ملازمین شاہی دوڑے گئے اور دولہن کی پینس ڈیوڑھی میں لے آئے وہاں سے خادمائیں دولہن کو گود میں اٹھا کر بیگم کے روبرو لے گئیں۔ بیگم نے دولہن کا منہ دیکھا۔ صورت شکل پسند آئی اور فوراً اپنے زیورات کا صندوق منگا کر دولہن کو جڑاؤ زیوروں سے لاد دیا اور محل کی خادماؤں کو حکم دیا۔ ”خبردار بے رونمائی دیئے کوئی دولہن کا منہ نہ دیکھے۔ محل میں کئی سو عورتیں ملازم تھیں سبھوں نے حسب حیثیت کوئی نہ کوئی چیز سونے یا چاندی کی دے کر دولہن کا منہ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آن کی آن میں زیورات کا ایک انبار لگ گیا۔ اس کے بعد دولہن رخصت کر دی گئی اور وہ سب زیورات بھی اس کے ساتھ کر دیئے گئے۔ بیگم کی ایک ادنیٰ نظر عنایت سے تھوڑی ہی دیر میں دولہن مالا مال ہو گئی۔

قدسیہ محل کی موت کا ذکر شیخ تصدق حسین صاحب مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے تھے۔

”بادشاہ اس قدر الفت و محبت کے بادشاہ اور قدسیہ محل میں بعض اوقات شکر ربی بھی ہو جاتا تھی مگر ۲۱ اگست ۱۸۳۲ء کو بقول سلیمان بادشاہ پر ایسا غصہ سوار ہوا کہ وہ جامہ ہی سے باہر ہو گئے اور اسی حالت میں فرط غیظ سے فرمایا کہ میں نے تجھ کو خاک سے پاک کیا اور ادنیٰ حالت سے ملکہ کے رتبے کو پہنچا دیا۔ مگر اب انشاء اللہ پھر انھیں دھارڈوں کو پہنچا دوں گا۔ قدسیہ محل کی طبع نازک اس تلخ کلامی کے بارگراں کی متحمل نہ ہو سکی اور اپنے نقشِ حیات کو مٹانے کی غرض سے سنکھیا کھالی۔ زہر اپنا کام کر گیا۔ بادشاہ بہت متاسف ہوئے اور ہر قسم کا علاج معالجہ بھی کیا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پہلے تو وہ اُن کے کرب و بھینی کو ملاحظہ کرتے رہے مگر جب دم بھوں پر آگیا اور جان بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو بدحواس

لے سفر نامہ سلیمان صاحب ریزیڈنٹ اودھ بربان انگریزی بحوالہ
بیگمات اودھ ۱۵۴۔

ہو کے گھوڑ دوڑ کے میدان والی چکر والی کوٹھی کی عمارت میں چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم کو یہ فکر دامگیر تھی کہ وارث تاج و تخت انھیں کے بطن کا ہو اسی دُھن میں انھوں نے اپنے پہلے شوہر کو جس نے طلاق دی تھی زانی پوشاک پہنوا کر کئی بار محل میں بلوایا تھا جس کی اطلاع بادشاہ کو ہو گئی تھی اور یہی واقعہ اس قضیہ کا اصلی سبب تھا۔“

مولوی خیر اللہ

فرنگی محل کے مشہور علما میں شمار ہوتے تھے۔ مولوی انوار الحق ^{رحمۃ اللہ علیہ} (جن کا باغ لکھنؤ میں مشہور ہے) آپ کے دادا تھے۔ مولوی خیر اللہ لا ولد تھے۔ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں انتقال کیا۔

فرہنگ فسانہ عجائب

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. _____ Book No. _____

Acc. No. _____

This book may be kept for 14 days. An over - due charge will be levied at the rate of 10 Paise for each day the book is kept over - time.

[illegible]

(۱)

آب پاشی - پانی چھڑکنا - چھڑکاؤ -	اخفا - پوشیدہ رکھنا - چھپانا
آبداری - خوبی - چمک	انگھر - انگارہ
ابلق - گھوڑا پت کبرا جسکے ہاتھ پاؤں سفید ہوں	انوان الشیطن شیطان کے بھائی بند خراب لوگ
ابنائے روزگار - زمانے کے بیٹے دنیا والے	آخوند - استاد
آبی - خود ہی - آپ ہی -	ادراک - سمجھ - شعور
آتش بار - آگ برسانے والی -	آدم - ابوالبشر جناب آدم علیہ السلام
آتوجی - استانی -	ادھی - آدھا پیسہ - ایک بار یک کپڑا -
اتھک - نہ تھکنے والا -	ادھم - کالا گھوڑا
اجابت - قبولیت -	ادھیڑ بن - فکر، کسی کام کو کر ڈالنے کی کوشش
اجل رسیدہ - موت کو پہنچا ہوا - قریب الموت	ادوائے - جوگیوں کا سامان
کوئے کے معنی میں بھی مستعمل ہے -	اذفر - تیز بو
اچنبھا - حیرت	آرام پائی - عمدہ جوتے جو مرد اور عورت دونوں
اچھال چھکا - ادب باش عورت	پہن سکیں، تحفہ
احتمال - اندیشہ، ڈر، شک	اربعین - چہلم، چالیسواں
احسن - سب سے زیادہ نیک - بہت اچھا -	ارادت - عقیدت، اعتقاد
احمق الذی - بیوقوف	آرہی مصحف - شادی کی ایک رسم جس میں
احیاناً - کبھی کبھی - گاہے گاہے - اتفاقاً	دولہا دلہن کو پلنگ پر بٹھا کر
آخر شماری - تارے گفنا	ادراں پورا ایک کپڑا ڈال کر پیلے
اختلاط - میل جول - ربط	قرآن مجید کھول کر رکھتے ہیں تاکہ
آخر الامر - آخر کار	دونوں سورہ اخلاص کی تلاوت

اسد اللہ الغالب اللہ کا زبردست شیرینی
امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ

اسرار - بھید (جمع سر کی)

اسفل السافلیں - سب سے نیچے کا حصہ، جہنم کا
سب سے نیچے کا طبقہ

اسمائے الہی - خدا کے نام

اسم ذات - ذات کا نام یعنی اللہ

اشتر المخلوقات - پیدا کی ہوئی چیزوں میں سب سے
زیادہ پاک، سب سے بہتر مخلوق

اشہب - سبز گھوڑا

اصحاب فیل - ہاتھی والے - یہ لوگ کعبہ ڈھانے

آئے تھے ان کا واقعہ قرآن پاک

کی سورہ فیل میں مذکور ہے

اصیلوں - جمع ہے اصل کی بمعنی زن طباطبائی
خدمت گزار

اعجاز نما - معجزہ دکھانے والا

آغشتہ - اٹا ہوا

انماض - چشم پوشی، درگزر کرنا،

پرہیز کرنا، گریز کرنا

اقتاں و خیراں - گرتا پڑتا

افتر پردازی - الزام و اتہام دھرنے

افعی - چھوٹا سانپ مگر بہت زہریلا۔

ناگ سیاہ رنگ کا

افکار - زخمی، چھدا ہوا

کریں پھر آئینہ در میان میں رکھ کر
دونوں کو ایک دوسرے کی صورت
دکھاتے ہیں۔

ارجل - گھوڑے کا ایک عیب ہے جس کا
ایک پچھلا پاؤں سفید ہو

اروئے معلیٰ - شکر شاہی

ارکبہ - ایک خوشبو کا نام جو صندل،

گلاب، کافور، مشک، عنبر اور
چنبیلی کے تیل سے مرکب کی جاتی ہے۔

ارجم - جنت

اریکہ نشیں - تخت پر بیٹھنے والا

آزر - حضرت ابراہیم کے چچا کا نام جو

اپنے زمانے کے مشہور بت تراش

تھے بقول بعض حضرت ابراہیم کے
والد کا نام۔

ازلی - ہمیشہ کا، شروع سے

ازدہام - بھیڑ

اساس - جڑ - بنیاد

استراحت - آرام

استعجاب - تعجب

استغنا - ایری، بے نیازی

استغفر اللہ - میں اللہ سے بخشش چاہتا

ہوں، میں توبہ کرتا ہوں

استفسار - دریافت کرنا، پوچھنا

اک تارا - ایک قسم کا ساز ہے کہ اسے ہندو
فقیر اکثر بجاتے ہیں - یہ ایک قسم کا
کپڑا بھی -

اک پیچھے - ایک قسم کی پگڑی
اکتفا - کفایت کرنا - کافی ہونا -

اکل و شرب - کھانا پینا

اکمل - سب سے کامل

اکید - سخت

الّا - بجز، سوا

البلے - بے پردا

التفات - توجہ

الہاب قلب - گھبرانا، اختلاج

القیام - سنبھل ہونا، (زخم کا) بھرنے

الحق مرء - سچی بات کہہ دی ہوتی ہے

الطہ - شخص نا بھرپور کار، سادہ

الطہ پنے کے دن - بے فکری اور بے پردائی کا زمانہ

اکش - جھوٹا کھانا

القلیل کا معدوم - کیا بشل معدوم کے ہے

الماس - ہیرا

المست - مت، جوانی کے نشہ میں چور

آلے پڑے ہیں - زخم ہرے ہو گئے ہیں

امرتی مسلسل میٹھائی - جلیبی کی قسم کی پیچیدہ ہوتی ہے

امند آنا - بھڑانا

امرایت - ریاست - امارت

امرد - بے وارٹھی ہو پنچھ کا لڑکا

انّا - دودھ پلانے والی

انبسار - ڈھیر

انبساط - خوشی

انبوہ - بھیر

انٹی ماری - زبردستی، خواہ مخواہ

اندام - جسم

اندر - (راجا) ہندو دیوالائیں دیوتاؤں

کا بادشاہ ہے - اس کے دربار

میں بہت سی پریاں موجود رہتی تھیں

اندوہ - غم

اندوہ گیس - غم گیس

انس - محبت

انشا کروں - لکھوں

انیس - ساتھ بیٹھنے والیاں

او بھی - وہ بھی

اوچھ - امرا کے سونے کے پلنگ کی

آر آتش کی ایک چیز کا نام ہے -

یہ پلنگ کے برابر ایک سفید

چادر ہوتی ہے اور اس کے

چاروں طرف ایک رنگین کپڑا اس

طور پر سلا ہوتا ہے کہ اس کے پھیلائے

سے پلنگ کے پائے نہیں چھپتے -

اس رنگین کپڑے پر کلاہتوں کے

نقش و نگار بنے ہوتے ہیں جب

اسے پلنگ پر پھیلا کر اس کے اوپر

لوشک اور چادر پھیلاتے ہیں

تو وہ نقش کپڑا چاروں طرف سے

پلنگ کے چاروں پایوں کے درمیان

فرش کے قریب لٹکتا رہتا ہے۔

اوگی - کار چوبی کے کام کا سلیم شاہی جو تا

اہمتر از - حرکت میں آتا

ایذا - تکلیف

ایضا - پورا کرنا۔ نباشا

ایہا الناس - (عربی) اے لوگو

آیہ وافی ہدایہ - آیت جو ہدایت کیلئے کافی ہے

ب

باب - دروازہ

بابل - نام شہر، کوفے کے نزدیک، بعض

لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہر

عراق میں تھا اور وہاں ایک

کنواں ہے جہاں ہاروت دماروت

نام کے دو فرشتے قید ہیں

بار - دیر، موقع، رسائی

باشی - جمع باشد کی۔ یہ ایک شکاری پرندہ ہے

بال بھوری صاف - ان عیوب سے جو گھوڑوں میں

پائے جاتے ہیں معرّ

بالک - بچہ

بالک ہٹ - بچہ کی ضد

با خود - اپنے آپ سے

بادلے - چاندی سونے کے تار سے تباہ ہوا کپڑا

بادیہ پیمانی - جنگل ناپنا۔

بادیہ گردی - جنگل میں گھومنا

بار نہ پائے - آنے نہ پائے

باریدار - چنور ہلانے والی جیپ کرنے والی

باغ ارم - ارم نام ہے شہر عناد کا۔ کچھ لوگ

اسے بہشت شہاد کہتے ہیں اور

کچھ اسے آٹھواں بہشت مانتے ہیں

بالہ - خدا کی قسم

بالجوی - پانی کا بڑا برتن

بالر اس والین - بسرو چشم

بالش - تکیہ

بالفعل - اس وقت

بالمشافہ - دودھ - آمنے سامنے۔

بانانا - وہ چیز جو مردان دلاور پاؤں

میں پہنتے ہیں۔ برق سے

کشتان سے آتا ہے بانکوں میں لگانا

اک پاؤں میں بانا اک پاؤں میں بانا

بانانا باندھنا - بیکٹائی کا دعویٰ کرنا

بانے - اسلمہ

باہر بندو - پردہ لسی

بال ہما - ہما کے بارو یا پنکھ ہما کی

خاصیت کے بارے میں روایت
بیان کی جاتی ہے کہ جس کے سر پر
بیٹھ جائے وہ بادشاہ ہو جائے۔

بالیں - تکیہ، سرہانا

باہم - ساتھ ساتھ

بائی بچی - ہوا جاتی رہی

بحرے - کشتی

بچن - باتیں

بحدے کہ - اس حد تک کہ، یہاں تک کہ

بحر زخار - بھاری سمندر، موجیں مارتا ہوا

سمندر، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

مشتق ہے زخار سے جس کے معنی ہیں

دریا کا لبالب ہونا پانی سے۔

بختی - ایک قسم کا قوی، بڑا اور سرخ

رنگ کا ادنٹ، جس کو خراسان

سے لاتے ہیں۔ اس کو بخت نصر

سے منسوب کرتے ہیں جس نے

عربی ادنیٰ اور عجمی ادنٹ سے

بچایا اس بچے کو شتر بختی کہا گیا

تھا۔ عام طور پر سانپ ٹی بھی کہتے ہیں۔

(بخت نصر - نام ایک بادشاہ۔

کافر کا بخت بمعنی پسر اور نصر نام

بت کا۔ چونکہ اس کو حالت طفلی

میں اس بت کے آگے پڑا پایا تھا

اور اس کے باپ کا نام معلوم نہ

تھا اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا)

بخشنده - بخشنے والا

بد رچی - بے محبتی

بد قوارے - بد شکل، بد قطع

بدنا - شرط لگانا

بدی مکتی - جو بات مقدر میں لکھی تھی

بذلہ سنج - نکتہ سنج، باریکیاں سمجھنے والا، لطیفہ گو

بمہ - جسم

برادہ الماس - زہر

برانا - سونے میں پولنا

براق - سواری جس پر مسلمانوں کے

عقیدے کے مطابق رسول اکرم

شب معراج میں سوار ہوئے تھے۔

بہت سفید رنگ

برایا - مخلوق

برجھک - برج عقرب

برخاستہ خاطر - پریشان خاطر

برسم یلغار - دھادے کے طریقے سے

برشتہ - بھٹا ہوا

برگزیہ - بزرگ اور بہتر

برن - شکل، بھیس

برنا - جوان

برودت - سردی

بروگی - مہجور

بز دلا - ڈرپوک

لسان - طرح

بست دربت - میں حصہ لمبائی میں اور میں ہی

حصہ چوڑائی میں = ۲۰ × ۲۰

بشر - انسان

بطمے - شراب کی بوتل، بط کی شکل کی

بعد - دوری

بعید - دور

بقراط - یونان کے ایک فلسفی کا نام جو طبیب

بھی تھا

بگٹٹ - گھوڑے کو اس طرح دوڑانا گویا

لگام نہیں ہے

بگٹٹ پھیکے گیا - بہت تیز دوڑائے گیا

بگڑا - مغرور ہوا

بل - بلکہ

بلبل شیراز - شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

کا لقب ہے

بلطائف الحیل - عمدہ پیرائے میں

بلی - زوردار، طاقتور

بلیا لوں - صدقے جاؤں

بمجرد - فوراً

بنارس کی سحر - بنارس میں صبح کے وقت گنگا

پر اشنان کرنے والوں کی بھیر

رہتی ہے - اس لئے یہ منظر بہت

دلکش ہوتا ہے

بنا گوش - کان کی لو

بند بند - جوڑ جوڑ

بند ہوئی - خاموش ہوئی، گفتگو میں قائل

ہو کر خاموش ہو جاتا

بنے - مصنوعی

بنی اسرائیل - حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد

بنیاں - بنیاد والا

بودار - وہ کتے جو بو، سونگھ کر شکار تلاش

کر لیتے ہیں

بوریا - چٹائی، ٹماٹ

بوسیدہ - پرانی، سڑی گئی

بو قلموں - رنگ بہ رنگ، طرح طرح

بوم - آواز

بولی کھولی - مذاق ہی مذاق میں سخن طعن و تشنیع

بھپاس - ایک راگنی کا نام ہے

بھٹکے - راستہ بھولا

بھجنگ - سیاہ چیز، بہت کالے آدمی کو

بھی کہتے ہیں

بھجنگے - ایک سیاہ رنگ کا پرندہ، مجازاً

کالے آدمی کو کہتے ہیں

بھر بھرا - خستہ

بھر بھرا نا - محبت کے قصد سے کسی کی طرف

مائل ہونا

بھڑکے - پاس

بہزاد - ایک نقاش کا نام جو عہد شاہ

اسمعیل صفوی میں نقاشی کرتا تھا

اور اس فن میں اسے کمال
حاصل تھا۔

بھٹارا - لنگر - ہندوؤں کا ہندو
فقیروں کو کھانا کھلانا۔

لکڑی چلانے والوں کے نزدیک
وہ ضرب جو حریف کے شکم کے
بائیں طرف لگے

بھوانی - ایک دیوی کا نام

بھیر - بھیر

بھیر بنگاہ - بازاریاں لشکر

بھیروں یا بھیرویں - ایک راگ کا نام ہے۔

بھیروں ناچنا - دگرگوں ہونا

بیت ابرو - بھوؤں کا شعر (یہ اس لئے کہا

گیا ہے کہ دونوں آنکھوں کی

بھوئیں شعر کی طرح ہوتی ہیں)

بیت السلطنت - دار السلطنت

بیت الصنم - بت خانہ

بچوں و چرا - بغیر حیلہ و حجت کے

بنچیا - کسی ڈراونی چیز کا نام - وہ

صورت جو بچوں کو ڈرانے کیلئے

بناتے ہیں۔

بیڑے - کئی لکڑیوں کو جوڑ کر پانی پر رواں

کرتے ہیں۔ اسے بیڑا کہتے ہیں۔

بے ستون - اس پہاڑ کا نام ہے جسے

فرہاد نے شیریں کی تمنا میں

پر دینے کے کہنے سے کھودا تھا

بے کم و کاست - بغیر کسی کمی کے

بسکندھ - جنت

بیگانہ وار - غیر کی طرح

بیم - خوف

بے مغز - احمق

بیمینتا - جو گیوں کا سامان

بیہڑ - گنجان جنگل غیر مسطح، ناہموار جنگل۔

پ

پاچھے - پوربی لجم ہے۔ پیچھے

پافتادہ - گرے پڑے

پالا پڑا - واسطہ پڑا

پانویہنی - رخصتی کا گیت

پیت - آبرو

پٹکا - وہ کپڑا جو کمر پر باندھا جاتا ہے

پتھر پڑیں - ادلے گریں (بد دعا کے طور پر)

پتھورا - رائے پتھور یعنی پر تھی راج

پچھل پائیاں - چڑیلیں، جن کے بارے میں

کہا جاتا ہے کہ ان کے پاؤں

پھرے ہوئے ہوتے ہیں یعنی

ایڑیاں آگے اور پیچھے پیچھے

ہوتے ہیں۔

پران وارے - جان بچھاؤ رکڑنا۔ جان شاکرنا۔

پراگتہ - منتشر، بکھرے ہوئے

پرہیز - ذہین، اہل نظر، عاقل

پر تو - روشنی

پر کھٹی - زمین، دنیا

پر کاہ - کائی

پرمان - شمار - بمعنی فضیلت، ثبوت

(ہندی میں پرمانٹر)

پر واز - اڑانا

پرے - قطار در قطار پرندے

(دور دور)

پرے پرے - علیحدہ، دور دور

پس ماندہ - بچا ہوا

پشم - ناف کے نیچے کے بال

پکھا ورج - خاص ہندوستان کا باجا ہے

اور یہاں کے ماہرین موسیقی کی

ایجاد ہے۔ اسی سے کھو خاں

شباب خاں دہلی والوں نے

طلبہ نکالا ہے۔

پگ - قدم

پل - اک دم

پلنگ - چیتا

پنہ دہاں - سنہ میں روٹی والا یعنی خاموش

پنجتن - پانچ آدمی مراد - محمد، علی، فاطمہ،

حسین اور حسین علیہ السلام

پنچھی - پرندہ

پنوی - چھوٹی کشتی

پنے - سلیم شاہی جوتے کے اوپر کا

حصہ۔ تھلا گئے اور جوتے کی

شکل میں آنے سے پہلے اسے

پتہ کہتے ہیں

پو کھٹی - کتاب - صحیفہ، بخومی کی جنری

پوچ - ناچیز

پوزی - رسی کا حلقہ جو سرکش گھوڑے

کے منہ پر باندھا جاتا ہے۔

پور نماشی - چودھویں چاند کی رات جب

پورا چاند نکلتا ہے۔

پھٹکی پھٹکی - الگ الگ - دور دور

پھٹے - صافے، دستار

پیت - محبت

پیٹا - لڑتے ہوئے پتنگ کی ڈور

جو لنگر کھا جاتی ہے، اسے

پیٹا کہتے ہیں

پیچ پڑا - جھگڑا پڑا - بنیاد پڑنا

پیچ واں - وہ بیچہ جو لوہے یا جست کے

تاروں سے بنا ہوئے پیچ

پیراموں - آس پاس، ارد گرد

پیر کنعان - حضرت یعقوب علیہ السلام کو

کہتے ہیں

پیران - لباس

پیر بخارا - ایک بزرگ کا نام - ان کا مزار

لکھنویں اسی نام سے مشہور
ہے، انھیں بزدل کے نام
سے محلہ آباد ہے۔

پیش خدمت - وہ خادم یا خادمہ جس کا کام
منہ ہاتھ دھلانا، پانی پلانا،
اور خاصہ ان اگالہ ان پیش
کرنا ہوتا ہے۔

بیک نگاہ - نگاہ کا قاصد، مراد نظر
بینڈیاں - میوے، شکر اور میوے کی
بینڈیاں جو شادی سے پہلے
نقشہ ہوتی ہیں۔

ت

تمازی - شکاری

تازیانہ - کوڑا

تاسف - افسوس

تاک - انگور کی بیل

تان سین - علم موسیقی کا ایک درجہ دست ماہر
در بار اکبر کا ایک رتن

تبر داری - کلہاڑی اٹھانا

تجاہل عارفانہ - جان بوجھ کر نادان بننا

تج دیا - چھوڑ دیا

تجس - تلاش

تحت الشری - سب سے نیچے کا حصہ - پاتال

تحریر کر بلا - کر بلائے معلیٰ سے کفن آتے
ہیں، جنہیں خلعت کہتے ہیں
اور جن پر آیات قرآنی ہوتی ہیں۔

تر پولیہ - نوبت بجانے کا پھاٹک۔

تدرو - تیز

تر تراتی - مرغن

ترس - خوف، رحم

ترسا - نصاریٰ و آلش پرست۔ یہ

لفظ رومی ہے

ترشح - ٹپکنا

ترکینیں - مسلح عورتیں جو ترکی نسل سے ہوں

ترنگ - جوش

تریہ - عورت

تریہٹ - عودت کی ضد

ترطاق پطاق - تیز طرار

تسطیر - لکھنا

تضرع - زاری، رونا، گڑ گڑانا

تفاوت - فاصلہ

تفرقہ پرداز - جدائی ڈالنے والا

تعافت - پہچان

تکلم - گفتگو

تکھتی - تختی، لوح

تنگاپو - دھڑ دھوپ

تنگ و دو - دھڑ دھوپ

تلا - میزان

تلا مذہ - تلمیذ کی جمع ہے۔ شاگردوں

تلاطم - طوفان

تلی - نیچے

تمامی - سنرا کپڑا

تنزل - زرداں

توام - جرّواں

توبہ نصوحا - دل سے سچی توبہ

تو تو میں میں - ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا

توڑے دار - ایک پرانی وضع کی بندوق

تودہ - ڈھیر

توسن - گھوڑا

توشہ راہ - راہ کا سامان (جو سفر میں لے

جائے ہیں)

توفیق - صلاحیت

توفیر - عزّت

توکل علی اللہ - بھروسہ کیا میں نے خدا پر

تیرہ - اندھیرا

تیرہ بختی - بد بختی

تیرہ وتار - اندھیرا

تیکھی - ترچھی، بانکی، دل میں گھر

کرنے والی

تیمنا - تبرک کے طور پر

ط

طانتھا - مضبوط، توانا آدمی

طماسا - مرید، پیر یا مقلد

طوم - محبوبہ، حسین و جمیل، زیور، سبب

طوتا - جادو

طونا لگا - افسوں کا اثر ہوا

ٹونے - ایک قسم کا گیت، جس میں

گالیاں ہوتی ہیں (ٹونا واحد

ہو تو معنی افسوں)

ٹھا ٹھروں - ٹٹیاں

ٹھا کر - خدا کا سیدک

ٹھٹھا - متسم، مذاق

ٹھنڈی گرمیاں - بے جان مذاق - بے عمل اخلاط،

بے تاثیر شوخی

ث

ثروت - امیری

ثور فلک - ستاروں کی شکل سے ایک

برج فلکی قرار دیا ہے جس کی

صورت بیل کی سی ہے۔

ہے جس میں حروف کے اعداد
کے لحاظ سے آئندہ کا حال
معلوم کیا جاتا ہے۔

جگت - کنویں کی من، زمانے کو بھی
کہتے ہیں

جگر بندان خیر الانام - جگر کے ٹکڑے
رسول اللہ کے (مراد امام حسن و
حسین علیہم السلام)

جعد - چوٹی
جعد پر خم - گھونگھڑالے بال - مڑے
ہوئے بال

جفا شعار - ظلم پیشہ - ظالم
جفا کیش - ظالم

جل - دھوکا

جلدو - بدلہ

جلو - سامنے

جلی - موٹا، واضح

جم - جمشید نام ہے، فارس کے

ایک بادشاہ کا، جس نے

ایک جام جہاں نمایاں کیا تھا۔

روایت ہے کہ اس میں وہ

ساری دنیا کا حال دیکھ لیتا

تھا۔ اسے جام جم بھی کہتے ہیں۔

جہجاہ - جمشید کا سامریہ والا

جناح - پھیلا حصہ - بازو کو بھی کہتے ہیں

ج

جالینوس - یونان کا ایک حکیم جو طبیب تھا
جامع المتفرقین - الگ الگ لوگوں کو ملائی والا

یعنی خدا

جاں کنی - جان نکلنا

جبلّی - ذاتی، فطری

جبین - ماتھا

جٹا - بالوں کی لٹ

جٹا دھاری - ہندو جوگی فقیر، ایک قسم کا

سانپ کہ اس کے سر پر بال

ہوتے ہیں

جدول - حاشیہ = خط گلزار کے صفحے پر

طلائی جدول (سودا)

جدو کہ - کوشش

جرار - بہت جرات والا

جرس - نقارہ، گھنٹہ

جرے - جمع ہے جرہ کی بمعنی باز کا نر۔

باز اس کی مادہ ہے۔ باز کے

مقابلے میں جرہ چھوٹا، کم شمار

اور ضعیف ہوتا ہے۔

جریدہ - تنہا، اکیلا

جزا - اچھا بدلہ

جفرداں - علم جفر کا جاننے والا۔ ایک علم

جھکڑا - صورت، تجلی، کرد فر، دیدار مشوق
شوکت و تجل

جھنڈہ - کودنے والا

جھونٹک جھانٹا - سخت لڑائی جھگڑا -

ایک دوسرے کے بال پکڑ کر

لڑنا

جیب - زبان

جیفہ - زیور مرصع جو پگڑی پر باندھے ہیں

چ

چاپلوسی - خوشامد

چاٹ - مزیدار چیز

چادر پھراتے - طالب اماں ہوتے

چادر ہلانا - سپاہ مغلوب کا اماں چاہنا

چار قب - امرا کے لباس میں سے ایک

قسم کا لباس ہے - یہ لفظ ترکی

زبان کا ہے -

چارکنا - ایک قسم کے زرہ کا نام

چال ڈھال - روش، انداز

چاؤش - شکر اور قافیے کا نقیب

چاہ - عشق

چپیٹ - چوٹ کا تابع مہل - جیسے

چوٹ چپیٹ

چپٹ - اٹھا ہوا جانا یعنی کمر کا زمین سے

(فوج کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے)

جنجال - مصیبت، جھگڑا، جو چیز نہایت

ناگوار خاطر ہو -

جوار جوار - قرب و جوار کے ملک

جوالہ - بہت بھر مکے والا

جودت طبع - طبیعت کی پہنچ

جوزی - حلوہ سوہن کی قسم

جوز - تاش

جویا - ڈھونڈنے والا

جھالے - عورتوں کے کان کا زیور - اس

بارش کو بھی کہتے ہیں جو زور شور

سے برس کر جلد تر گذر جائے -

جھانڈیدہ - دنیا دیکھے ہوئے -

جھانجھ - لوہے کے دو گول ٹکڑے

بغیر کنارے کے بنا کر ان کی

پشت پر ایک تہ لگاتے ہیں

اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک

دوسرے پر مارتے ہیں تاکہ آواز

پیدا نہ ہو - جھانجھ، جھلاٹ

کو بھی کہتے ہیں -

جھپٹ - تیز رفتاری

جھٹ - ایک طرف، فوراً

جھجھ - لڑائی جھگڑا

جھک مارنا - بیودہ بات کرنا

لگ جانا؟

بہتر - چھاتا

چٹھی نویس - وہ عورت جو امیروں کے محل میں لکھنے پڑھنے کی نوکری کرے۔

چرخ رنگاری - نیلا آسمان

چرسا - عمدہ پکا ہوا چمڑا، جس کو

عربی میں سبت کہتے ہیں مگر

یہاں چمڑے کا بڑا ڈول

مراد ہے جس کے ذریعہ کنویں

سے پانی نکالا جاتا ہے۔

چرکٹا - ہاتھی کا چارہ لانے والا،

چارہ کاٹنے والا، ہاتھی کیلئے

مخصوص ہے۔

چرن - قدم

چسکی - گھونٹ، جرعمہ ایون کا گھونٹ

چشمداشت - امید رکھی

چشمہ زندگانی - زندگی کا چشمہ مراد

چشمک زن - آنکھ سے اشارہ کرنا، طعنہ زنی

مراد ہے

چشم نیم وا - ادھ کھلی آنکھ

چقماق - یہ لفظ ترکی زبان کا ہے۔ وہ

پتھر جسے لوہے پر مار کر آگ

نکالی جاتی ہے۔ یہاں وہ بندوبست

مراد ہے جو چقماق کے ذریعہ

چلائی جاتی ہے۔

چلہ - (چیلہ) چالیس دن کی مدت

چم و خم - خرام و زقار، ناز و ادا

پیچ و خم

چندرماں - ماہتاب، چاند

چنڈول - امیرزادیوں کے بیٹھنے کی سواری

جسے کھار اٹھاتے ہیں

چواگن - چاروں طرف آگ جلائے

ہوئے اور روشن کئے ہوئے۔

چوچلا - نخرے

چوک لگا رہتا ہے - مجمع رہتا ہے

چوگھڑا - ساپتی کے دن چار چار کلہڑا،

مٹی یا چاندی کے نقل اور

یوہ سے بھر کر آرائش کے تختوں

کے چاروں کونوں میں باندھ کر

دولھا دھن کے گھرے جاتے ہیں۔

چوپسلا - پانکی کی قسم کی زنانی سواری جسے

کھار اٹھاتے ہیں۔

چونڈا - سر کے بال، جن کو ایک جگہ کر کے

سر کے اوپر باندھ لیں۔

چھٹ - بجز، سوائے

چھکے - ہوش

چھکے سچھوٹ گئے - ہوش اڑ جاتے ہیں

چھل کبخی - ایک پتیل کا کٹورا ہوتا ہے

جس میں چالیس چھوٹے چھوٹے

بیتل کے ٹکڑے ایک تار سے

بندھے ہوتے ہیں۔ ان کو کنجیاں

کہتے ہیں۔ اس کٹورے پر ۱۲ اماموں

کے نام اور سورہ مریم کھدی ہوتی

ہے۔ کہا جاتا ہے یہ اس کٹورے

کی نقل ہے جس میں جناب مریم

نے بہ وقت ولادت حضرت عیسیٰ

علیہ السلام پانی پیاتھا اور

درد زہ کی تکلیف ختم ہو گئی تھی۔

بچے کی پیدائش کے وقت حاملہ

عورت کو چل کنجی کے کٹورے سے

پانی پلایا جاتا ہے تاکہ اسمائے

مترک اور سورہ قرآنی کی برکت

سے مشکل آسان ہو۔

چھو چھو - وہ آیا، جو دُسا کی لڑکیوں

(صاحبزادی) کے ساتھ چھوٹے پن

سے ہی کھیلتی ہے

چھوٹی اُمت - ادنیٰ درجے کے لوگ، مزدور

میشہ، اہل حرفہ

پھیتے - چاہے، سوچے

چیلوں - لکڑی کے تختے جو قبر میں لگائے

جاتے تھے

ح

حاجبان - جمع ہے حاجب کی بمعنی دربان

پہرے دار، نگبان

حاضری - وہ کھانا جو میت کے گھر میں

میت کے دفن کے بعد بھیجتے ہیں۔

شیرمال، کباب، پنیر، پیاز اور

حلوہ جس پر حضرت عباسؓ کی

نذر دلاتے ہیں۔

حاکیان - حکایت بیان کرنے والے۔

حالی - ظاہر

حامل - اٹھانے والا

حبشی - حلوہ سوہن کی ایک قسم

حجرہ - کوٹھا

حدی خواں - حدی وہ اشعار ہیں جن کو

ادبٹ بانٹنے والے پڑھتے ہیں۔

ان اشعار کے پڑھنے والوں

کو چھڑی خواں کہتے ہیں۔

حرف ہے - عیب ہے، لعنت ہے (حرف

سے مراد حروف "لعن" سے ہے)

حرم محترم - کعبہ شریف

حشری - گھوڑے کا ایک عیب

حصن - قلعہ

حصین - مضبوط

حضر - حاضریں

حظ - مزا، لطف

حفظ مراتب - مرتبوں کی حفاظت، پاس آداب سے مراد ہے۔

حق سسرہ - راست ہے بھید اس کا۔
یہ قمری کی آواز ہے۔

حقہ - ڈبیہ

حلیم - بردبار

حمایتی - مددگار

جماٹل - بارگردن میں لٹکنے والی چیز
اسی بنا پر بعد میں "جماٹل شریف"
اصطلاح بنی۔

حمد - خدا کی تعریف

حمق - بیوقوفی

حمیدہ - تعریف کی ہوئی

حواس خمسہ - انسان کے پانچ حواس۔ ذائقہ،

شامہ، لامہ، سامعہ، باصرہ

حواصل - ایک سفید چڑیا جو اکثر دریا کے

کنارے بیٹھی رہتی ہے۔

حول - حوالہ

حیص بھیں - بحث، تامل، کشمکش

خ

خاشاک - کوڑا

خاصہ - کھانا، بادشاہ اور امرا کے

کھانوں کو کہتے ہیں۔ امرا کی

سواری کے مخصوص گھوڑے

کو بھی کہتے ہیں

خام پارہ - نا تجربہ کار، ایک گالی بھی ہے۔

خانماں - گھر بار

خاور - سورج

خالق - خوفزدہ، ڈرنے والا

ختن - حدود چین میں ایک شہر کا نام ہے

خجستہ - مبارک

خدشہ - اندیشہ

خدنگ - تیر

خدیو - بادشاہ، خداوند، اصطلاح

میں مصر کے بادشاہ کو کہتے ہیں

خراد - اس کی اصل خراط ہے۔ اہل

فارس نے خراد کر لیا۔ ایک

آگ ہے جس کے ذریعہ سے

لکڑی کو صاف کیا جاتا ہے

اور مختلف چیزیں بنائی جاتی

ہیں۔ مگر یہاں جائے تربیت

مراد ہے۔

خرانش - ہلکانم - چھل جانا

خرسندی - خوشی، خوشنودی

خرمن - کھلیان

خروارے بہت سا

خروس - مرغِ سحر

خشت - اینٹ

خضر - ہریالی، شاخِ سبز کو بھی کہتے

ہیں - مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ

جنابِ خضر کو حیاتِ جاوداں بخشی

گئی ہے - زمین پر راستہ بھولنے

والوں کو راستہ بتاتے ہیں - یہ

جہاں بیٹھے ہیں وہاں سبزہ پیدا

ہو جاتا ہے - یہ سبزہ زاروں

میں سیر کرتے ہیں اور جہاں کہیں

ان کا گزر ہو جاتا ہے ان کے

قدم کی برکت سے اس سرزمین

پر سبزہ پیدا ہوتا ہے اسی مناسبت

سے یہ نام ہے -

خطیر - کثیر

خفتگانِ خاک - خاک میں سوئے ہوئے مراد

مردے

خفقان - دل دھڑکنا (ایک بیماری)

خلع - علیحدگی چاہنا عورت کا مرد سے

خنجر - گلا - ہنسی لکے کی

خنجر - ڈفلی -

خود اپنے - وہ سوار جو خود گھوڑے کا مالک

ہو یعنی اس کی طرف سے کوئی

دوسرا نوکری نہ بجاتا ہو

خود سچیدہ - آپ ہی آپ غصہ ہوتا رہا

خود سر - اپنی رائے پر چلنے والا

خوشہ چیں - بالی چننے والے

خوگر - عادی

خوں آشام - خون پینے والا

خوں چکاں - خون ٹپکانے والی

خیار تر - لکڑی

خیام - خیمے

خیل - گروہ

خیلا ہے - بیودہ ہے، داہی ہے (زنائی گالی)

د

دار - سولی

دارِ مکافات - بدلے کی جگہ، دنیا

دار و گیر - دھڑکچٹ

دار و مدار - کسی چیز پر انحصار

دافع - دور کرنے والا

دافع البلیات - بلاؤں کا دور کرنے والا یعنی

خداوند تعالیٰ

دامن گیر - دامن پکڑنے والا

دانتا کلکل - لڑائی جھگڑا بات بات پر

دائی - ملازمہ، خادمہ (میرامن کی باغ)

بہار میں حسن بانو نے اپنی ملازمہ

کو دائی کہا ہے، 'فسانہ عجائب میں'

دائی اس عورت کے لئے کہا گیا

ہے جو بچے کی پیدائش کے وقت

مدد کرتی ہے - وہ ملازمہ جو

بچہ کی پرورش کرے، بوڑھی

ملازمہ جو ماں کے مرتبہ کی ہو

کھانے پکانے والی ملازمہ - دائی

بمعنی جنای بھی آتا ہے -

دائی جنائی - بچہ جوانے والی

دخاں - دھواں حق کو بھی کہتے ہیں -

درب - دولت

دڑ پیٹیم - بڑا اور چکیلا موتی کہ صدف میں

تنہا پیدا ہوتا ہے اور جو بے باپ

کے پیدا ہوتا ہے - ماں اس کی

سیپ ہے - یکدانہ

دردِ زہ - پہلو کا درد، جو بچے کی پیدائش

سے پہلے ہوتا ہے -

دروغ - جھوٹ

دزدِ حنا - وہ سفیدی جو ہندی لگانے کے بعد باقی رہ جاتی

دستاویز - سند

دست بردی - چوری، ظلم، اچک لینا

دست پاچہ - پریشان - حیران، مبہوت

دشت نورداں - جنگل طے کرنے والے

دغدغہ - کھٹکا، خطرہ

دقیقہ - باریکی

دگلے - (جمع) ایک قسم کا روٹی کا لمبا

کوٹ، مثل ہے -

دگلاب سے اگلا، پنو تو گرم

بچھاؤ تو نرم باندھو تو بچی کا بھرم

دل - گردہ، موٹائی مثلاً بعض پھلوں

کے لئے آتا ہے کہ بوڑھے دل کا ہے -

دل دوزی - دل سینا، تکلیف دینا

دل گرفتہ - رنجیدہ

دام - نقارہ

دمدے - تودے، ٹیلے، برج

دُمچی - (تم کی لفظ) وہ حلقہ جو گھوڑے

کی دم کے نیچے ہوتا ہے -

دساز - عزیز، ہر وقت کا ساتھی

دم واپس - موت کا وقت، آخری سانس

داؤ منجے گئے - داؤ ہار گئے -

دوال - اباب تھل و شان و شوکت،

یہاں مراد نمائش سے ہے -

دو بدو - آمنے سامنے

دو چیت - رنجیتا، متوجہ کرنا

دودماں - خاندان

دودھیا - حلوہ سوہن کی ایک قسم

دید ہونہ شنید ہو۔ دیکھی ہونہ سنی ہو
 دیگ - دیکھ - مراد فیاضی
 دیگ تیگ - سخاوت اور تلوار کا دھنی
 دیدے - آنکھیں

ط
 د

ڈاب - پرتلا - اس چیز کو کہتے ہیں جسے
 کمر میں باندھ کر اس میں تلوار
 لٹکاتے ہیں

ڈانوا ڈول - حیران، پریشان، تذبذب،
 کسی بات پر دل نہ جمے۔

ڈاہ - حد، جلن
 ڈبرے - گڈھا جس میں برسات کا پانی
 جمع ہوتا ہے

ڈول - حال، عالم، انداز، طور
 ڈھب - سلیقہ

ڈھب پر نہ چڑھی - رضا مند نہ ہوئی، مرضی
 کے مطابق نہ ہونا

ڈھب ڈھبانے - تیرنے، پانی میں ہاتھ پاؤں
 مارنے

ڈھڈھے - رنگ بہت زرد

ڈھڈو - کوٹے کی مادہ کو کہتے ہیں یہاں
 مراد بڑھیا سے ہے۔

ڈھکوسلا - فریب، سخن مہل

دو رویہ - دونوں طرف، دو قطاروں میں

دوسار - نشانے پر لگنا، اثر کرنا

دولاب - چرخ، ارہٹ

دوماہرہ - دو مہینے کی تنخواہ

دوں - کمینہ، بیج

دونا - شاہ نصیر کا مصرعہ ہے

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دو میں ڈال کر

پتوں کو برتن کی شکل میں بنالینا

تاکہ اس میں پھول یا مٹھائی وغیرہ

رکھی جاسکے

دونا چڑھانا - مٹھائی وغیرہ دونے میں رکھ کر

مزار وغیرہ پر چڑھانا۔ حضرت

مشکل کشا یا حضرت خاتونِ جنت

یا کسی اور بزرگ کے نام کی

مٹھائی چڑھانا۔ مراد نذر دینا

سے ہے۔

دونا ماننا - کسی کی نذر دینا کا عہد کرنا۔

دوو - دھواں

دھج - دھج، روش

دھن - قوس

دھرید - گانے کی ایک قسم

دھرم مورت - مجسم مذہب

دیا - عنایت

دید و ادید (ملاقات کیلئے) آنا جانا

دیدوں - آنکھوں کے ڈھیلے

ڈھگ - پاس، قریب
 ڈھل گندوں - بزدلوں
 ڈیل - جسم

ذ

ذره از خورشید خصائل - عادتوں کے سورج
 میں سے ایک ذرہ
 ذکی - عقلمند
 ذوی الاقدار - صاحب قدرت، اختیار والے
 ذمی شعور - صاحب عقل

گھوڑے کا نام بھی رخس تھا -
 رخنہ بندی - سوراخ بند کرنا
 رخنہ پر دائرہ - خلل ڈالنے والا
 رد و قدح - بحث مباحثہ، تکرار
 ردی - خراب کاغذ
 رزم - لڑائی

رستم - فردوسی کے شاہنامے کا ہیرو
 جو اپنی قوت اور شجاعت کے لئے
 ضرب المثل ہے۔ زال کا بیٹا
 رس کا خلل - گھوڑے کی ایک بیماری،
 جس میں سموں سے پانی رسنے
 لگتا تھا

رضوان - جنت کا دارِ عدتہ
 رضینا بالقضا (مقولہ) راضی ہوئے ہم مقدر پر
 رطب و یابس - تر اور خشک مراد اچھا اور بُرا
 رعد - گرج - بجلی کا فرشتہ
 رقیمہ شوق - شوق کا خط
 رکابدار - یاد رچی، علوم بنانے والا
 رکن - کھبیا ستون
 رم - بھاگنا (آہوے رم خود دہ -
 بھاگا ہوا ہرن)

رمز و کنایہ - بھید اور اشارے کی بات
 رمنا - جہاں سلاطین وحشی جانوروں
 کو شکار کے لئے چھوڑ دیتے
 ہیں۔ وہ جگہ جہاں کسی کی

راج ہٹ - بادشاہ کی ضد
 رام کہانی - لمبی داستان
 راہی ہوا - چلا گیا
 راندہ - نکالا ہوا
 رت جگا - شب بیداری۔ وہ رات جب
 عوریں گاجا کر بسر کرتی ہیں اور
 پکوان پکاتی ہیں
 رجال الغیب - غیبی انسان
 رحیل - کوچ
 رخس - وہ گھوڑا جس کا رنگ سفید و
 سرخ ملا ہوا ہو۔ رستم کے

روزمرہ آمد و رفت ہے۔ فارسی

میں چراگاہ کو کہتے ہیں جہاں

ہرن چرتے پھرتے ہیں۔ اس کے

لغوی معنی ہیں جمع ہونے کی جگہ۔

رمیدگی - بھاگنا

رن - میدان کارزار

رنڈی - عورت

روباہ - لومڑی

روزِ جزا - قیامت کا دن

روزمرے - محاورے جو روزمرہ بولے

جاتے ہیں اور بول چال میں

راج ہوتے ہیں

روند - پرے داروں کا گردہ

روئیں تن - نوہے کی طرح سخت جسم رکھنے والا

ریاض - باغ

ریختہ - اردو زبان

ریل پیل - کثرت یا زیادتی

ز

زاغ - کوا

زال - بڑھیا

زائرؤں - زیارت کرنے والے

زبان زد ہونا - چرچا ہونا

زبون - مکروہ، بُرا

زردوزی - جس میں چاندی سونے کے

تار اور ریشم کے پھول بنے

ہوتے ہیں۔

زرہ پوش - زرہ پہنے ہوئے

زعم - غرور

زغن - چیل

زمرے - مجمع، جماعت، گروہ

زمریہ - برت، بالائی فضا کا وہ طبقہ

جہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ

ہر چیز جم جائے

زنبق - ایک سفید پھول جس کی پتھر یا

بڑی ہوتی ہیں اور اس میں

خوشبو کم ہوتی ہے۔

زنج - ٹھوڑی

زنداں - قید خانہ

زنگ - ناقوس

زورق - چھوٹی کشتی

زور رقم - غضب کی چیز، نہایت حسین

زیرک - دانا

ژ

ژولیدہ - اُلجھا ہوا

سام = موت - جد رستم - یہاں

پہلوان مراد ہے - زال کا باپ
یہ پہلوان یک چشم بھی تھا، کہتے
ہیں کہ اس کے ایک ہی وار میں
مقابل موت کے گھاٹ اتر
جاتا تھا۔

سامری - ایک مشہور جادوگر جو سامرہ کا

باشندہ تھا۔ روایت ہے کہ
اس نے جبریل کے گھوڑے
کی خاک اٹھالی تھی۔ یہ بعض
آثار سے جبریل کو پہچانتا بھی
تھا۔ وہ خاک اس نے گوسالہ
کے جوف میں، جو سونے چاندی
سے بنائی گئی تھی، ڈال دی،
وہ گوسالہ جاندار ہو گئی اور
بولنے لگی اور اس کی وجہ سے
حضرت موسیٰ کی امت کے بہت
سے لوگ گمراہ ہو گئے۔

سامع - سننے والا

سامعون - سننے والے

سانحہ - واقعہ

سانچہ مار - چابک والا

سبز پوشاں - برگزیدہ لوگ - حضرت حسن نے

غم میں (کہ وہ زہر سے شہید ہوئے)
بچے، سبز کپڑے پہنتے ہیں یہ

س

سابقین - اگلے لوگ

ساپن - گھوڑے کا ایک عیب ہے

گردن پر ایک بھونری سانپ
کی شکل کی ہوتی ہے۔

سابق - شادی کے روز رات کے وقت

مگر عقد سے پہلے کچھ گھوڑے اور
ٹھلیاں جو رنگیں اور منقش

ہوتے ہیں اور جن میں میوے

اور نقل وغیرہ اور بہت سی

چیزیں یعنی ہندی وغیرہ ہوتی

ہیں۔ دولہا یہاں سے دولہن

کے گھر لے جاتے ہیں۔ ان گھڑوں

پر شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ اسی

وقت بری کا جوڑا بھی جاتکے

اس کو بری بھی کہتے ہیں۔

ساری - گھسنے والا، اثر و سراپت

کرنے والا۔ یہاں مراد غالب ہے۔

ساقہ - دُنبالہ لشکر، فوج پسین،

فوج معینہ، فوج کا پھیلا حصہ

سالک - راہ چلنے والا۔ اہل سلوک

سالک مجذوب۔ سلوک و جذب، تقویٰ کی

اصطلاح میں مدارج کے نام ہیں

لوگ بھی سبز پوش ہوئے بچوں

کو بھی محرم کے زمانے میں اسی

مناسبت سے سبز کپڑے پہناہیں

سبک دوش - ہکا

سبک رومی - تیز چال

سبیل - ضرورت، حاجت

سپر - ڈھال

سپینج - سپرنج چند روزہ

سپر - آسمان

سنت - طاقت، قوت، دوا کا جوہر

ستودہ صفات - پاکیزہ خصلتیں یا عادتیں

رکھنے والے

سٹنھیاں - عورتوں کی اصطلاح میں گیت

کا نام ہے جو ڈومٹیاں آرہی تھیں

کے وقت گاتی ہیں

سج - صورت، وضع قطع، بھیس

سجے - خوبصورتی سے باندھے ہوئے

سحاب - بادل

سجیاں وائل - عرب کے ایک فصیح و بلیغ شاعر

کا نام ہے۔ سحباں کے باپ کا

نام وائل تھا

سحر - جادو

سغن سنج - کلام تولنے والا، شعر کو سمجھنے والا

سُدھ - ہوش، آگاہی

سُدھ بدھ لینا - خبر لینا

سراپا - سر سے پیر تک

سراپہ دہ - بارگاہ شاہی، وہ پردہ جو

بطور دیوار خیمہ کے آگے

کھینچ دیا جائے

سراج - چراغ

سراسیمہ - پریشان، گھبرایا ہوا

سرائیت - اثر کر جانا

سربینج - پگڑی، ایک قسم کا صاف

سردست - ابھی

سرعت - تیزی

سرفروگندہ - سرنچا کرنے والا، سر جھکا

دینے والا

سرگرداں - آوارہ و پریشان

سرنوشت - تحریرِ ابد

سرطانِ فلک - کیکڑا - ایک برج فلکی کا

نام ہے جو باعتبار صورت نجوم

اہل نجوم نے قائم کئے ہیں

سرور - سردار

سریہ - تخت (ذوق)

بری منزل میں ایک ماہِ سرلیح اسیر و ہوش

خواص اسکا گھر میں شمنوں کے قہقارے کا

سریع السیر - تیزی سے گزرنے والا، وہ

سیارہ جو تیزی سے اپنی منزل کو

پہنچتا ہو

سزاوار - لائق

سعادت - نیک بختی

سفاک - خوریز، خوشخوار

سفلہ - نیچے کے (شیطان سے متعلق) کمینہ

سفلہ پرور - کمینہ کا پالنے والا

سفینہ - کشتی

سفینہ - احمق

سقاے سکینہ - جناب عباس علیہ السلام جو معرکہ

کر بلا میں جناب سکینہ دختر جناب

امام حسین کے لئے مشک لے کر

نہ فرات سے پانی لینے کیلئے گئے

تھے اسلئے ان کا یہ لقب ہو گیا تھا۔

سقر - جہنم کا ایک طبقہ

سقراط - یونان کے ایک حکیم کا نام جس کو

زہر پلا کر مارا گیا تھا۔

سقف - چھت

سفر لاتی - بانائی

سقیم - ابتر، خراب

سکھپال - زنانی سواری کا نام (پردہ نشین

عورتوں کے لئے)

سلاسل - زنجیر

سلف - زمانہ قدیم، عہد گزشتہ

سلک گہر - عورت کی لڑائی

سلیم - سیدھا

سلیمان - ایک پیغمبر کا نام ہے۔ حضرت

داؤد کے بیٹے۔ ان کی حکومت

جن دانس چرند پرند یعنی جملہ

مخلوق پر تھی۔ کہتے ہیں کہ دیو

جن دیری خود کو انکی امت

میں شمار کرتے ہیں اور ان کی

قسم دلا دینے کے بعد پھر اس سے

نہیں پھرتے۔

سلہٹ - سلیٹ جس کا رنگ سیاہ ہے

سم - زہر

سمند - گھوڑا

سناٹے - شد و مد، سختی، خاموشی، حیرت

سنان - برہمی

سندھا - فریب آدمی۔ تندرست میٹھا

سنگ پشت - کچھوا

سنگرین - منکر (مونث، جمع) میوہ فروش

سنگ = سنگھ - ساتھ کا، مثل،

نظیر، جواب

سنگسار - پتھر سے مارنا

سنیچر - نخوت، زحل

سوج بھنکار ناناںک متی کی - توپوں کی قسمیں ہیں

سوفار - تیر کے پر

سوئے - توتا۔ مشرقی یوپی میں سکا بھی

کہتے ہیں۔

سہل ممتنع - اس طرح کا سہل جو باز رکھنے والا

ہو۔ وہ نظم جس کی نثر نہ کی جاسکے،

وہ نثر کہ اس سے آسان الفاظ
میں اس کو نہ کہا جاسکے یعنی اکی
تقلید ناممکن ہو۔

سیاح - سیر و سفر کرنے والا

سید - سردار

سید الشہدا کا شہدا - جناب امام حسین
علیہ السلام کا محبوب و عاشق زرا

سیر - پیٹ بھرا، آسودہ

سیر - عادت - سیرت کی جمع

سیماب و ش - پارے کی صورت

سینوک - خدمتگار

سیہ اعمال - بد اعمال

ش

شام اودھ - اپنی دلکشی کے لئے مشہور ہے
کسی زمانے میں لکھنؤ کے چوک
کی شام نہایت دلفریب ہوا
کرتی تھی۔

شانی - شفا دینے والا

شانی مطلق - خداوند تعالیٰ جس کے اختیار
میں مکمل شفا بخشا ہے۔

شاق - ناگوار

شاہجہاں آباد - دہلی کا پرانا نام جسے شاہجہاں
نے بسایا۔

شایاں - لائق

شہدینہ - گھوڑا

شب زندہ دار - رات کو جاگنے اور عبادت

کرنے والا

شب کتخدائی - شادی کی رات

شب کور - گھوڑے کی بیماری ہے۔ جب

اس کو روتوند رات کو دکھائی

نہ دینا آتی ہے۔

شحنہ - کو تو ال (مثل ہے) اتر شکنہ

مردک نام)

شدہ شدہ - ہوتے ہوتے

شست - نشانہ

شش جہت - مشرق، مغرب، شمال، جنوب

اوپر نیچے

شط - کنارہ دریا

شطرنجی - خانے دار دری

شعبہ بازی - فریب دینا۔ نیزنگیاں دکھانا

شقی - پھٹنا

شقی - سخت دل

شقی - حکم

شکیب - صبر

شل - تھکے ماندے

شلک - ترکی زبان کا لفظ۔ کئی بند دقوں

کے یکبارگی سر ہونے کی آواز

کو کہتے ہیں۔

شلنگ - ایک مقام سے دوسرے مقام تک کو دنا۔

شامل - خصلتیں، عادتیں

شمسہ - عمامہ، صافہ

شمہ - زراسا، تھوڑا

شور و شین - زیاد

شوم - منحوس، خراب

شناور - تیراک

شہدا - بد معاش، لچا، بازاری آدمی

شہہ بالا - چھوٹا دولہا (دولہے کا چھوٹا

بھائی جو دولہا کے پیچھے سوار

ہوتا ہے)

شیر بچہ - ایک قسم کی چھوٹی بندوق

ص

صاحب زہد و دواع - تارک دنیا، زاہد و شفی

صادق الاقرار - سچا وعدہ کرنے والا

صاعقہ - بجلی، چمک

صائم النہار - دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے والا

صباح و مہا - صبح و شام

صحنک - ایک چھوٹا کونڈا یا طباق جس میں

شیرینی بچا دل یا کھیر وغیرہ بھر کے

حضرت فاطمہؑ کی نیاز دی جاتی

ہے۔ اس کو صرٹ سادات عورتیں

کھا سکتی ہیں۔ مصغر صحن بمعنی طبق طعام۔

صراط مستقیم - سیدھا راستہ

صرصر - آندھی

صریح - صاف، واضح

صعوبت - سختی، تکلیف

صلواتیں - بری باتیں، گالی

صناعی - کاریگری

صنعت - کاریگری

صوابدید - صلاح و تجویز، مشورہ

صور - صور اسرافیل، جس بگل کے

ذریعہ قیامت کا اعلان ہوگا۔

صورت - طرح

صولت - دبدبہ

صیغہ اخوت - بھائی چارگی

ض

ضرر - نقصان

ضعیف - کمزور

ضلالت - گمراہی

ضیا - روشنی

بولتی ہے۔ اس سے مجازاً انسان

مراد لی جاتی ہے۔

طلاق - طاعت گویائی

طلبیدہ - طلب کیا ہوا

طیور - پرندے (جمع طائر کی)

طیر - پرندے

ع

عاجر - پسندیدہ

عارف - خدا شناس

عاری - ننگا، خالی

عازم - ارادہ کرنے والا

عباس - حضرت امام حسین علیہ السلام

کے بھائی جو معرکہ کربلا میں

شکر حسین کے علمبردار تھے۔

عبث - بیکار

عجب و نخوت - غرور و خود بینی

عجوز - بوڑھا

عدیل - مانند و مشابہ، نظیر

عبدہ - حیلہ، بہانا

عرضہ - میدان، مدت

عرصہ شہود - میدانِ ظہور، جلوہ گاہ

عرصہ فتنال - میدانِ جنگ

عرض بگیوں - عرض کرنے والوں، وہ لوگ

ط

طاق - بکتا، معطل، بیکار

طالع - نصیب

طاثر فرزانہ - عاقل پرندہ (یہاں مراد

قوت)

طائفہ - گردہ

طبلۂ عطار - عطار کا منہ بند ڈبا

طیندن - تڑپنا

طرحدار - خوبصورت

طرفہ - عجب

طرفۃ العین - پلک جھپکنے میں

طرہ - اضافہ، پگڑی کا دہ سرا جو

ادب پر اٹھا رہتا ہے۔ شاہ نصیر

شب کو تجمہ کو کیونکر پھبتا سر پر طرہ ہار گئے ہیں

جوں پر دین و مالہ نہ تھا سر پر طرہ ہار گئے ہیں

طشت - تھال

طور - حالت

طوطی پس آئینہ - طوطی کے پڑھانے کا یہ طریقہ

ہے کہ پنجرہ آئینہ کے سامنے رکھ کر

خود پیچھے بیٹھ جاتے ہیں اور بولتے

ہیں طوطی اپنا عکس آئینہ میں دیکھ

کر یہ سمجھتی ہے کہ دوسری طوطی

بیٹھی ہے اور اس کو دیکھ کر

جوبادشاہ کے حضور میں لوگوں
کی عرضیاں پیش کرتے تھے۔

عریاں - ننگا

عزاداری - ماتم داری

عزت گزریں - گوشہ تنہائی اختیار کرنے والا

عزم بالجزم - پکا ارادہ

عسرت - تنگی، تنگ دستی، مفلسی

عسکر - لشکر

عسل - شہد

عش عش - حیرت میں آکر تعریف کرنا

عصر - زمانہ

عفت - پاکبازی

عقدہ - گرہ

عقدہ لانیل - وہ گرہ جو نہ کھل سکے

عقرب - بچھو، بروج آسمانی میں سے

ایک جو بچھو کی شکل کا ہے۔ گھوڑے

کا ایک عیب گردن میں ایک بھوڑی

سانپ کی شکل کی ہوتی ہے۔

عقوبات - (جمع) عقوبت بمعنی سزا اور سختی۔

عقیل - دانا

علت - وجہ، سبب

علم - جھنڈا

علوی - اوپر کے۔ آسمانی

علی الخصوص - خاص طور پر

علیہ العن - اس پر لعنت ہو

عماری - جو ہاتھی کی پشت پر رکھا

جاتا ہے اور جس میں بیٹھے ہیں

عمداً - جان بوجھ کر

عمل - سرحد جہاں تک اس کا حکم

چلتا ہے۔ دخل، حکومت،

اسی سے عملداری بنا ہے۔

عنان - باگ

عنایت علی الدوم - مستقل عنایت

عند الضرورت - ضرورت کے وقت

عوج بن عنق - ایک طویل القامت انسان

کا نام ہے جو روایت ہے کہ

حضرت آدم کے زمانے میں

پیدا ہوا تھا اور حضرت موسیٰ

کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی

عمر تین ہزار پانچ سو سال مانی

جاتی ہے۔ روایت ہے کہ طوفان

نوح اس کی پٹلیوں تک آیا

تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا

عصا اس کے ٹخنے پر مارا تھا،

جس سے وہ گر کر مر گیا تھا۔

عین الکمال - انتہائے کمال

عیاذاً باللہ - خدا کی پناہ

غ

غٹ - گردہ، ہجوم
غربت زدگان مسافرت کے مارے ہوئے۔

پردیسی

غریب الوطنی - مسافرت، بے وطنی

غرق - ڈوبا ہوا، ڈوبنے والا
الْغَرَقُ تَيْشَبْتُ بِكُلِّ خَشِي
ڈوبنے والا ہر نیکے کا سہارا لیتا ہے

غریو - غرانا، آواز تند، شور و غل

غفر اللہ لک - خدا تجھے معاف کرے
غلام گردش - نیچے کی منزل میں کمرے کے سامنے
کا برآمدہ

غواص - غوطہ خور

غول - بھوت

غیبت - عدم موجودگی

غیرت ماہ - چاند کو شرمانے والا

غیظ - غصہ

غیور - غیرت والے

ف

فاحشہ - بدکار

فر - دبیدہ، شان و شوکت

فراخور - لائق، مناسب، سزاوار

فراش - فرش بچانے والا

فراواں - زیادہ

فرحان - خوش

فرختہ صفات - مبارک صفات

فرشتہ خاں - فرشتہ صفت آدمی - ناسخ کا مہر

بن کے آیا فرشتہ خاں قاصد

فرعون - مصر کے بادشاہ کا لقب حضرت

موسیٰ کے وقت میں مصر کا بادشاہ

تھا جو بہت سرکش اور مغرور تھا

اس نے مجازاً ایسے ہی آدمیوں

کے لئے کہتے ہیں۔

فر فر - جلد جلد چلنا

فرق - پیشانی کے اوپر، وہ جگہ جہاں

سر کے بال شروع ہوتے ہیں

فرمان - لکھا ہوا حکم

فرنگی محل - لکھنؤ کا ایک محل ہے جہاں

علمائے اہل سنت رہتے ہیں۔

فریدیوں - نام ہے فارس کے ایک

بادشاہ کا جس نے ضحاک پر

فتح پائی۔

فریم - چوکھٹ

فری میسن - (Freemason)

خفیہ سوسائٹی کے ایک فرد کو

کہتے ہیں۔ اس کا مقصد معلوم

نہیں؛ بظاہر معاشرتی تعلقات
بڑھانا اور دوسروں کی مدد
کرنا۔ اس کی ہمہری کے لئے
مذہب و ملت کی قید نہیں۔
اس کی منظمی حیثیت کسی حد تک
ایسی ہے جیسی آجکل ریڈیو
کلب کی ہوتی ہے۔

فروں - زیادہ

فقیہہ - مسائل دینی جاننے والا عالم فقہ
فنس - زنانی سواری جنہیں کسار

اٹھاتے ہیں۔

فی زمانہ - ہمارے زمانے میں

فہم - سمجھ دار
فیلسوف - عقلمند، حکیم، مگر یہاں مکار
مراوے۔

ق

قاری - قرأت کا ماہر، حروف کو صحیح

مخارج سے ادا کرنے والا

پڑھنے والا

قاش - زین کا اگلا حصہ جو لکڑی کا ہوتا

ہے اور اٹھا ہوا ہوتا ہے

قافلہ باشی - قافلہ کا کو تو ال

قائم - ایک جانور کا نام ہے اس کا

پوست بہت ملائم اور سفید ہوتا
ہے اس کی پوستیں بناتے ہیں

قالب - جسم

قائم اللیل - رات کو کھڑا رہنے والا

(عبادت کے لئے) رات کو نماز

پڑھنے والا

قباد - شاہان کیانی میں سے ایک

بادشاہ کا نام ہے جو بادشاہ

نوشیرواں اور آل ساسان

میں سے تھا

قبح - عیب

قتیل - قتل کیا ہوا

قدر انداز - نشاۃ باز

قرار واقعی - خوب خوب، وہ بات جو متعین

ہو چکی ہو

قرارین - یہ لفظ ترک کی ہے۔ ایک قسم کا

فراخ ذہن تفنگچہ

قرآن السعدین - دو سعدتاروں کا ایک برج

میں اکٹھا ہونا کہ ان کی سعادت

دو بالا ہو جائے

قربوس - زین کے ایک حصے کا نام ہے۔

بلندی پیش زین - اس کو حنا زین

بھی کہتے ہیں۔

قرطاس - کاغذ

قرساق - بھڑوا

ک

قرابت - دامادی

قرۃ العین - آنکھ کی ٹھنڈک

قریبوں - رشتہ دار

قلب - بیچ کا (شکر)

قلق - تکلیف

قلما قینیں - مسلح عورتیں (ایک خانہ بدوش

ترکستانی قبیلہ)

قوس قزح - دھنک

قور - ترکی میں ہتھیار کو کہتے ہیں اور

قورچی کے معنی ہیں، دربار کا

اہتمام کرنے والا۔ یہاں قورمین

کے معنی ہیں اہتمام کے واسطے

قوم عاد - یہ وہ قوم تھی جس پر حضرت ہود

کو پیغمبر کر کے بھیجا گیا تھا۔ ان کی

بد دعا سے اس قوم پر طوفانِ بار

نازل کیا گیا۔ (عاد و ثمود۔ دو

قومیں جن پر عذاب الہی آیا اور

جو تباہ ہو گئیں)

قہار می - بہت زیادہ تہر کرنا۔

قیافہ شناسی - صورت دیکھ کر انسان کے

دل کا حال معلوم کرنا۔

کار بستہ - بگڑا ہوا کام

کارپردازاں - کام کرنے والے

کارگاہ بے ثبات - وہ کارخانہ جس کا استحکام نہ ہو

کاشانہ - گھر

کاسہ - پیالہ

کاسد - کھوٹا

کام - حلق

کان آلا تھا - کان چھدنے کے بعد اچھا نہ ہوا تھا۔

کانپی - کاپی

کانون - چھین

کاہ - گھاس

کاوش - چھین

کاہش - گھنا

کاسیدہ - جھکا ہوا

کبک - چکور

کبیدہ - رنجیدہ

کپیٹ - کینہ

کپیٹی - دغا باز، کینہ پرور

کٹی جلی - ایک دوسرے کو بری بات

کنا، طنز کرنا

کشیف - میلے

کج رفتار - پیڑھی چال والا

کچی - ٹیڑھا پن

کحل الجواہر - جواہر کا سرمہ

کد - ضد

کدم - قدم (دیہات کے لوگ ق
نہ ادا کر سکنے کی وجہ سے کدم
کہتے ہیں)

کر - گونگا - بہرا

کرامات - واحد کرامت - خلاف عادت

امر جو کسی مسلمان بزرگ سے

واقع ہو -

کرخت - سخت

کردھنی - ایک زیور ہے جو ہندوؤں میں

کمر پہ پہنتی ہیں - یہاں کمر بند

مراد ہے -

کر و فر - شان و شوکت

کرک - سرطان

کرناے چینی - قرنا - نائے بزرگ

کر و بیوں - فرشتگان مقرب - شر

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

دش طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کر و بیوں

کریم النفس - شریف طبیعت

کر و گیتوں - جمع کر و ایت کی یعنی نقیب

کسگر - کاسر بنانے والا بخفت ہے

کاسر گر کا - یہاں بازار کے حقہ

پلانے والے سے مراد ہے -

کسوں - قسم

کسوف و خسوف - سورج اور چاند کا گنا -

(مگر عام طور پر سورج کے گن

کو کسوف اور چاند کے گن

کو خسوف کہتے ہیں)

کس و کو - کون ہے تو اور کہاں ہے تو -

یعنی اصل وحیثیت

کشٹ - (ہندی لفظ) تکلیف - زحمت

کشتنی خستنی - مارنے اور جلانے کے قابل

کفیل - مددگار، کت کرنے والا

کلاؤنت - گویا

کلبہ - کوٹھری

کلیا دے گا - ربخ دے گا

کلفت دیرینہ - پرانا ربخ

کلنکن - بے حیا، بدنام عورت جسے

کلنک لگ چکا ہو

کلیس - دکھ، تکلیف

کم خور - گھوڑے کا ایک عیب ہے جب

وہ بہت کم کھانے لگتا ہے -

کمری - گھوڑے کی ایک بیماری جس میں

کمر ماؤف ہو جاتی ہے کہ اس کا

چلنا مشکل ہو جاتا ہے -

کیت - سیاہی مائل سرخ، گھوڑے کا

رنگ

کین گاہ - دشمن پر حملہ کرنے کے لئے

چھپ کر بیٹھنے کی جگہ، گھات
کا مقام

کنارے - علیحدہ، دور

کنام - آرام گاہ

کنٹھ - گلا

کنجشک - گوریا

کندہ ناتراش بغیر تراشا ہوا لکڑی یا پتھر کا
ٹکڑا - غیر مہذب شخص، ناتریت یافتہ

کنشت - بت خانہ

کنوتی - گھوڑے کی کان

کواکب - کوکب کی جمع، ستارے،

اجرام فلکی

کوچہ گردی - گلیوں میں پھرنا

کور باطن - دل کے اندر، جن کا ضمیر

مرحبا ہو

کور نمک - نمک حرام، بے وفا

کوس - نقارہ

(کوس) لمن الملک (عربی) کس کا ملک -

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

پوچھے گا کہ آج ملک کس کا

ہے؟ پھر خود ہی جواب دیگا۔

لِلّٰهِ الْاِحَادُ الْقَهَارُ - یعنی اُس

خدا کے واحد کا جو قہار ہے۔

یہاں اسی طرف اشارہ ہے۔

کوس لمن الملکی - خود مختار

بادشاہت کا اعلان -

کور دہ - اندھا گاؤں - مراد پھیرے

ہوئے گاؤں سے ہے۔

کوس و کور - ذہن و نقارے

کورہ آہنگران - لوہاروں کی بھٹی

کوندے - وہ نیاز کا کھانا جس پر جناب

فاطمہؑ کی فاتحہ دی جاتی ہے۔

اس کو صرف عورتیں کھا سکتی

ہیں بعض اوقات امہ کی نذر

کو کھانا بھی ہوتا ہے۔ اسے

مومنین ہی کھاتے ہیں۔

کونین - دونوں عالم

کوہ طور - ملک شام میں ایک پہاڑ ہے

جس کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ اس پر خدا نے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کو تجلی دکھائی تھی۔

کو،

کوچہ

کوئے آشیان - گھونسلے کی طرف

کھا جا - ایک قسم کی مٹھائی

کھڑکھڑیا - ایک قسم کی زنانی سواری جسے

کہار اٹھاتے ہیں۔

کھلاڑن - تجربہ کار

کھنڈل ڈالے - پامال کر دے

کنہ ننگ - ایک بیماری ہے جب پیر میں ننگ پان

پیرانا ہو جائے۔

کھوٹا - غیر خالص - بُرا آدمی

کھوج - تلاش

کھوٹا اکھاڑ - کھوٹے کا ایک نقص ہے۔

شریر - تھان کا ٹرا -

کھونٹی - دارِ صی کے سخت بال جو ہونڈ کا

پر باقی رہ جاتے ہیں۔

کھیر - خیر گادوں کے لوگ خ نہ

بول سکنے کی وجہ سے کھیر کہتے ہیں۔

کہ و مہ - چھوٹے بڑے

کھیل کھائی - تجربہ کار عورت (برے معنوں

میں کہتے ہیں)

کید - دشمنی

کیواں - نام ہے رعل سیارے کا جو

فلک ہفتم پر مانا جاتا ہے اور

مجازاً آسمان کو بھی کہتے ہیں۔

گ

گات - عورت کے پستان بقول جرأت ہے

مجھ میں جرأت ہے بھلا دست دراز کی کیا

دیکھ کر مجھ کو چھپا لیتے ہو تم گات بٹ

گاڑھ - دشواری، مشکل

گام - قدم

گاؤ ٹرائے ہندو دیومالا کے مطابق وہ

گاؤ زمین میں لگائے جو زمین کو اپنی سینگ پر

اٹھائے ہوئے ہے اور خود

پشت ماہی پر قائم ہے۔

گاہ - کبھی، جگہ

گبر - آتش پرست

گجر دم - صبح سویرے جب گجر بجاتا ہے۔

گدک - وہ نکین چیز جو شراب کے ساتھ

کھائی جائے۔ گدک آجکل

تو میٹھی ہوتی ہے لیکن شراب

کے ساتھ نکین ہی کا جوڑ ہے

چنانچہ کباب و گدک دونوں

ایسی ہی ہونی چاہئیں۔

گذشتہ راصلوۃ - گزرے پر فاتحہ پڑھنا یعنی گزرے

ہوئے کو بھول جاؤ۔

گریب پرور - غریب پرور

گرد ہو جانا - بے رونق ہو جانا۔ ماند پڑ جانا

گرہ - ستارہ

گتیاں - خدا پر مانتا

گلخن - بھٹی، انگلیٹھی

گلدانگ - یہ انگریزی لفظ بل ڈاگ کی

بگڑی ہوئی شکل ہے۔ شکاری کتا۔

گل رعنا - خوشنما پھول

گلوزار - گلاب کی طرح گالوں والا،

نہایت خوبصورت

گلنار - سرخ جیسے انار کا پھول

گن - ہنر

ل

گنجینہ - خزانہ
گوشالہ - وہ جگہ جہاں گائیں رکھی جائیں۔
گو - گیند

گوسالہ - گائے کا بچہ۔ حضرت موسیٰ کے
ہمد میں سامری نے جادو سے
گائے کا بچہ بنایا تھا۔

گوش - کان
گوشہ نشین - کونے میں بیٹھنے والا، گناہ کش
گوگرد - گندھک

گون - لائق یا پسند
گونگے کا نواب پسندنا - مبہم بات جس کا سمجھنا
نہایت دشوار ہے۔

گہر بار - موتی برسائے والا۔
گہر بسی - گھر میں بیٹھنے والی۔ مراد عورت
گھامڑ - بد سلیقہ اور احمق

گھٹائی - کینہ پن
گھٹنے - کثیر
گیاں - عورتیں اپنی ہم نشین عورت کو
یکلمہ کہہ کر پکارتی ہیں۔

گیانی - عارف
گیدی - کم اہل، چھپھورا
گیہاں - روزگار، جہاں

لا ابالی - بیکار، عبت
لا اعلم - نامعلوم
لابیان - جو بیان نہ ہو سکے
لابجہ - منافق

لات و منات - نام ہیں ان بتوں میں سے
دو کے جو خانہ کعبہ میں نصب تھے جنہیں
حضرت علیؑ نے اکھاڑ کر پھینک دیا۔

لچر - ذلیل
لاخیر فی عبیدی - میرے غلام میں کوئی بھلائی نہیں
لاریب - بلا شک

لا طائل - بے سودہ، بیکار
لاف و گراف - شغی، ڈینگ
لال - گونگی

لا ولد - بے اولاد

لیٹ - بل، بھڑیاں، فریب
لئے ہوئے جاتے تھے۔ پھٹے جاتے تھے۔

لٹورہ - ایک ابلق پرندہ جو فاختہ سے
بڑا ہوتا ہے اور جو گوریا کا
شکار کرتا ہے

لٹھ - بد تمیز، گنوار
لجہ - بھنور
لجابت - خوشامد

لحد - قبر
 لغلغہ - چند خوشبودار چیزیں، جنہیں
 آپس میں ملا کر سونگھا جاتا ہے
 تاکہ بیوش کو ہوش آجائے بشرط
 کرتے ہیں صبا کے کبھی لغلغہ سالی (نقد)

لسان - تیز زبان والا، چرب زبان
 لطمہ - تانچہ، پتھیرا
 لعلستان - جمع لعلت کی، بہ معنی معشوق
 لن ترانی - حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر خدا کا
 جلوہ دیکھنے کے لئے کہا جب ملا
 کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے ہو یہ فقرہ
 بطور تلمیح بھی آتا ہے اور شیخی
 یا ڈینگ مارنے کے معنی میں بھی
 رابع ہے۔ تو مجھے نہیں دیکھ
 سکتا۔ (شیخی کے طور پر استعمال
 ہوتا ہے)

لوح جہیں - پیشانی کی تختی مراد پیشانی

لوی - معشوق

لوی چرخ - آسمان کی مشوقہ یعنی زہرہ

لو بکھی - لالچی

لیس - تیار

لیل و نہار - رات اور دن

م

مال کار - انجام کار، بالآخر
 مادر بخت - حرام زادہ

مانی - روم کا ایک نقاش، جس نے
 نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور نقاشی
 کو اپنا معجزہ بتاتا تھا۔ کتاب
 ارژنگ اس کی تصنیف ہے۔

مانجھا - ساچ

مانجھے کا جوڑا - وہ جوڑا جو شادی کے دن
 دو لہلہ کے یہاں سے دلہن کے
 یہاں جاتا ہے اس کو بعض
 جگہوں پر بری کا جوڑا بھی کہتے ہیں۔

مانع - روکنے والا

ماہ دو ہفتہ - چودھویں کا چاند

ماہی مراتب - سلطنت کا نشان - اودھ میں

”مچھلی“ سلطنت کا نشان تھی۔

چنانچہ مچھلی بھون بھی اسی

نشان کی یادگار ہے۔

مبارخ - جمع ہے مبلغ کی - یعنی روپیہ

مبد - ابتدا کی جگہ، آغاز

مبدل - بدلنے والے

مبتدی - ابتدا یعنی شروع کرنے والا

متاع - پونجی، سرمایہ

- متشرع - شریعت پر چلنے والا
متصل - ملا ہوا۔ اتصال کی مناسبت سے لگاتار بھی ہو سکتا ہے۔
مسل - لگاتار
متفق اللفظ - ایک زبان ہو کر
متقی - پرہیزگار
مٹھ - مندر
مٹھا - گھوڑے کا ایک عیب بست رفتار (سست آدمی کو بھی کہتے ہیں)
مجتہد - صاحب اجتہاد و سند، اہل تشیع کے سند یافتہ بڑے علماء۔
مجر - سلام
مجرد - ساتھ
مجر - انگلیٹھی
مجوز - تجویز کرنے والا
مجیب الدعوات - دعاؤں کا قبول کرنے والا یعنی خدا
مچے - جمع ہے مچا۔ گوشت کا بڑا ٹکڑا (جس میں ہڈی نہ ہو)
مجھندر - جو شخص بند رنچا کر اپنی معاش پیدا کرتا ہے۔ مرد بہودہ، دیوث، مسخرہ، بڑی بڑی موچھوں والا۔
مخافہ - امیرزادیوں کے بیٹھنے کی سواری
ہے۔ اس میں مرد بھی سوار ہوتے ہیں اسے کہا راٹھا ہیں۔
محبس - قید خانہ
محبوب - شرمندہ
محرز - لکھنے والا، منشی
محرم راز - بھید کے جاننے والے
محزوں - غمگین
محملداریں - (جمع) ڈیوڑھی تک کام کرنیوالی عورت
محمل - کجاوہ
محمودی - ایک کپڑے کا نام ہے، نہایت لطیف ہے۔
محمن - محنت
محيط - (سمندر) احاطہ کئے ہوئے، گھیرے ہوئے
منجر صادق - سچی خبر دینے والے۔ بیان مراد حضرت محمد صلم۔
مدارج - درجے
مداری - تماشہ دکھانے والا
مداریلے - مٹی کے فرشی ختے۔ فیروں کا ایک گروہ جس کا سلسلہ حضرت شاہ مدار تک پہنچتا ہے۔
مدام - ہمیشہ
مد نظر - نظر کے سامنے
مدۃ العمر - عمر کا زمانہ

- مرات - آئینے
مراجعت - واپسی
مرافقہ ثانی - دوسری عرضداشت - اپیل
مرہٹلی - پیٹو - جو کھانے سے سیر نہ ہوتی ہو۔
مردار - زنانی گالی - نہایت حق و ذلیل عورت مثلاً کینز
مردود - رد کیا ہوا، نکالا ہوا۔
مزد بوم - جائے پیدائش
مرسلوں - بھیجے ہوئے پیغمبر
مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ - خدا کی مرضی ب سے بہتر ہے۔
مُربغ ریز - مُربغ کی بریانی
مرغوب - پسندیدہ
مرفہ - خوشحال
مرقع - کاغذ یا حریر کے ٹکڑوں کا مجموعہ جس پر تصویریں ہوتی ہیں۔
مرگ مفاجات - موت جو نہ ٹل سکتی ہو۔
مزرعہ - کھیت
مژدہ - خوشخبری
مساعده - مبارکی
مسافت - دوری بیان کی - فاصلہ منزلوں کا۔
مسبب الاسباب - اسباب فراہم کرنے والا۔
مراد خداوند تعالیٰ -
- مستجاب - قبول
مستعار - مانگا ہوا - جو چیز ادھار لی جائے۔
مستولی - چھایا ہوا - غالب، زور آور
کسی پر غلبہ پانے والے۔
مستولی - جہاز کے پردے
مسدود - بند
مسکن - رہنے کی جگہ
مُسْن - سن رسیدہ
مشاطہ - کنگھی کرنے والی عورت، ناین
مشائخ - شیخ کی جمع - بزرگ لوگ
مشت پرہ - مٹھی بھر پرہ
مشتے - کھوڑا
مشروحاً - مفصل - شرح کے ساتھ
مشکل کشا - مشکل کو کھولنے (حل کرنے) والے حضرت علی کو کہتے ہیں۔
مصلیٰ - جاننا
مطعون - (طعنہ دیئے ہوئے) جسے طعنہ دیا گیا ہو
منظفر - فتح مند
مع الخیر - ساتھ بھلائی کے، خیریت کے ساتھ
معاذ اللہ - خدا کی پناہ
معانقہ - بغل گیر ہونا
معدلت - انصاف کرنے والی۔
معصیت - گناہ

معقول - عقل سے منطقی، منطقی

معیوب - عیب کا کام

مفتنم - غنیمت

مفرق - ڈوبا ہوا، ڈبویا ہوا، جڑاؤ

مفسد - فساد

مفقود - ناپید

مفقود الخیر - لاپتہ

مفتوح - کھلے، ظاہر ہو، جن کو فتح کیا

جاچکا ہو

مفتی - فتویٰ دینے والا

مقدمہ - کام، معاملہ

مقرر - ضرور بالضرور

مقرر - تقریر کرنے والا

متنع - نقاب

مکرر - دوبارہ

مکلف - تکلیف دینے والا

مکس رانی - کسی ہانکنا -

ملہوس - پوشاک

ملچھ - گندا

مناوی - ندا کرنے والا، اوزار لگانے والا

منصور - فتح مندہ

منغض - کرہوا، بد مزاج

منفعل - شرمندہ

منتقار - چوینچ

منصور و حلاج - ایک فقیر کامل کا نام ہے۔

ان کا نام حسین تھا۔ باپ کا

نام منصور۔ باپ کے نام سے

مشہور ہوئے۔ حلاج اس لئے

کہتے ہیں کہ ایک روز دھنئے

کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے

اس سے کسی کام کے لئے کہا۔

اس نے انکار کیا اور کہا۔ میں

اپنے کام میں مشغول ہوں۔

منصور نے کہا۔ تو میرا کام

کردے میں تیرا کام کر دوں گا۔

دھنیا کام کرنے چلا گیا۔ جب

تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو

اس نے اپنی ساری روٹی دھنی

ہوئی پائی۔ بہت تعجب ہوا۔

منقل - انگلیٹھی، آتش دان

منقول - نقل کی ہوئی باتیں

من ماننتے - حب دلخواہ، جیسا دل چاہے۔

منکشف - ظاہر

منہ زور - گھوڑے کا ایک عیب جب

وہ لگام لگی ہونے کی حالت

میں زور کرے اور بھاگ جاتا

چاہے اور لگام کی پرداہ

نہ کرے۔

من یثا - جو وہ چاہے۔

منہیات - جو باتیں منع کی گئی ہیں۔

موا - مرا - عورتیں کسی سے بیزاری کے
وقت یہ کلمہ اس کے حق میں بولتی ہیں۔
موجد - ایجاد کرنے والا

مودب - ادب قاعدے سے
مہ پیر کنغاں - حضرت یوسف علیہ السلام کو کہتے
ہیں - پیر کنغاں حضرت یعقوب
علیہ السلام کو کہتے ہیں۔

مہک پری - ایک عطر کا نام ہے جسے نصیر الدین
حیدر بادشاہ نے ایجاد کیا۔

مہندی - شادی کی ایک رسم ہے جس میں
دلہن کے ہاتھ لگاتے ہیں۔

موکب - دہبہ، فوج یا لشکر
میانہ - زمانہ سواری جسے کہا را اٹھاتے ہیں۔
میل - خواہش
میسمنہ - دائیں جانب کی فوج۔
میسرہ - بائیں جانب کی فوج۔

ن

نادر الزماں - زمانے میں کیا

ناد علی - پکار علی کو

نادوں - ناندوں

ناٹے - کلاوے

ناز و نیاز - لاڈ اور عاجزی

نافر جام - بد اصل - نامبارک

ناقوس - سنکھ

ناقہ - اونٹ

ناکت خدا = ناکہ خدا = کنواری

ناگزیر - ضروری - جسے چھوڑنا نہ جا
سکتا ہو۔

ناگن - گھوڑے کا ایک عیب ہے۔ گردن

پر ایک بھونری سانپ کی شکل

کی۔ اگر اس بھونری کا منہ سوار

کی طرف ہوتا ہے تو اسے نامبارک

سمجھا جاتا ہے۔

ناگوری - دلی کا ایک قسم کا جوتا

نالکی - امیر زادوں کے بیٹھنے کی سواری

نامحرم - ناشناس، غیر

نان نہاری - صبح کے وقت کی روٹی

ناوک - تیر

ناہنجار - بد ذات - بد اصل

نائرہ - آگ، شعلہ

نایک - علم موسیقی کا ماہر استاد

نبرد - جنگ

نجبا - جمع ہے نجیب کی، یعنی شریف

یا عمدہ نسل کا۔

نجد - محضوں کی محبوبہ بلی کا وطن

نچا کچھا - خراب حال، ابتر

ندیم - ہم نشین، مصاحب، صلاح کار

ندیدہ - نہ دیکھے ہوئے، مشتاق، لاپچی

نگارندہ - لکھنے والا
نگر - شہر
نمط - طرح، مثل
نمش - مشک - بر وزن سرشک بمعنی ملائی اور کھن۔

نمود - نمائش

ننگ و ناموس - شرم اور غیرت

نوح - ایک پیغمبر کا نام، جن کے زمانے میں ایک زبردست طوفان آیا تھا۔

نوش - شہد، مینا

نہنگاں - نہنگ کی جمع۔ گھڑیاں

نہتاں - شیر کے رہنے کا جنگل۔ شعر

اپنی نگاہوں میں اپنے ہیں سب اپنی نگاہوں میں

ہر نے میں بھری آگ نیتاں کیلئے ہے

(ذوق)

نیتاں وہ جنگل جہاں نے (نرکل

یا نرکل) ہوئے جس کا سر میں بنتی ہے

نیش - ڈنک

۵

ہادی - راستہ بتانے والا، ہدایت کرنے والا

ہاروت ماروت - دوزخستوں کے نام ہیں جو چاہ

بابل میں لٹکے ہوئے ہیں اور جو

کوئی ان سے جادو کیجئے جاتا

ہے، اُسے سکھاتے ہیں۔ زہرہ

نرالیاں - نئی قسم کی۔ جمع ہے نرالی کی
نرد - چوسر کی گوٹ یا مہر، سیر طبعی بہن کی
لڑنے کو پھر کھڑا روش نرد ہو گیا
(ذوق)

نرسنگا - ایک باجا

نرغسہ - ہجوم، گھیراؤ، (مخالفتوں کے)

ہجوم میں گھر جانا۔

نرک - آگ - جہنم۔

نرنا ری - مرد عورت

نرنگار - واحد، بے علامات شکل

نروٹھا - موٹا مسٹنڈا

نرول - نازل ہونا یا اترنا

نشراد - نسل۔ اصل و نسب

نسقلق - خوشخط

نسکٹا - جس کی نس کاٹ دی گئی ہو

نسیاں - بھول

نشور - قیامت

نصارئی - عیسائی

نصرت آموز - نفع سے بھرا ہوا

نطفہ حرام - حرام زادہ

نطری - رد کردی گئی

نظر بند کرنا - دیکھنا، نظر کے سامنے رکھنا

نعت - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف

نفس امارہ - حکم دینے والا نفس

نقل - ایک مٹھائی کا نام، چکھنے کی چیز، بوند

اور شتری سے ان کے عشق کا قصہ

بہت دلچسپ ہے۔

ہالہ - وہ حلقہ جو چوڑھویں کے چاند

کے گرد جب ہلکے ہلکے بادل ہوں

تو اس کی روشنی کے انعکاس سے

بن جاتا ہے۔ شاہ نصیر علی

جوں پر دین دہالہ تم تھاسر پر طرہ ہار گئے میں

ہاموں - میدان، جنگل

ہتی - دوست

ہتھے مارے - کھانا کھایا، خوب کھایا

ہٹا کٹا - تندرست

ہٹ دھرم - فدی

ہدایہ - ہدیہ کی جمع، تحفہ

ہدف - نشانہ

ہڈ آ - گھوڑے کی ایک بیماری

ہرا دل - (ترکی) فوج کا دہ

سب سے آگے ہوتا۔

ہراساں - ڈرنے والا

ہر بھجو - خدا کا نام لو

ہرکارہ - اردلی - ہر کام کرنے والا

ڈمک والا

ہر ہر - اللہ اللہ

ہزارے کا فوارہ - فوارہ جس میں ہزار دھاریں

نکلتی ہیں

ہزبہ - شیر

ہڑ بونگ - ابری - ہڑ

ہمدی - ساتھ

ہمسر - برابر

ہم سنگ - ہم مرتبہ

ہمقراں - یکجا ہونا ستاروں کا، مراد

شادی ہونے سے

ہمہ داں - سب کچھ جانتے والا

ہندی کی چندی - بال کی کھال نکالنا

ہنوز - ابھی

ہوا - خواہش

ہوئی - ایک آتش بازی، پستہ بادام

کے باریک ورق، کترے ہوئے۔

ہود ج - کجاوہ، جس میں لوگ سوار

ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھی پر رکھا جاتا۔

ہوش ربار - ہوش اڑانے والا۔

ہوکا - زیادہ کھانا، لیکن سیری نہ ہو۔

(ایک بیماری)

ہوکا مقام - خوفناک، سنان جگہ

ہول - لوہشت، ڈر، خوف

ہیجا - لڑائی

ہیچ میرز - بے حقیقت، بے مایہ، جس کی

قدر و قیمت نہ ہو۔ ناچیز

ہیسزم - لکڑی سوکھی، جلانے کی

ہیکلیں - جمع ہے ہیکل کی، یعنی طوق

ہین - (ہندی لفظ) کمزور، چھوٹا اور حقیر

ہدیت کذائی - صورت موجودہ (خراب معنوں)
ہیہات - افسوس

یعقوب علیہ السلام - پیر کنفاں - حضرت یوسف
علیہ السلام کے باپ -

یک لخت - بالکل، اکدم، اچانک
یلغار - کوچ پر کوچ، دھاوا، حملہ
یمن - برکت
یہود - یہودی، یہودا کی اولاد -

می

یا بشریٰ ہذا غلام - خوشخبری ہو یہ غلام ہے - یہ
بات اُس شخص نے کہی تھی
جس کے ڈول میں حضرت
یوسف علیہ السلام چاہ کنفاں
سے باہر آئے تھے -

یا رشا طر - رفیق، ہمیشہ ساتھ دینے والا -
شطنج کا ساتھی -

یا را - طاقت، اہمیت
یا راے مقام - ٹھہرنے کی طاقت
یا قوی - ایک مقوی، بیش قیمت دوا

جو اہرات ڈالے جاتے ہیں -
یخ - برف، سردی کے سبب
پانی کے جم جانے سے بنتی ہے

ید سحر - جادو کا ہاتھ
ید قدرت - قدرت کا ہاتھ

یراق - سامان

یزداں - خدا

یساولاں - جمع ہے یساول کی یقیب

یشت - ایک پتھر کا نام
چوبدار

فرہنگ محاورات و امثال

فسانہ عجائب

فرہنگ محاورات و امثال و فسانہ عجائب

آسمان پر پہنچانا - رتبہ اور عزت دینا۔

آسمان کو زمین کر دیا - ناجیز ٹھہرایا۔

آنسو پینا - غم کو ضبط کرنا۔

آنکھیں چار ہونا - بالمقابل ہونا۔

آنکھیں دکھانا - غصے میں گھورنا، دھمکانا،

ڈرانا، خوف دلانا۔

آنکھیں سینکنا - آنکھوں سے دیکھ کر تسکین

حاصل کرنا۔

اپنے سائے سے بھرنا - بلاوجہ خود فرود ہونا۔

اپنے لکھے کو روکنا - قسمت کو ردنا۔

اپنے منہ سے دھنبا بائی - (مثل) خود ستائی

کرنا، اپنی تعریف کرنا۔ اپنے منہ

میاں سٹھو بننا بھی کہتے ہیں۔

اچھا چھکا - فاحشہ، بدکار۔

ازناست کہ براست - جو کچھ کہ ہم پر پڑتی

ہے ہمارے ہی سبب سے

ہے۔ اپنے کئے کا نتیجہ۔

آہ سرد کہینچنا - ٹھنڈی سانسیں بھرنا۔

باطل است انچہ مدعی گوید - مدعی جو کچھ

کہتا ہے بھوٹ ہے۔

بدوز طمع دیدہ ہوش مند - لالچ سمجھدار

آدمی کی آنکھ بند کر دیتی ہے۔

بڑے بول کا سر نہچا - گھنٹہ کرنے والا

پیشیمان ہوتا ہے۔

بے جھوٹک جھانٹا - بغیر لڑائی۔

بعد از سرمن کن فیکون شد،

شدہ باشد - میرے سر کے بعد کن فیکون

ہو جا پس ہو جانا یعنی

دنیا پیدا ہو جائے تو ہو جائے

بے چون و چرا - کوئی بات منہ سے نہ نکالنا۔

بغیر حجت اور دلیل کے۔

پاس نہ پھٹکنا - قریب نہ آنا۔

پاؤں ہر ایک کٹی من کا ہو گیا - چلنا

مشکل ہو گیا۔

پگ آگے پت رہے اور پگ پیچھے

پت جائے - (مقابلے کے وقت) آگے

قدم رکھنے سے غیرت رہتی

ہے اور پیچھے ہٹنے سے

جاتی رہتی ہے۔

پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا - اپنا

نقصان اپنے ہاتھوں

سے کرنا۔

تمام عمر دانت رہے۔ ہمیشہ رغبت رہے
تلوؤں سے آنکھیں ملنا۔ دشمن سے
آنکھیں نکلو کر پیروں سے

رودنا۔

ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا۔ (کنایہ)

کوئی پوشیدہ کام کرنا۔

ٹھنڈی گرمیاں کرنا۔ ظاہری محبت، جھوٹی
گرمجوشی۔ بغیر محبت عشق

ظاہری۔

ٹیسڑھی کھیر۔ مشکل کام۔

جان کے لالے پڑنا۔ زندگی دشوار ہونا۔

جس طرح بیٹھ دکھاتے ہو اسی صورت

الہ تمہارا منہ دکھائے۔ جس طرح جاہے

ہو ویسے ہی خیریت سے

دایس آؤ۔

جلی کٹی سنانا۔ رشک و حسد کی باتیں کرنا۔

جی بیکل ہونا۔ طبیعت کا پریشان ہونا۔

جی چھوٹ جانا۔ ہمت ہارنا۔ بے دل

ہوجانا۔

جی کا بیٹھ جانا۔ مایوس ہوجانا۔

جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب

دیکھنا۔ غریبی میں امیری کی باتیں کرنا۔

جبا جبا کے گفتگو کرنا۔ درپردہ طنز کرنا

چور کی داڑھی میں تنکا۔ (مثل) ایسے

موقع پر کہتے ہیں جب کوئی

عیب کر کے چھپانہ سکے اور

خود ہی اقبال کی صورت

پیدا کرے۔

چھلکے چھوٹنا۔ ہوش اٹا جانا۔ اکدم

گھبرا جانا۔

چہلے کے پھنسنے۔ کیچڑ کے پھنسنے۔

چھوٹا منہ بڑی بات۔ بڑوں کی عیب گیری

کرنا۔

چھاتی بھر آنا۔ آنسو بھرنا۔ درد یا غم

کی وجہ سے رونا آ جانا۔

جیل کا انڈا چھوڑنا۔ اس قدر سخت گری

کا ہونا کہ جیل انڈا سیٹے

سیٹے گرمی کی تاب نہ لا کر

انڈا چھوڑ دیتی ہے۔

حاجت مشاطہ نیست روئے دلا آرام را۔

خوبصورت چہرے کو سنوارنے

کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خود کردہ راعلاج نیست۔ اپنے کئے

کا علاج نہیں ہوتا۔

خار کھانا۔ حسد کرنا، رشک کرنا،

جلنا، دشمنی کرنا۔

خون دل پینا۔ رنج اٹھانا۔ غصہ

برداشت کرنا۔

دامن دگر بیاں آنسوؤں سے بھگوننا۔

لہار و قطار رونا۔

دل ٹھنڈا کرنا - دیکھو ٹھنڈا کرنا دل کو خوش کرنا -

دل کا پاش پاش ہونا بے حد غمگین ہونا -
دن کا پھرنا - نصیباً جاگنا - مصیبت کے دن کٹ جانا -

دودھ کا جلا چھا چھ پھونک پھونک پیتا ہے - (ش) ایک چیز سے ڈرا ہو، دوسری بمثل چیز سے ڈرتا

ہے اور احتیاط کرتا ہے -
دنیا سے ہاتھ اٹھانا - دنیا کو چھوڑ دینا -
دھوکے کی ٹٹی - ایک چیز ہوتی ہے کہ صیاد اس کے حجاب میں طاہروں کا شکار کرتے ہیں - اور کتنا یہ ہے اس چیز اور صورت سے بھی جو کسی کو مغالطے اور شک میں ڈالتے ہیں -

داہنی آنکھ پھڑکنا - ضعیف الاعتقاد عورتوں کا عقیدہ ہے کہ مرد کی داہنی آنکھ پھڑکنے سے خوشی اور بایں سے ربخ - عورت کی داہنی آنکھ سے غم اور بایں سے خوشی ہوتی ہے -

دشمن اگر قوی ست مہرباں قوی تر است -
دشمن اگر مضبوط ہے تو مہرباں اس سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے -

درپس ہرگز یہ آخر خندہ الیت - ہر غم کے بعد خوشی آتی ہے -

دم سرد پھرنا - ٹھنڈی آہیں پھرنا -
دقیقہ باقی نہ رہنا - کوئی کسر نہ چھوڑنا -
دم بھرنے لگا - (محبت کا) دعویٰ کرنے لگا -

دل ٹھنڈا کرنا - کلیجہ ٹھنڈا کرنا -
دل خون ہونا - دل ٹوٹ جانا -
غمگین ہونا -

دروازہ نہ چھوٹنا - ہر وقت موجود رہنا -
دل سرد ہونا - بیزار ہونا، اکتا جانا -
دہن دریدہ - منہ پھٹ - جو جی میں آئے کہنے والا -

دیکھ کر سکتا ہونا - دیکھ کر حیرت کی باعث سنائے میں آجائے اور بول بھی نہ سکے -

رنگ فق ہونا - خوف یا شرم سے چہرے کا رنگ بدل جانا -

زخم آ لے ہونا - زخم کا ہرا ہونا -

زبان زد خاص و عام ہونا - مشہور و معروف ہونا - بات کا پھیلنا -

زربہ سر فولاد نہی نرم شود - اگر فولاد

پرسونا رکھ دیں تو وہ بھی نرم ہو جائے گا یعنی روپیہ سے ہر کام ہو سکتا ہے -

زندہ درگور ہونا - جیتے جی موت کی سی
تکلیف اٹھانا، انتہائی تکلیف
کا پانا۔

جل جانا - رشک و حسد کرنا۔

سینہ جاہل گورتنگ - جاہل کا سینہ
قبر کی طرح تنگ ہوتا ہے۔

سہاگ کا عطر گرد ہوا - ناچیز ٹھہرا۔

سردھنا - افسوس سے سر گھمانا۔

سوکھ کے کاٹا ہونا - بہت دُہلا ہونا۔

سر سے کھیلنا - زندگی سے بیزار ہونا۔

مرنے پر کمر باندھ لینا - جان

سے گزرنا سے ذوق

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسق اثر سے کھیلے

دہان و گیسو کا تیرے مار نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ساحل را از رخس و خاشاک گذار و گل را

از خاک ننگ و عار نمی باشد - ساحل کو

راہ کے جھاڑ جھنکاڑ اور

پھول کو کانٹے سے ننگ و عار

نہیں ہوا کرتا۔

شمع کا چور سر محفل لرزاں - فیروز بخت

بادشاہ کی حکومت میں آنا

رعب، دبدبہ اور انصاف

تھا کہ عام چور تو کیا شمع کا

چور (شمع کی لو کی بیچ میں جو

چھپا ہوا سایہ) بھی محفل

میں کا پنتا تھا۔

شیخے میں اتار لینا - (کنایہ) کسی کو مسخر

کر لینا قابو میں کر لینا۔

شیطان کے کان بہرے ہونا - (غور توں کا

محاورہ) کسی بُری خبر کو سُنتے

وقت کہتے ہیں مفہوم یہ ہے

کہ خدا اس خبر کو

جھوٹ کرے۔

صحنک کھلانا - کھانے اور میوہوں کا

طباق، جس کو جنابِ طہ الزہرا

کے نذر کرتے ہیں اور سادات

کی عورتیں اسے کھاتی ہیں۔

صلواتیں سنانا - بُرا بھلا کہنا۔

طشت از بام ہونا - راز فاش ہونا۔ بھیج کھلنا۔

عقل کے دشمن ہونا - بے وقوفی اور

نا سمجھی کی حرکت کرنا۔

غصے کی جھا بچھ نکالنا - غصے کی جلاہٹ

نکالت۔

قتل سے ہاتھ اٹھانا - قتل سے

باز آنا۔

قول مرداں جاں دارد - مرد جو کہتے ہیں

وہ کرتے ہیں۔

قدم آنکھوں پر رکھنا - بے حد عزت اور

احترام کرنا۔

کان پکڑنا - معافی مانگنا، پناہ مانگنا،

کسی کام کے نہ کرنے کا عہد کرنا۔
 کاٹا سا کھٹکنا۔ نہایت ناگوار گزارنا۔
 بُرا لگنا۔ ذوق
 فرقت میں تری تار نفس سینے میں میرے
 کاٹا سا کھٹکنا ہے نکل جائے تو اچھا
 کیا منہ دکھائیں گے۔ کس طرح سامنے
 جائیں گے۔

کوندے بھرنا۔ ائمہ علیہم السلام و دیگر
 بزرگانِ دین کی نذر دنیا
 کی شیرینی کو کوندے میں
 رکھ کر مومنین کو کھلائے ہیں۔
 کس کس کا (تلوار) لہو چاٹتی ہے۔ کون
 کون مارا جاتا ہے۔

کھیت رہنا۔ قتل ہونا۔ بہت سے لوگوں کا
 مارا جانا۔

کاسہ سوال۔ بھیک کا پیار۔
 کنوئیں جھنکوانا۔ در بدر پھراتا، خاک چھنوانا،
 حیران کرنا۔

کفِ افسوس ملنا۔ نہایت افسوس کرنا۔
 کھیلی کھائی۔ (جنسی زندگی میں) تجربہ کار۔
 کندن کی طرح دکھنا۔ چمکنے لگنا۔
 کام تمام ہونا۔ جان دینا ختم ہو جانا،
 قتل ہونا۔

کہ کر دکھنا۔ (مثل) جس نے جیسا کیا
 دیا پایا۔

کلیجہ منہ کو آنا۔ (کنایہ) دل کے قلق
 اور بیتابی کا بڑھنا۔

گھر بسی۔ گھر میں بیٹھنے والی۔
 گوٹم مشکل و گرنہ گوٹم مشکل۔ کہیں تو مشکل
 اور نہ کہیں تو مشکل۔

گونگے کا سپنا۔ (کنایہ) پوشیدہ حال
 اور مبہم بات کہ اس کا سمجھنا
 مشکل ہو۔

گر یہ کہ دن راہم دل خوش می یابد دے کیلئے
 بھی دل خوش چاہئے۔

لینے کے دینے پڑ جانا۔ قاعدے کے
 بدلے نقصان ہونا۔ نیکی
 کے بدلے بدی۔

لو کا پیاسا ہونا۔ جانی دشمن ہونا۔

لہر آنا۔ ترنگ آنا۔

لو کے کھونٹ پینا۔ (کنایہ) غصے کو
 ضبط کرنا۔ یا۔ جبراً کوئی
 کام کرنا۔

لوا ماننا۔ (کنایہ) کسی کی بہادری اور
 شجاعت کا قائل ہونا۔

ماہی بے آب ہونا۔ بے قرار اور
 بے چین ہونا۔

مجت کے پینگ بڑھنا۔ ددوں پر
 سے محبت کا بڑھنا۔

مارگزیدہ از ریشماں بچیدہ می ترسد یانہ

کا کاٹا ہوا الجھی ڈور سے ڈرجا گیا
مرگ انبوہ جتنے دارد۔ بھیر کی موت میں بھی
جشن کی کیفیت ہوتی ہے۔

مرمر کے جینا۔ بڑی مصیبتوں میں زندگی بسر کرنا۔
(فانی) علی زندگی نام ہے مرم کے جٹے جانے کا
مشکل کشا کا کھڑا دونا دینا حضرت علیؑ کی نذر
دلانا۔ یہ نذر کھڑے ہو کر دی
اور کھائی جاتی ہے۔

مشک آنت کہ خود بوئید کہ عطا بگوید مشک وہ ہے جو
کہ اپنے آپ خوشبو دیتا ہے۔
کہ وہ جسے عطار مشک کہتا ہے۔
من آئم کہ من داکم۔ میں جیسا بھی ہوں،
جانتا ہوں۔

منہ پر ہوائیاں اڑنا۔ دہشت یا کسی سبب سے
چہرے کا رنگ بدلتا منہ زرد
ہو جانا۔ گھبرانا۔

منہ موڑنا۔ کنارہ کشی اور پسپاہی
اختیار کرنا۔ ساتھ چھوڑنا۔

منہ نوچنا۔ چہرے کو ناخنوں سے زخمی کرنا۔
(علامت غصہ) ریح میں بھی
منہ نوچتے ہیں۔

منہ نہ کھلوائیے۔ بدن بانی یا عیب کھولنے پر
آمادہ نہ کیجئے۔

منہ کالا کرنا۔ فعل بد کرنا، بدنامی مول لینا
مشتے نمونہ از خروالے۔ گدھے بھر بوجھ

کی بانگی مٹھی بھر۔

مٹھی کو چھوٹا، سونا ہاتھ تائی مٹی ایسی معمولی چیز کو
چھوٹے سے سونا ہو جائے
یعنی جس کام میں ہاتھ لگاتا
کامیاب ہوتا۔

میرادل کھٹکا۔ مجھے شک ہوا تھا۔

منہ پھٹ۔ بد زبان۔ بد لگام۔ ایسے شخص
کو کہتے ہیں جو منہ میں آئے بکے۔
میدان مار لینا۔ مکر کے میں کامیابی حاصل
کر لینا۔ جیت لینا۔

موم کی ناک ہونا۔ (کنایہ) ایسے موقع پر کہتے
ہیں کہ کوئی اس سے جو کچھ
کہہ دے اس پر عمل کرے
اور اپنے قول ادل سے
پھر جائے۔

نام و نشان مٹا دینا۔ ناپید کر دینا۔
گھر بار تک کھدوا
دینا۔

نشہ کر کرنا ہونا۔ عیش و عشرت میں
خلل پڑنا۔

نظر بند کرنا۔ دیکھنا۔ نگاہیں باندھ دینا۔

جادو کی ایک قسم۔ قید کرنا۔
نگاہ کا پاؤں پھلنا۔ نگاہ نہ ٹھہرنا

کسی چیز کا نہایت صاف و
شفاف ہونا

نکتہ چینی کرنا چھان بین کرنا۔
ہیرا کھانا۔ خود کشی کرنا

نہ چو لھے آگ نہ گھر طے میں پانی۔
گھر میں کوئی چیز نہ ہونا۔
نشہ ہرن ہونا۔ کسی خوف یا مدے
کے باعث نشے کا غائب
ہونا۔ نشہ نہ رہنا۔

ہاتھ پاؤں پھولنا۔ حواس باختہ۔ گھبرا جانا۔
ہو نہار۔ بردا کے چکنے چکنے پات۔ جو پودا
درخت ہونے والا ہوتا
ہے اس کے پتے چکنے ہوتے
ہیں۔ ایسے لڑکے کے لئے
کہتے ہیں جس میں شروع سے
ایسے آثار دکھائی دیں کہ
وہ آگے چل کر اقبال مند
ثابت ہو۔

ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کے ہر روز
عید نہیں ہوتی کہ کوئی روز
حلوہ کھائے۔ زمانہ کی
حالت یکساں نہیں رہتی۔
ہونٹ چاٹتے رہنا۔ کسی خوش ذائقہ چیز
کا مزہ لینا۔

ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ اپنی کم مہتری پر
خشمگیں ہونا اور غصہ کسی
پر نہ اتار سکتا۔ مثل ہے
کھسیانی بلی کھیا نوچے۔
ہندی کی چندی کرنا۔ کھود کھود کر پوچھنا

فرہنگ آلیا میں فقر عربی

فسانہ عجائب

آیات و فقرے عربی فسانہ عجیب

معنی

عبارت

صفحہ

۱۰۳ الحمد لله الذی خلق من الماء بشراً
فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ
قَدِيرًا۔

سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے آدمی کو پانی سے پیدا کیا پھر اُس کو ذات بنایا اور گھر والا بنایا اور تیرا پروردگار قدرت والا ہے

۱۰۴ مَا عَرَفْنَاكَ حَتَّىٰ مَعَرَفَتِكَ
لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَقْلَاقَ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ وَ
اصْحَابِهِ الْمَكْرَمِينَ
لَا فَتَى

بزرگ ہے اور بلند ہے ہم نے تجھ کو نہیں پہچانا جیسا کہ پہچانے کا حق ہے اگر تو نہ ہوتا تو نہ پیدا کرتا میں آسمانوں کو اللہ کا درود اور رحمت ہو آپ پر اور آپ کی پاک اولاد پر اور آپ کے مکرم اصحاب پر۔ اختصار ہے لَا فَتَى إِلَّا عَلَى لَا سَيْفٌ إِلَّا ذُو الْفَقَارِ (معنی) نہیں ہیں جو ان مگر علی کے اور نہیں ہے کوئی تلوار مگر ذُو الْفَقَارِ کے اختصار ہے سورۃ ہَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ مَثْبُتًا مَّذْكُورًا۔ (معنی) بیشک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا بھی وقت آچکا ہے جس میں کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھی

هَلْ أَتَى

لَحْمِكَ لِحْمِي وَدَمَكَ دَمِي عَلَى مَنِّي وَ
أَنَا مِنْهُ۔

تیرا گوشت میرا گوشت اور تیرا خون میرا خون۔ علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں۔

- صفحہ عبارت معنی
- ۱۰۴ مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ
مَنْ رَكِبَهَا نَجَّى مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ هُوَ
میرے اہل بیت کی مثال حضرت نوح کی کشتی
کی طرح ہے جو اس پر چڑھ گیا وہ نچ گیا اور جو
اس سے خلافت ہوا ڈوبا۔
- ۱۰۵ اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي
الْأَمْرِ مِنْكُمْ
خَلَدَ اللَّهُ مُلْكَهُ وَسُلْطَتَهُ وَآيَدَ
اللَّهُ بِالنَّصْرِ وَالْظَّفَرِ جَلَّ جَلَالُهُ
تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اور انکی جو
تم میں صاحب امر ہیں اطاعت کرو۔
اللہ ان کے ملک اور سلطنت کو ہمیشگی دے
اور ان کو کامیابی اور فتح سے تائید عطا
کرے اس کی شان بڑی ہے۔
- ۱۰۶ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ
نُورٌ عَلَى نُورٍ
قُمْ بِإِذْنِي
مَعَاذَ اللَّهِ
الْحَقُّ مُرَّةٌ
الْعَاقِلُ تَكْفِيرُ الْإِشَارَةِ
عِيَاذًا بِاللَّهِ
أَرِنِي
لَنْ تَرَانِي
تَعَزُّ مِنْ تَشَاءُ وَتَذِلُّ مِنْ تَشَاءُ
لِمَنِ الْمُلْكُ
خدا کی تعریف اُس کے ثنا اور حمد کے ساتھ ہے
انہما کی روشن
میرے حکم سے زندہ ہو جا (کھڑا ہو جا)
خدا کی پناہ
سچ بات کڑوی ہوتی ہے
عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔
اللہ پناہ دے
اے خدا تو مجھ کو اپنا جلوہ دکھا
تو ہرگز نہیں دیکھ سکتا
جس کو چاہے تو مغت دے جس کو چاہے تو ذلت دے
آج کس کی بادشاہت ہے

صفحہ	عبارت	معنی
۱۲۵	تَبَرُّكَ وَتَمِينًا	برکت اور بھلائی کے طور پر
۱۲۹	إِنَّهُ الْمُبْدِئُ وَالْإِلَهِ الْمَابِ	حقیقت اُسی سے شروع اور اُسی کی طرف لوٹنے کا مقام ہے۔
۱۳۲	رَبِّ لَا تَزِرُ فِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ	اے خدا مجھ کو اکیلا مت چھوڑ اور سب سے اچھا وارث ہے۔
۱۳۴	رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُو عَنْ الْحِكْمَةِ	اے خدا مجھ کو اپنے پاس سے دوست بخش حکیم کا حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔
۱۳۸	فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ	ہم نے تم میں سے بعضوں کو بعضوں پر برائی دی۔
۱۴۳	أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ	میں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں
۱۴۴	إِنْ شَاءَ اللَّهُ	خدا نے اگر چاہا۔
۱۴۷	اللَّهُ مَعَكُمْ أَيُّنَا كُنْتُمْ	خدا تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم رہو۔
۱۴۹	إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ	بلاشبہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
۱۹۰	أَلَا يَا أَيُّهَا السَّاقِ أَدْرَكَ سَاوَنًا وَلَهَا	خبردار ہو اے ساقی دور میں سانگر کو لا اور دے دے۔
۲۱۵	الْخَيْرُ بِمَا وَقَعَ	جو کچھ ہو گیا وہی بہتر تھا۔
۲۳۱	الْكَرِيمُ إِذَا وَعَدَ وَفَا	سخی جب وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے
۲۳۹	إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ	بے شک ہم خدا کے لئے ہیں اور بلاشبہ ہم اُسی کی طرف واپس جانے والے ہیں
۲۴۰	رَضِينَا بِهِ قَضَا	خدا کے حکم پر ہم راضی ہوئے۔

صفحہ	عبارت	معنی
۲۳۲	قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ	اُن سے کہہ دو کہ زمیں (دنیا) کی سیر کریں
۲۳۵	كُلِّ امْرَءُوهُنَّ بِأَوْقَاتِهِ	تمام کام اپنے وقت پر موقوف ہیں۔
۲۳۷	مَا مَشَاءَ اللَّهُ	جو کچھ خدا چاہے۔
۲۳۹	إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ	جب اُن کی موت پہنچتی ہے تو ایک گھڑی کی
	سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ	دیر سویر نہیں ہوتی۔
۲۵۲	سَوَادُ الْوَجْرِ فِي الدَّارِ الْبَیِّنِ	دونوں جہاں میں روسیا ہی ہوگی۔
۲۵۸	إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ	بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے
۲۶۹	إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا	جس وقت زمین اپنی کپکپی کا نہیے گی۔
۲۷۳	بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيَهَا وَمُرْسَتْهَا	خدا کے نام سے اُس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے
۲۷۵	أَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو
۲۸۲	الْتَوَمُّ أَخُو الْمَوْتِ	نیند موت کا بھائی ہے۔
۲۸۵	وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ	خدا بہتر جانتا ہے۔
	يَا بَشَرِي هَذَا غَلَامٌ	اے بشری! یہ تو ایک لڑکا ہے۔
۲۹۱	مَنْ لَيْشَاءُ	جو کچھ وہ چاہے۔
	وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ	وہ اکیلا ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں
۲۹۵	تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ	میں نے بند اپر بھروسہ کیا۔
۲۹۹	الْقَلِيلُ كَالْمَعْدُومِ	تھوڑی چیز نہ ہونے کے برابر ہے۔
۳۰۳	إِنِّي رَأَيْتُ دَهْرًا مِنْ هَجْرِكَ الْقِيَامَةِ	میں نے تیری جدائی میں ایک مدت سے
		قیامت دیکھی۔

صفحہ عبارت

معنی

- ۳۰۴ جَلَّ جَلَالُهُ
اُس کی شان یا عظمت بڑی ہے
- ۳۱۵ لَا خَيْرَ فِي عَبْدِي
غلاموں سے کوئی بھلائی نہیں
- رَضِينَا بِالْقَضَاءِ
خدا کے حکم پر ہم راضی ہیں
- ۳۱۶ غَفَا اللَّهُ لَكَ
اللہ تمہاری معفرت کرے۔
- ۳۱۹ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ
اور اُس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں اور
كَبِيمٌ
وہ غم سے گھٹا ہوا ہو گیا۔
- ۳۲۲ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَإِنَّ رَبَّكَ
سب مٹنے والے ہیں اور باقی رہنے والا تیرا
ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ
رب جو بخشش اور کرامت والا ہے۔
- ۳۲۳ قَائِمُ اللَّيْلِ وَصَائِمُ النَّهَارِ
رات کو عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ
رکھنے والا۔
- بِحَرَمَةِ النَّبِيِّ وَالْإِجْمَاعِ بِاللُّؤُنِ
بنی اور اُس کی اولاد کے بزرگ جو صاحب
وَالصَّادِ
تلوار ہیں (مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے)
اور وہ جو پھر لوٹ کر آنے والے ہیں (مراد
حضرت امام ہمدی علیہ السلام سے) ان
سب کے طفیل میں۔

فسانہ عجائب کے مندرجہ ذیل نسخے میری نظر سے گزرے اور زیر نظر نسخے کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان سے مدد ملی۔

- ۱۔ فسانہ عجائب۔ مطبع حسنی لکھنؤ، ناشر میر حسن رضوی۔ طبع دوم۔ ۱۲۶۲ھ
- ۲۔ فسانہ عجائب۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۲۶۲ھ
- ۳۔ فسانہ عجائب۔ مطبع مرآۃ الاخبار۔ کلکتہ ۱۲۶۲ھ
- ۴۔ فسانہ عجائب۔ مطبع محمدی، حاجی حرمین شریفین محمد حسین ۱۲۶۷ھ
- ۵۔ فسانہ عجائب۔ لالہ جنناداس بلدیو سہائے ۱۲۷۱ھ
- ۶۔ فسانہ عجائب۔ افضل المطابع، کانپور ۱۲۷۶ھ
- ۷۔ فسانہ عجائب۔ مطبع احمدی شاہ درہ ضلع میرٹھ ۱۳۷۹ھ
- ۸۔ فسانہ عجائب۔ نو لکشور۔ بارہواں اڈیشن ۱۸۹۹ء
- ۹۔ فسانہ عجائب۔ نو لکشور۔ ۳۹ داں اڈیشن ۱۹۵۴ء
- ۱۰۔ فسانہ عجائب۔ رام نرائن لال بینی مادھو ۱۹۶۲ء
- ۱۱۔ فسانہ عجائب مع حاشیہ خزانہ غرائب مطبع انوار احمدی الہ آباد (سن اشاعت مندرج نہیں ہے)
- ۱۲۔ فسانہ عجائب۔ دارالاشاعت۔ لاہور ۱۹۲۸ء
- ۱۳۔ فسانہ عجائب۔ کالج پریس۔ کلکتہ ۱۲۸۶ھ
- ۱۴۔ اس کے علاوہ فسانہ عجائب کے چند قلمی نسخے دیکھے جو آزاد لائبریری علی گڑھ اور انجن ترقی اردو علی گڑھ میں موجود ہیں۔

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. _____ Book No. _____

Acc. No. _____

This book may be kept for 14 days. An over - due charge will be levied at the rate of 10 Paise for each day the book is kept over - time.

[illegible]